جلد اول ۱۹۹۶

آج

ترتیب: اجمل کمال

ذی شان ساحل | نیر مسعود | افضال احمد سید

عذرا عباس | انتظار حسین | نادین گورڈیمر

عامر حسین | رضا علی عابدی | قیصر تمکین

وسطی یورپی ادیبوں سے | ادب پر گفتگو

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

بہار گرما ۱۹۹۶

اپریل ۔ ستمبر ۱۹۹۶

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:

اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

فون: ۸۱۱۳۴۷۴

ای میل: aaj@biruni.erum.com.pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا:

محمد عمر میمن

۷۱۵۴، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

ثروت حسین کی یاد میں

کراچی

۹ نومبر ۱۹۴۷
۹ ستمبر ۱۹۹۶

Scanned with CamScanner

ترتیب

ذی شان ساحل

۷

دو عورتیں

ثروت حسین کے لیے

نیر مسعود

۱۷

شیشہ گھاٹ

۳۸

نوشدارو

افضال احمد سید

۵۳

رابرٹ کلائیو

جواہرات کی نمائش میں شاعر

ایک آئس کریم کو متعارف کرانے کی مہم

وقت ان کا دشمن ہے

اینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی

لینن فہمیدہ ریاض کے حضور میں

Scanned with CamScanner

عذرا عباس

۶۳

سویرا اپنی مرضی سے کب جیتی ہے
مجھے معلوم ہے

اسٹان سیسر

۱۰۷

بسا کی کہانی

ناڈین گورڈیمر

۱۳۷

ہجرت

عامر حسین

۱۵۳

چھوٹی چھوٹی کہانیاں

رضا علی عابدی

۱۶۶

چوہدری عبدالہادی کا آختہ

Scanned with CamScanner

قیصر تمکین

۱۷۳

ایک کہانی، گنگا جمنی

وِبھوتی نراین رائے

۱۸۳

شہر میں کرفیو

اُدے پرکاش

۲۶۱

اور انت میں پرارتھنا

Scanned with CamScanner

ذی شان ساحل

دو عورتیں

اپنے دکھوں کی آگ میں
اک عمر سے جلتی ہوئی
اک راستے کے درمیاں
دو عورتیں جلتی ہوئی

جانے کہاں سے آئی تھیں
خود کو جلانے کے لیے
ملکہ کو پائے تخت سے
نیچے بُلانے کے لیے

یہ عورتیں جلتی ہوئی
ہر بات کی تفصیل ہیں
اس زندگی کے وسط میں

Scanned with CamScanner

چھوٹی سی اک تمثیل ہیں

تھوڑے بہت جو لوگ تھے
وہ اُن کو کیسے ٹوکتے
بے چارگی کی آگ کے
شعلوں کو کیسے روکتے

دو عورتیں جلتی ہوئی
اخبار کی تصویر ہیں
بے وارثی کے خواب کی
اک لازمی تعبیر ہیں

جائیں گی پائے تخت کو
اک دن ہلانے کے لیے
جلتی ہوئی یہ عورتیں
سب کچھ جلانے کے لیے

Scanned with CamScanner

ثروت حسین کے لیے

۱

"سید ثروت حسین،
ایک اڑتالیس سالہ شاعر،
ملیر ہالٹ ریلوے اسٹیشن پر
پٹری پار کرتے ہوئے
انجن کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے"
شہر کے مضافات میں پیدا ہونے والے شاعر کو
شہر کے وسط میں زندہ رہنا چاہیے تھا
خبر میں یہ نہیں لکھا
اور یہ بھی کہ دو مصنوعی پیروں
اور لوہے کی ایک چھڑی کے ساتھ
کوئی آدمی بغیر گرے
ریلوے لائن پار نہیں کر سکتا
اگر ایسا ہوتا تو ہم
اس خبر کو پڑھ کر
اتنے حیران نہ ہوتے

Scanned with CamScanner

۲

میرے خدا!
ہم ایک درخت بن جاتے
اور وہ ہمارے سائے میں
جب تک چاہتا وقت گزارتا
ہم ایک ستارہ بن جاتے
اور وہ ہماری روشنی میں
جب تک چاہتا نظم لکھتا
ہم ایک بادل بن جاتے
جس پر وہ سفر کر سکتا
ہم ایک دن اُسے دے سکتے
ہم ایک رات اُسے دے سکتے
ہم ایک زندگی...
تجھے دینے کے لیے
ہم ایک پھول توڑ رہے تھے
تو نے ہم سے ہمارا دوست
کیوں لے لیا؟

Scanned with CamScanner

۳

وہ ایک پھول تھا
جس کی خوشبو
آسمان تک نہیں پہنچ سکی
یا ایک بادل
جو سارے سمندروں کے رنگ
سارے دریاؤں کا پانی لیے پھرتا تھا
ایک سیڑھی جس سے اتر کے
ستارے زمین پہ آتے تھے
یا ایک کھڑکی
جو صرف خوابوں کی طرف کھلتی تھی
یا تتلیوں سے بھری ہوئی کشتی
جو بندرگاہ پر ہمارا انتظار کرتی تھی
ہم پہنچنے ہی والے تھے
کہ تتلیوں نے ناراض ہو کر
کشتی میں سوراخ کر لیا
اور کشتی کے ساتھ
پانی میں ڈوب گئیں

Scanned with CamScanner

۴

دنیا میں جتنے غم ہیں
ہمیں ان کو ایک بار ضرور گننا چاہیے
اور ہماری آنکھوں میں جتنے خواب ہیں
ان کو بھی گننے کی کوشش کرنی چاہیے
ہمیں یہ کام ستاروں کی روشنی میں کرنا ہو گا
اندھیرے میں نہیں
درختوں کے سائے میں کرنا ہو گا
دھوپ میں نہیں
ہمیں یہ کام سب کے ساتھ مل کر کرنا ہو گا
اکیلے نہیں
اگر اس طرح کے سارے کام
ہم اکیلے شروع کر دیں
تو گھبرا کے، یا گنتی بھول کے
ریل کے نیچے آ جائیں
دس تک گننے سے پہلے ہی
ہمیں کون بچائے گا؟
ہمارے غم کو خون آلود خوابوں کے ساتھ
گھر تک کون لے جائے گا؟
شاید اب ہمیں خواب نہیں دیکھنے چاہییں
ثروت حسین کی طرح مصنوعی پیروں کے ساتھ
ریلوے لائن پار کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے

Scanned with CamScanner

۵

ثروت حسین

ہریالی کو اس کی حیرانی پر
لوگوں کو
ان کی سفاکی پر
زندگی کو
اس کی پامالی پر
معاف کر دینا
معاف کر دینا
اپنے پیاروں کو
ان کی سادگی پر
اپنے دوستوں کو
ان کی محبت پر
اپنے خوابوں کو
ان کی تنہائی پر
معاف کر دینا
جس طرح ہم نے تمھیں معاف کیا

Scanned with CamScanner

۶

میں نے یہ خبر لفظ بہ لفظ پڑھی
ایک چھوٹی سی خبر
جو دنوں کی ایک بڑی تعداد
یا آبادی کے تناسب کو
زیادہ متاثر نہیں کرتی
غموں کی شرح میں
کمی نہیں آنے دیتی
شاعر کی موت کی اگلی صبح
میں نے نظموں کی نئی کتاب حاصل کی
جو اُس نے نہیں لکھی
میں نے آدھا دن اپنی دوست کے ساتھ گزارا
جو اُس سے کبھی نہیں مل سکے گی
گھر لوٹ کر میں نے سُوچی کے کالم
"حراست میں موت" کو اردو میں منتقل کیا
جس کا شاعر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں
ٹی وی کی خبریں دیکھیں
جن میں شاعر کے مرنے کا کوئی ذکر نہیں تھا
شاعر کی یاد میں
ایسی بہت ساری نظمیں لکھیں
جو وہ کبھی نہیں پڑھ سکے گا
اور وہی خبر
لفظ بہ لفظ پڑھنے کے بعد سو گیا

Scanned with CamScanner

۷

ہر روز ہم
خوشی کی تلاش میں نکلتے ہیں
اور شام تک
تھک ہار کر واپس آ جاتے ہیں
نہ ملنے والی خوشی کے بارے میں
ہم ایک نظم شروع کرتے ہیں
اور اسے ادھورا چھوڑ کے سو جاتے ہیں
ہم خواب دیکھتے ہیں
اور غموں کا بوجھ
ہمارے سینے پر بڑھنے لگتا ہے
اپنے خالی دل پر پڑنے والے وزن سے گھبرا کر
ہم آنکھیں کھولتے ہیں
ایک اُداس زندگی ہمارے سامنے ہوتی ہے
اپنے اکیلے پن کے ساتھ ہم پھر
سڑک پر خوشی کو ڈھونڈنے نکل جاتے ہیں
وہ ہمیں بس اسٹاپ پر چھوڑ کر
ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی جاتی ہے
ہم وہاں پہنچتے ہیں
اور اسے ریلوے لائن کے دوسری طرف ہاتھ ہلاتا دیکھ کر
اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں
پٹریوں پر ایک انجن ہمیں ختم کر دیتا ہے

Scanned with CamScanner

کتنی چھوٹی سی بات ہے
ہم پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر
خوشی کے اپنی طرف آنے کا
انتظار کیوں نہیں کر سکتے؟

**

Scanned with CamScanner

نیر مسعود

شیشہ گھاٹ

۱

آٹھ برس تک بڑی محبت کے ساتھ مجھے اپنے یہاں رکھنے کے بعد آخر میرا منھ بولا باپ مجبور ہوا کہ میرے لیے کوئی اَور ٹھکانا ڈھونڈھے۔ زیادتی اُس کی نہیں تھی، میری بھی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا، اور مجھے بھی، کہ کچھ دن اس کے ساتھ آرام سے رہنے کے بعد میرا ہکلانا ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کو امید نہیں تھی، نہ مجھے، کہ گھر کے باہر لوگ میرا تماشا بنا لیں گے، جس طرح کسی پاگل کا تماشا بنا لیا جاتا ہے۔ بازاروں میں میری بات سب سے زیادہ دلچسپی اور توجہ سے سنی جاتی تھی، اور وہ بات ہنسی کی ہو یا نہ ہو، لوگ اس پر ہنستے ضرور تھے۔ کچھ دن میں میری یہ حالت ہو گئی کہ بازار تو بازار، گھر کے اندر بھی اگر کبھی کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو بول میرے ہونٹوں سے اور میرے دانتوں سے اور میرے تالو سے ٹکرا ٹکرا کر واپس چلے جاتے، جیسے پانی کی لہریں کنارے کو چھو کر پلٹتی ہیں۔ آخر میری زبان میں گرہیں سی پڑ جاتیں، گردن کی رگیں پھولنے لگتیں، گلے اور سینے پر اتنا زور پڑتا کہ دم گھٹنے لگتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ سانس اکھڑ جائے گی۔ ناچار بات ادھوری چھوڑ کر ہانپنے لگتا اور سانس ٹھہرنے کے بعد نئے سرے سے بات شروع کرتا۔ اس پر منھ بولا باپ مجھے ڈانٹتا:

"جہاں تک کہہ چکے ہو، میں نے سُن لیا۔ اب آگے بڑھو۔"

وہ اگر کبھی مجھے ڈانٹتا تو اسی بات پر ڈانٹتا تھا۔ لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں بیچ سے بات شروع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کبھی تو صبر سے میری بات سنتا اور کبھی ہاتھ اٹھا کر کہتا:

"اچھا، بس کرو۔"

لیکن میری مجبوری یہ بھی تھی کہ میں بات ادھوری نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بڑی بے چینی ہونے لگتی تھی۔ آخر وہ مجھے ہکلاتا چھوڑ کر چلا جاتا اور میں اکیلا بولتا رہ جاتا۔ اس وقت کوئی مجھے دیکھتا تو ظاہر ہے پاگل سمجھتا۔

مجھے بازاروں میں گھومنے پھرنے اور لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا بھی شوق تھا۔ میں خود اپنی بات تو ٹھیک سے نہیں کہہ پاتا تھا لیکن یہ کمی دوسروں کی باتیں غور سے سن کر اور دل ہی دل میں انھیں دُہرا کر پوری کرتا تھا۔ کبھی کبھی میری طبیعت اُلجھنے ضرور لگتی تھی لیکن میں وہاں خوش بھی تھا اس لیے کہ وہاں کے لوگ مجھے ناپسند نہیں کرتے تھے، اور سب سے بڑھ کر اس لیے کہ میرا منھ بولا باپ مجھے بہت چاہتا اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔

لیکن کچھ دن سے وہ پریشان پریشان نظر آ رہا تھا۔ ایک نئی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ دیر دیر تک مجھ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے سوال کرتا تھا جن کے جواب میں مجھے دیر تک بولنا پڑے، اور بیچ میں ٹوکے بغیر بڑی توجہ سے میری بات سنتا رہتا تھا۔ میں تھک کر ہانپنے لگتا تب بھی وہ میری بات پوری ہونے کا انتظار کرتا اور جب میں نئے سرے سے بولنا شروع کرتا تب بھی وہ اتنی ہی توجہ سے سنتا رہتا۔ میں سوچتا تھا کہ اب وہ مجھے ڈانٹنے ہی والا ہے اور میری زبان میں گرہ پڑنے لگتی، لیکن وہ کچھ بولے بغیر میری طرف دیکھے جاتا تھا۔

تین ہی دن میں مجھ کو اپنی زبان کچھ کچھ کھُلتی معلوم ہونے لگی۔ سینے پر زور پڑنا بھی کم ہو گیا اور میں اس دن کا خواب دیکھنے لگا جب میں بھی دوسروں کی طرح آسانی اور صفائی سے بولنے لگوں گا۔ میں نے دل ہی دل میں وہ باتیں بھی جمع کرنا شروع کر دیں جو دوسروں سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چوتھے دن باپ نے مجھے پاس بلا کر بٹھایا۔ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، پھر چپ ہو گیا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ اب وہ مجھ سے کوئی سوال کرے گا، لیکن اچانک اس نے کہا:

"پرسوں تمھاری نئی ماں آ رہی ہے۔"

اس نے مجھے خوش ہوتے دیکھا، کچھ پریشان ہوا، پھر آہستہ سے بولا:
"تمھیں بولتے دیکھے گی تو پاگل ہو کے مر جائے گی۔"

دوسرے دن صبح میرا سامان بندھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، باپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا:

"چلو۔"

***

سفر میں وہ مجھ سے کچھ نہیں بولا۔ لیکن راستے میں ملنے والے ایک آدمی کے پوچھنے پر اس نے بتایا:

"اسے جہاز نے مانگ لیا ہے۔"

پھر وہ دونوں جہاز کی باتیں کرنے لگے۔ مجھے بھی جہاز یاد تھا۔ جب میں شروع شروع میں باپ کے پاس آیا تھا تو جہاز میلوں اور بازاروں میں مسخرے پن کی نقلیں کر کے روزی پیدا کرتا تھا۔ وہ اپنی پیٹھ پر چھوٹا سا گلابی رنگ کا بادبان باندھے رہتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کا نام جہاز پڑ گیا تھا، یا شاید جہاز نام ہونے کی وجہ سے وہ پیٹھ پر بادبان باندھنے لگا ہو۔ ہوا تیز چلتی تو گلابی بادبان پھول جاتا اور جہاز کچھ ایسا معلوم ہوتا کہ اسی بادبان کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کی نقل بہت اچھی اتارتا تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غصیلی ہوائیں، بپھری ہوئی موجیں اور تیز گھومتے ہوئے بھنور کسی جہاز کو ڈبونے پر تل گئے ہیں۔ نقال کے منہ سے ہوا کی غراہٹ، موجوں کے تھپیڑوں، بھنور کے سناٹے، بلکہ بادبانوں کے پھڑپھڑانے تک کی آوازیں صاف نکلتیں، اور آخر وہ ڈوب ہی جاتا۔ یہ نقل بچوں اور لڑکوں کو بہت پسند تھی لیکن یہ صرف اس وقت دکھائی جاتی تھی جب ہوا تیز چل رہی ہو۔ اگر ہوا رک جاتی تو یہ چھوٹے تماشائی اور بھی خوش ہوتے اور شور مچانے لگتے:

"تماکو، تماکو!"

جہاز کا سا تمبا کو پینے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ تمبا کو کی جتنی قسمیں اور تمبا کو پینے کے جتنے طریقے ہو سکتے تھے شاید وہ سب اس کے استعمال میں تھے اور رکی ہوئی ہوا میں وہ منھ سے دھویں کے بادل چھوڑ چھوڑ کر ان سے ایسے ایسے کھیل دکھاتا تھا کہ تماشائیوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دھویں کے بہت سے مرغولے نکال کر کئی قدم پیچھے ہٹ جاتا، پھر ہاتھوں اور کلائیوں کو اس طرح گھماتا اور موڑتا تھا جیسے زم گندھی ہوئی مٹی سے کوئی مورت بنا رہا ہو۔ اور واقعی مرغولے کسی مورت کی صورت بن کر کچھ دیر تک ہوا میں ٹنگے رہتے۔ کچھ نقلیں وہ ایسی بھی کرتا تھا جن کا دیکھنا سننا لڑکوں کو سخت منع تھا۔ ان موقعوں پر وہ بازاریوں کے تنگ ہوتے ہوئے دُہرے تہرے دائروں میں چھپ جاتا اور دور والوں کو صرف جھونکے کھاتے ہوئے بادبان اور تماشائیوں کے قہقہوں سے پتا چلتا کہ جہاز نقلیں کر رہا ہے۔

منھ بولے باپ کے پاس میرے آنے کے پہلے ہی سال جہاز کی آواز خراب ہو گئی تھی اور وہ بری طرح کھانسنے لگا تھا۔ نقلیں دکھانے میں وہ بہت طرح سے بولا کرتا تھا لیکن اب کچھ بولنا شروع کرتا تو کھانسی بار بار اس کا گلا بند کر دیتی اور بعض وقت اسے بھی اپنی بات پوری کرنے میں قریب قریب اتنی ہی دیر لگتی جتنی مجھے لگتی تھی۔ اس نے نقلیں کرنا بلکہ ہماری طرف آنا بھی چھوڑ دیا اور پہلے سال کے بعد سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

***

ہمارے راستے میں بڑی جھیل کے کناروں کی کئی بستیاں اور گھاٹ آئے۔ ہر جگہ میرے باپ کے جاننے والے موجود تھے اور سب کو وہ یہی بتاتا تھا کہ جہاز نے مجھے مانگ لیا ہے۔ اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر میں نے باپ سے کچھ پوچھا نہیں۔ میں دل ہی دل میں اس سے ناراض بھی تھا اس لیے کہ اس کے پاس نہ رہنے کے خیال سے میں بالکل خوش نہیں تھا۔ لیکن خوش میرا باپ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کم سے کم ایسا آدمی تو وہ بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا جو دوسرے دن نئی بیوی لانے والا ہو۔

آخر ہم ایک میلی کچیلی بستی میں پہنچے۔ یہاں کے لوگ شیشے کا کام کرتے تھے۔ تھوڑے سے

گھر تھے لیکن ہر گھر میں شیشہ پگھلانے کی بھٹیاں تھیں جن کی بھدی چمنیاں چھتوں اور چھپروں سے کچھ اوپر نکلی ہوئی دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ دیواروں پر، گلیاروں میں، بلکہ وہاں کے درختوں پر بھی کلونس کی تہیں تھیں۔ آدمیوں کے کپڑے اور آوارہ کتوں بلیوں کے بدن بھی دھویں سے کالے ہو رہے تھے۔ میرے باپ کے جاننے والے یہاں بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے ہم کو کچھ کھانے پینے کے لیے بٹھا لیا۔ مجھے وہاں کی ہر چیز سے وحشت ہو رہی تھی۔ میرے باپ نے کچھ دیر تک غور سے میرے چہرے کو دیکھا، پھر اس سفر میں پہلی بار مجھ سے بات کی۔

"یہاں لوگ بوڑھے نہیں ہوتے۔"

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ میں نے وہاں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا۔ واقعی ان میں کوئی بوڑھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے باپ کی آواز سنائی دی:

"دھواں انھیں کھا جاتا ہے۔"

"پھر وہ یہاں کیوں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھنا چاہا لیکن یہ سوال مجھے بےفائدہ سا محسوس ہوا اور میں باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

"جہاز بھی شیشے کا کام جانتا ہے،" کچھ دیر کے بعد اس نے کہا، "اس کا گھر یہیں ہے۔"

میں ایک جھٹکا کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری زبان میں ایک ساتھ بہت سی گرہیں پڑ گئیں، لیکن اب میں چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ کیا اس بستی میں، جہاں کی ہر چیز پر سیاہ وحشت برستی معلوم ہوتی ہے، مجھ کو جہاز کے بے دھواں اگلتے ہوئے بازاری مسخرے کے ساتھ رہنا پڑے گا؟ یہ بات پوچھے بغیر میں نہیں رہ سکتا تھا چاہے اس میں جتنی بھی دیر لگتی۔ لیکن باپ نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا:

"لیکن وہ یہاں کا رہنا کب کا چھوڑ چکا ہے۔"

مجھے واقعی کچھ اطمینان ہوا۔ اگر جہاز یہاں، اس بستی میں نہیں رہتا ہے، میں نے خود سے کہا، تو میں اس کے ساتھ کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔ اسی وقت میرے باپ نے کہا:

"اب وہ گھاٹ پر رہتا ہے،" اس نے ایک طرف اشارہ کیا، "شیشہ گھاٹ پر۔"

اس نام پر ایک بار پھر مجھے وحشت ہونے لگی۔ یقیناً میرے باپ کو نہیں معلوم تھا کہ میں اسی کے گھر میں کچھ لوگوں سے شیشہ گھاٹ کا ذکر سن چکا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بڑی جھیل کا

Scanned with CamScanner

سب سے مشہور اور سب سے اُجاڑ گھاٹ ہے اور بی بی نام کی ایک ڈراونی عورت اس کی تنہا مالک ہے۔ وہ ایک مشہور ڈاکو، یا شاید باغی، کی محبوبہ تھی، پھر اس کی بیوی ہو گئی۔ وہ بی بی سے ملنے آیا تھا کہ مخبری ہو گئی اور اسی گھاٹ پر وہ سرکاری آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسی الٹ پلٹ ہوئی کہ پورا شیشہ گھاٹ بی بی کے حوالے کر دیا گیا جہاں اس کی بہت بڑی ناؤ جھیل میں پڑی رہتی ہے، اور بی بی نے اسی ناؤ میں اپنے رہنے کا ٹھکانا بنا لیا ہے۔ وہ کچھ کاروبار بھی کرتی ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی کوئی آدمی گھاٹ پر آنے دیا جاتا ہے۔ باقی کسی کو اُدھر کا رخ کرنے کی اجازت نہیں۔ کسی کی ہمّت بھی نہیں۔ بی بی سے سب ڈرتے ہیں۔

جہاز شیشہ گھاٹ پر کیسے رہنے لگا؟ کیا مجھے بی بی سے ملنا ہوا کرے گا؟ وہ مجھ سے باتیں تو نہیں کرے گی؟ مجھے اس کی باتوں کا جواب ضرور دینا پڑے گا؟ وہ میرے بولنے پر غصّے سے پاگل تو نہیں ہو جائے گی؟ میں ان سوالوں اور ان کے خیالی جوابوں میں ایسا کھو گیا تھا کہ مجھے شیشے والوں کی بستی سے اٹھ کر چلنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ میں اس وقت چونکا جب میرے کان میں باپ کی آواز آئی:

"پہنچ گئے۔"

۲

بڑی جھیل کا شاید یہی سب سے اُجاڑ حصہ تھا۔ ایک بنجر میدان کے خاتمے پر مٹیالے پانی کا پھیلاؤ شروع ہوا تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے بائیں ہاتھ پر تھوڑا پانی چھوڑ کر ایک بہت بڑی ناؤ جھیل کے کچھ حصے کو چھپائے ہوئے تھی۔ اس پر شاید کبھی لکڑی کے لٹھے لادے جاتے ہوں گے۔ اب اس میں لٹھوں ہی سے کئی چھوٹی بڑی کوٹھریاں سی بنا لی گئی تھیں۔ ناؤ کے سارے تختے ڈھیلے ہو گئے تھے اور ان سے ہلکی چرچراہٹ کی آواز نکل رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑی چیز دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہو۔ جھیل کے کنارے ایک لمبی سی منڈیر زمین پر لیٹی ہوئی تھی۔ آس پاس چار پانچ چبوترے تھے جن میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے تھے۔ ان کے قریب ایک لمبا

Scanned with CamScanner

گلا ہوا بانس تھا جس کو مٹی نے قریب قریب چھپا لیا تھا۔ اتنی کم چیزیں تھیں پھر بھی مجھے یقین ہو رہا تھا کہ جب یہ سب کچھ ٹوٹا پھوٹا ہوا نہیں ہو گا تو اس جگہ چہل پہل رہتی ہو گی۔ اب گھاٹ کے نام پر ایک لمبا سا سائبان رہ گیا تھا جس کا اگلا حصہ داہنی طرف کے نشیب میں جھیل کے تھوڑے سے پانی کو ڈھانکے ہوئے تھا۔ سائبان کے پیچھے زرا بلندی پر ایک بےڈول عمارت تھی جس میں ٹھوں اور چکنی مٹی کا استعمال کچھ اس طرح ہوا تھا جیسے بنانے والا فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے لکڑی سے بنائے یا مٹی سے، اور اسی ادھیڑ بن میں عمارت بن کر تیار بھی ہو گئی ہو۔ چھت البتہ پوری لکڑی کی تھی۔ اس کے بیچوں بیچ والے اُبھار پر لگا ہوا گلابی رنگ کا ایک چھوٹا سا بادبان ہوا سے بار بار پھُول رہا تھا۔

میرا منہ بولا باپ ضرور پہلے بھی یہاں آیا ہو گا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ تیزی کے ساتھ سیدھا نشیب میں اترا اور سائبان کے نیچے سے شروع ہونے والے مٹی کے پانچ زینے چڑھ کر عمارت کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

جہاز سامنے ہی زمین پر بیٹھا تمبا کو پی رہا تھا۔ ہم دونوں بھی اندر جا کر زمین پر بیٹھ گئے۔

"آ گیا؟" اس نے باپ سے پوچھا اور کھانسنے لگا۔

آٹھ برس میں وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی زردی اور ہونٹوں کی سیاہی اتنی بڑھ گئی تھی کہ شبہ ہوتا تھا انھیں الگ سے رنگا گیا ہے۔ کچھ کچھ دیر بعد اس کی گردن اس طرح ہل جاتی تھی جیسے کسی بات کا اقرار کر رہا ہو۔ اور اسی طرح گردن ہلاتے ہوئے اس نے زرد آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر بولا:

"بڑا ہو گیا۔"

"آٹھ برس بعد دیکھ رہے ہو،" میرے باپ نے اسے بتایا۔

ہم بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ دونوں اشاروں میں باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ اچانک میرا باپ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ اٹھا۔ جہاز نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پوچھا:

"کچھ رکو گے نہیں؟"

"کام بہت ہے،" میرا باپ بولا، "ابھی کچھ بھی نہیں کیا ہے۔"

جہاز نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی اور میرا باپ دروازے سے باہر نکل گیا۔ مٹی کے

زینے اترتے اترتے وہ رک کر مڑا، واپس آیا اور مجھے چمٹا کر دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا، پھر بولا:

"دل نہ لگے تو جہاز کو بتا دینا، میں آ کر لے جاؤں گا۔"

جہاز کی گردن پھر اسی طرح ہلی اور میرا باپ زینوں سے نیچے اتر گیا۔

مجھے جہاز کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور میں اس کی طرف مڑ گیا۔ اس نے جلدی جلدی تمباکو کے بہت سے کش کھینچے، دیر تک اپنی گھر گھراتی ہوئی سانس کو ہموار کرتا رہا، پھر اٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر سائبان کے نیچے آ گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ جھیل پر نظریں دوڑاتا رہا۔ پھر مٹی کے زینوں کی طرف واپس ہوا، لیکن پہلے زینے پر پیر رکھتے رکھتے رک گیا۔

"نہیں،" اس نے کہا، "سب سے پہلے بی بی۔"

جھیل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ہم بڑی ناؤ کے قریب پہنچے۔ دو لمبے لٹھوں کو ملا کر کنارے سے ناؤ تک پہنچنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ لٹھوں پر سنبھل سنبھل کر پیر رکھتے ہوئے ہم دوسرے سرے کی چھوٹی سیڑھی تک اور سیڑھی چڑھ کر ناؤ پر پہنچے۔ سامنے کی ایک کوٹھری کے دروازے پر ترپال کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کے آگے ایک دورنگی بلی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے ہم کو دیکھا۔ جہاز پردے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ میں اس سے کئی قدم پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ جہاز نے پھر کھانسنا شروع کیا تھا کہ پردہ ہٹا کر بی بی سامنے آ گئی۔

اسے دیکھ کر مجھے ڈر لگا، لیکن اس سے بھی زیادہ یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ یہ بے ہنگم عورت کبھی کسی کی محبوبہ تھی۔ اس نے جہاز کو دیکھا، پھر مجھ کو۔

"بیٹا آ گیا؟" اس نے جہاز سے پوچھا۔

"ابھی پہنچا ہے،" جہاز نے بتایا۔

بی بی نے مجھے سر سے پیر تک کئی بار دیکھا، پھر بولی:

"دکھیا معلوم ہوتا ہے۔"

جہاز کچھ نہیں بولا۔ میں بھی کچھ نہیں بولا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ میں نے بی بی کی طرف دیکھا اور اسی وقت اس نے پوچھا:

"پیرا کی جانتے ہو؟"

"نہیں" میں نے گردن کے اشارے سے اسے بتایا۔

Scanned with CamScanner

"پانی سے ڈرتے ہو؟"

"ڈرتا ہوں،" میں نے پھر اشارے سے اسے بتایا۔

"بہت؟"

"ہاں بہت،" میں نے بتا دیا۔

"ڈرنا چاہیے،" اس نے یوں کہا جیسے میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

میں نے جھیل کے پھیلاؤ کو دیکھا۔ رکی ہوئی ہوا میں مٹیالا پانی بالکل ٹھہرا ہوا تھا اور جھیل پر کسی بنجر میدان کا شبہ ہوتا تھا۔ میں نے بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ جہاز کی طرف مڑ گئی جو اس کی طرف تمبا کو پینے کا سامان بڑھا رہا تھا۔ دیر تک وہ دونوں تمبا کو پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ کچھ حساب کتاب قسم کی کاروباری باتیں تھیں۔ اس بیچ میں بھورے رنگ کا ایک کتا کسی طرف سے نکل کر آیا اور مجھے سونگھ کر چلا گیا۔ اونگھتی ہوئی بلی نے کتے کو دیکھ کر دم پھُلائی اور پیٹھ اونچی کر لی، پھر پردے کے پیچھے چلی گئی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد بی بی کو دیکھ لیتا تھا۔ مضبوط بنی ہوئی عورت تھی اور اپنی بڑی ناؤ سے بھی کچھ بڑی معلوم ہوتی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنی ناؤ کی طرح دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہے۔ کم سے کم اس کے چہرے سے ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا، اور اس کی باتوں سے بھی جو مجھے صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے رک کر ایک بار اس نے گردن اٹھائی اور زور سے آواز دی:

"پریا!"

دور کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز پانی پر تیرتی ہوئی ہماری طرف آئی، اور جہاز میرا ہاتھ پکڑ کر لٹھوں والے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ سیڑھی کے پاس پہنچ کر میں نے اپنی پشت پر بی بی کی آواز سنی۔

"اسے اچھی طرح رکھنا، جہاز،" اور پھر وہی، "دکھیا معلوم ہوتا ہے۔"

یہ اس نے کچھ اس طرح کہا کہ میں خود کو واقعی دکھیا سمجھنے لگا۔

۳

لیکن کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں خود کو دکھیا سمجھتا۔ بی بی کے یہاں سے آکر جہاز نے مجھ کو میرے رہنے کا ٹھکانا دکھایا تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ ایک اجاڑ گھاٹ پر بنے ہوئے اسی بے ڈول مکان کا حصہ ہے جس کے سامنے مٹیالے پانی کی جھیل اور پشت پر بنجر میدان ہے۔ وہاں میرے آرام کا اچھے سے اچھا سامان موجود تھا۔ سجاوٹ بھی بہت تھی جس میں شیشے کی چیزوں سے زیادہ کام لیا گیا تھا۔ دروازوں اور روشن دانوں میں بھی شیشے استعمال ہوئے تھے۔ مجھ کو تعجب ہوا کہ جہاز کسی جگہ کو اتنے سلیقے سے سجا سکتا ہے۔ پھر خیال ہوا کہ اس نے اس میں کسی اور کی مدد لی ہے، یا پھر سجاوٹ کا کام باقاعدہ سیکھا ہے۔ وہاں کئی چیزیں آج ہی کی لائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں لیکن مجھے شبہ ہوا کہ وہاں سے کئی چیزیں ہٹائی بھی گئی ہیں، اور یہ شبہ بھی ہوا کہ اس جگہ مجھ سے پہلے، شاید بہت پہلے، کوئی اور بھی رہتا تھا۔

اپنے ٹھکانے کو دیکھ لینے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ پہلے ہی دن میں نے شیشہ گھاٹ کا سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ لیکن پریا کو میں نے دوسرے دن دیکھا۔

مجھے آج تک حیرت ہے کہ میرے منھ بولے باپ کے یہاں جو لوگ شیشہ گھاٹ کی باتیں کر رہے تھے ان میں سے کسی نے بی بی کی بیٹی کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کا نام شیشہ گھاٹ پہنچنے کے پہلے دن سنا تھا جب بی بی نے ناؤ پر سے اسے پکارا تھا۔ اس دن کی گھبراہٹ میں مجھے یہ سوچنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ پریا کون ہے۔ لیکن دوسرے دن صبح میں نے گھاٹ کے سامنے جھیل پر سے ہنسی کی آواز سنی۔ پھر کسی نے کہا:

"جہاز، تمھارے بیٹے کو دیکھیں گے۔"

جہاز نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بی بی کی بیٹی،" اس نے بتایا اور مجھے سائبان کے نیچے لا کھڑا کیا۔

کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر جھیل میں دھیرے دھیرے ہلتی ہوئی پتلی سی کشتی کے پچھلے سرے پر میں نے دیکھا کہ پریا بالکل سیدھی کھڑی ہوئی ہے۔ پھر اس نے اپنے بدن کو ہلکا سا جھکولا

دیا اور کشتی سائبان کی طرف بڑھی۔ پریا کے بدن نے ایک اور جھکولا کھایا۔ کشتی اور آگے بڑھی۔ اسی طرح رکتی بڑھتی ہوئی وہ سائبان کے بہت قریب آ گئی۔

"یہی ہے؟" اس نے جہاز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ لڑکی بی بی کی بیٹی ہے، جس طرح اس پر حیرت ہوئی تھی کہ بی بی کسی کی محبوبہ رہ چکی ہے۔ میں نے اسے زرا غور سے دیکھنا چاہا لیکن اب وہ مجھے سر سے پیر تک دیکھ رہی تھی۔

"دکھیا تو نہیں معلوم ہوتا،" اس نے جہاز سے کہا، پھر مجھ سے بولی، "دکھیا تو نہیں معلوم ہوتے۔"

"میں نے کب کہا تھا کہ میں دکھیا معلوم ہوتا ہوں،" میں نے زرا جھنجلا کر کہنا چاہا لیکن صرف ہکلا کر رہ گیا۔ پریا ہنس پڑی اور بولی:

"جہاز، یہ تو سچ مچ..."

پھر اس نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ناؤ پر سے بی بی کی پاٹ دار آواز آئی:

"پریا، اسے نہ ستاؤ۔"

"کیوں؟" پریا نے پکار کر پوچھا، "دکھیا جو ہے؟"

"پریا،" جہاز نے اسے سمجھایا، "اس سے تمھارا جی بہلے گا۔"

"ہمارا جی گھبراتا ہی نہیں ہے،" اس نے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

میں خود کو کسی مصیبت میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا، لیکن اسی وقت اس نے مجھ سے پوچھا:

"تم نے اپنی نئی ماں کو دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا،" میں نے سر کے اشارے سے اسے بتایا۔

"دیکھنے کو جی نہیں چاہتا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں چاہتا؟" اس نے پھر پوچھا۔

جواب میں میرا سر اس طرح ہلا کہ اس کا مطلب ہاں بھی ہو سکتا تھا، نہیں بھی۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ آج نئی ماں میرے پہلے گھر میں آنے والی ہے، یا شاید آ چکی ہو۔

باپ نے کہا تھا وہ مجھے بولتے دیکھ کر پاگل ہو جائے گی۔ میں خیال ہی خیال میں خود کو بولتے اور اس کو دھیرے دھیرے پاگل ہوتے دیکھنے لگا۔ میں نے سوچنے کی کوشش کی کہ ایسی عورت کے ساتھ، جو میری وجہ سے پاگل ہو گئی ہو، میرا اُس گھر میں رہنا کیسا ہوتا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کل اس وقت تک میں اُس گھر میں تھا، اور یہ مجھے بہت پرانے زمانے کی بات معلوم ہوئی۔ مجھے وہاں گزارے ہوے آٹھ سال آٹھ لمحوں کی طرح یاد آئے۔ پھر مجھے اپنا منھ بولا باپ یاد آنے لگا جو کل مجھے چمٹا کر جہاز کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ پہلے بھی مجھ کو یقین تھا، اب اور زیادہ یقین ہو گیا، کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔

"جہاز بھی تم سے بہت محبت کرے گا،" پریا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں اسے بھول گیا تھا لیکن وہ اتنی دیر سے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی کشتی کے دوسرے سرے پر آئی۔ اس کا بدن آہستہ سے گھوما اور سائبان کی طرف اس کی پیٹھ ہو گئی۔ بدن کے ایک جھکولے کے ساتھ اس نے کشتی کو آگے بڑھایا اور دھیرے دھیرے ہم سے دور ہوتی گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے کوئی عجوبہ دیکھا ہے۔

"اگر بی بی نے اس کا نام لے کر نہ پکارا ہوتا،" میں نے خود کو بتایا، "تو میں اسے جھیل کی روح سمجھتا۔"

وہ جھیل کی روح نہیں تو عجوبہ ضرور تھی، اس لیے کہ وہ پانی کے نیچے پیدا ہوئی تھی اور اس کے پیروں نے آج تک زمین نہیں چھوئی تھی۔

***

بڑی ناؤ بی بی کو باپ دادا سے ملی تھی اور معلوم نہیں کب سے جھیل میں پڑی تھی، پریا کے جانے کے بعد جہاز نے بتایا، لیکن خود بی بی جھیل سے دور کہیں اور رہتی تھی جہاں اس کا میاں، وہی

ڈاکو، یا جو کوئی بھی وہ تھا، چھپ کر اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ جب پریا پیدا ہونے کو ہوئی تو میاں نے ایک دائی کے ساتھ بی بی کو ناؤ پر پہنچا دیا۔ ولادت کے وقت جہاز بی بی کے درد سے چیخنے کی آوازیں سن رہا تھا۔ پھر یہ آوازیں کچھ بدل گئیں۔ سرکاری آدمی پہنچ گئے تھے اور بی بی سے اس کے میاں کا پتا پوچھ رہے تھے۔ بی بی نے کچھ نہیں بتایا تو انھوں نے اس کو جھیل میں غوطوں پر غوطے دینا شروع کیے۔ اور ایسے ہی کسی لمبے غوطے میں پریا پیدا ہو گئی۔

"میں نے صاف دیکھا،" جہاز نے بتایا، "کہ پانی کے نیچے سے بی بی کی سانسوں کے بلبلے اٹھ رہے ہیں، اور انھیں بلبلوں کے بیچ میں ایک بار پریا کا چھوٹا سا سر اُبھرا اور اس کے رونے کی آواز آئی۔"

تب ان لوگوں نے سمجھا کہ بی بی بن نہیں رہی تھی۔ وہ چلے گئے، لیکن گھات میں رہے۔ اور، جیسا کہ انھیں یقین تھا، ایک دن پریا کا باپ گھاٹ پر آیا۔ اسی ناؤ پر اس کو گھیرا گیا۔ اس نے بچ کر نکل جانا چاہا لیکن زخمی ہو کر جھیل میں گرا اور جھیل ہی میں ڈوب گیا۔

اس دن سے بی بی نے بڑی ناؤ کو اپنا اور پریا کا ٹھکانا بنا لیا ہے۔ خود بی بی کبھی کبھی دوسری بستیوں کی طرف نکل جاتی ہے لیکن پریا کو اس نے آج تک زمین پر نہیں آنے دیا ہے۔ وہ اپنی کشتی پر جھیل میں گھومتی رہتی ہے، یا پھر بڑی ناؤ پر ماں کے پاس آجاتی ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ بی بی نے کوئی قسم کھائی ہے؟ کوئی منت مانی ہے؟ کسی کو نہیں معلوم، اس لیے کوئی نہیں جانتا کہ پریا کب تک جھیل میں چکر لگاتی رہے گی، اور اس کے پیر کبھی مٹی کو چھوئیں گے یا نہیں۔

۴

شیشہ گھاٹ پر میں نے ایک سال گذارا، اور اس ایک سال میں جھیل پر سے سب موسموں کو گذرتے اور ہر موسم میں پریا کی کشتی کو پانی پر گھومتے دیکھا۔ اس کے سوا وہاں میرے لیے دل بہلانے کا زیادہ سامان نہیں تھا۔ میرے ٹھکانے کا باہری دروازہ بنجر میدان میں کھلتا تھا جس کے نزدیکی کناروں پر شیشے والوں کی دھواں دیتی ہوئی بستی کو چھوڑ کر صرف مچھیروں کی آبادیاں تھیں۔

سوکھتی ہوئی مچھلیوں کی وجہ سے میں ان آبادیوں سے دور دور رہتا تھا۔ مچھیرے ہر وقت کسی نہ کسی کام میں بھی لگے رہتے تھے، اور میرے کسی کام کے نہیں تھے، جس طرح میں ان کے کسی کام کا نہ تھا۔ میدان کے دوسرے کناروں پر بہت گھاٹ تھے، ملاحوں کی بڑی بڑی آبادیاں بھی تھیں۔ کسی کسی گھاٹ پر بہت چہل پہل رہتی تھی، لیکن ایک دو بار جب میں کسی گھاٹ پر پہنچا تو پتا چلا کہ وہاں جہاز کے منھ بولے بیٹے کی خبر پہنچ چکی ہے اور لوگ مجھے پہچاننے ہی والے ہیں، اس لیے خالی میدان میں گھومنے اور وہاں کی کچھ چیزوں کو خواہ مخواہ اپنی دل چسپی کا سامان بنا لینے کے سوا زیادہ تر میں سائبان کے نیچے بیٹھا رہتا تھا۔ بوڑھا جہاز بھی اپنے کاموں اور ادھر اُدھر کی گشتوں سے فرصت پا کر تمباکو پینے کے سامان کے ساتھ وہیں آ بیٹھتا اور طرح طرح کے قصے سناتا تھا جو یاد رکھنے کے قابل تھے مگر میں انھیں بھول گیا ہوں۔ البتہ یہ مجھ کو اب تک یاد ہے کہ جب اس کا کوئی قصہ میرا دھیان اپنی طرف نہ کھینچ پاتا تو وہ جوش میں آ کر، بلکہ کچھ وحشت زدہ ہو کر، اسے اپنے پرانے نقالوں والے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا، اس میں اس پر کھانسی کا دورہ پڑ جاتا اور اس کے قصے کی رہی سہی دل چسپی بھی ختم ہو جاتی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ شیشہ گھاٹ دنیا سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہے اور جھیل کا یہ حصہ ہمیشہ ویران پڑا رہتا ہو گا۔ ایسا نہیں تھا، البتہ وہاں بی بی کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ یہی میں نے باپ کے گھر پر ان لوگوں سے سنا تھا اور فرض کر لیا تھا کہ بی بی کبھی کسی کو اُدھر نہیں آنے دیتی۔ لیکن جہاز کے یہاں آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ کچھ خاص خاص دنوں میں مچھیرے اپنی کشتیاں اور جال لے کر یہاں آتے ہیں۔ کسی کسی دن تو ان کی تعداد اتنی بڑھ جاتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا پانی پر کوئی چھوٹا سا میلا لگا ہوا ہے۔ میں اپنے ٹھکانے پر، کبھی سائبان کے نیچے، بیٹھا ہوا مچھیروں کی آوازیں سنتا تھا کہ ایک دوسرے کو پکار رہے ہیں اور کچھ ہدایتیں دے رہے ہیں۔ ان کی آوازوں کے بیچ میں کبھیں پریا کے ہنسنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ کبھی ان کی آوازوں سے معلوم ہوتا کہ وہ پریا کو کسی بات سے روک رہے ہیں۔ کبھی کسی بوڑھے مچھیرے کی آواز سنائی دیتی کہ پریا کو ڈانٹ رہا ہے اور زور زور سے ہنستا بھی جا رہا ہے۔ اس وقت ناؤ پر سے بی بی کی آواز آتی:

"پریا، انھیں کام کرنے دو۔"

جواب میں پریا کی ہنسی سنائی دیتی اور بوڑھا مچھیرا بی بی کو منع کرتا کہ پریا کو کچھ نہ کہے۔

ان دنوں میں بھی اور دوسرے دنوں میں بھی پریا سویرے سویرے گھاٹ پر ضرور آتی تھی۔ سائبان کے سامنے اپنی کشتی پر کھڑے کھڑے وہ کچھ دیر تک جہاز سے باتیں کرتی، کبھی مجھ کو بھی سائبان کے نیچے بلوا لیتی، اور اگر جہاز اٹھ کر چلا جاتا تو مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔ کچھ بچکانی سی باتیں کرتی تھی۔ اپنے کتے بلی کے قصے زیادہ سناتی، یا یہ بتاتی تھی کہ کل بی بی نے اسے کس کس بات پر ڈانٹا تھا۔ کبھی وہ مجھ سے کوئی بات اس طرح اچانک پوچھ بیٹھتی کہ مجھ کو گردن کے اشارے کی جگہ زبان سے جواب دینے کی کوشش کرنا پڑتی۔ اس پر وہ خوب ہنستی اور بی بی کی ڈانٹ کھاتی، پھر جھیل کے دور افتادہ حصوں کی طرف نکل جاتی تھی۔ دوپہر کو بی بی اسے زور سے پکارتی اور اس کی کشتی ناؤ کی طرف بڑھتی نظر آتی۔ اس کے بعد سے ناؤ پر سے بار بار اس کے ہنسنے اور بی بی کے بگڑنے کی آوازیں آتیں۔ تیسرے پہر کو وہ پھر نکلتی اور گھاٹ کے سامنے ٹھہرتی۔ اگر اس وقت جہاز موجود نہ ہوتا تو وہ مجھ سے اس کی باتیں کرتی تھی۔ اسے جہاز کی ہر بات میں ہنسی کا سامان نظر آتا تھا چاہے وہ اس کا تمباکو پینا ہو، یا اس کا بے ڈھنگا لباس ہو، یا اس کے مکان پر لگا ہوا بادبان۔

ایک دن جب وہ مجھے جہاز کا کوئی قصہ سنا رہی تھی، مجھے شبہ ہوا، پھر یقین ہو گیا، کہ اسے بالکل نہیں معلوم کہ آٹھ برس پہلے تک جہاز بازاروں میں مسخراپن کیا کرتا تھا۔ اور اس دن پہلی بار میں نے زرا اطمینان کے ساتھ بولنے اور اسے جہاز کی نقالیوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کی۔ دیر تک کوشش کرتا رہا۔ پھر بھی وہ ہنسے بغیر بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی، جس طرح آخر میں میرا باپ میری بات سننے لگا تھا۔ اسی وقت جہاز تمباکو پیتا ہوا سائبان کے نیچے آ گیا۔ اس نے میری مشکل آسان کی اور پریا کو بتا دیا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ پھر اس نے دو تین چھوٹی چھوٹی نقلیں کر کے دکھا بھی دیں۔ مجھ کو وہ اس کی پرانی نقلوں کی بھونڈی نقلیں معلوم ہوئیں لیکن پریا کو اتنی ہنسی آئی کہ اس کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ وہ کچھ اور نقلیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن جہاز اتنی ہی دیر میں کھانسی سے ہلکان ہو گیا تھا۔ پریا اس کی کھانسی کے رکنے کا انتظار کر رہی تھی، لیکن جہاز نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا کہ وہاں سے چلی جائے۔ پریا نے ہنستے ہوئے اپنی کشتی موڑی اور جاتے جاتے بولی:

"جہاز، جہاز، تم تو بی بی کو بھی ہنسا دو گے۔"

دوسری صبح وہ روز سے کچھ پہلے سائبان کے سامنے آ گئی، لیکن اس دن جہاز کہیں نکل گیا تھا۔ اس نے مجھ سے جہاز کی باتیں شروع کر دیں اور کل کی نقلوں کا حال اس طرح بتایا جیسے میں نے کل، بلکہ اس سے پہلے بھی کبھی، جہاز کو نقلیں کرتے نہ دیکھا ہو، بلکہ مجھے یہی پتا نہ ہو کہ جہاز کبھی نقلیں بھی کرتا تھا۔ میں سنتا رہا، پھر اسے بتانے کی کوشش کرنے لگا کہ جہاز پیٹھ پر بادبان باندھ کر بازاروں میں گھومتا تھا اور جہازوں کے ڈوبنے کی بھی نقلیں کرتا تھا۔ نہیں بتا سکا، نہ زبان سے، نہ اشاروں سے۔ آخر چپ ہو گیا۔

"کل،" میں نے دل میں کہا، "جیسے بھی ہو، میں تم کو ضرور بتاؤں گا۔"

میں نے اسے واپس جاتے دیکھا۔

"کل،" میں نے پھر دل میں کہا، "جیسے بھی ہو۔"

اسی شام میرا منھ بولا باپ شیشہ گھاٹ پر آیا۔

اس ایک سال میں وہ اتنا بوڑھا ہو گیا تھا جتنا آٹھ سال میں جہاز نہیں ہوا تھا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ آ گئی تھی اور جہاز اس کو سہارا دے کر لا رہا تھا۔ آتے ہی اس نے مجھ کو چمٹا لیا۔ آخر جہاز نے اس کو مجھ سے الگ کیا، ٹھیک سے بٹھایا، پھر میری طرف مڑا۔

"تمھاری نئی ماں مر گئی،" اس نے مجھے بتایا اور کھانسنے لگا۔

۵

منھ بولے باپ سے میری کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جہاز اس کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسے لے کر کہیں چلا گیا تھا اور رات گئے اکیلا واپس آیا تھا۔ اس وقت میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ جہاز بھی کچھ دیر تک تمباکو پینے کے بعد شاید سو گیا۔ میں سوچتا رہا کہ میرا منھ بولا باپ اتنی جلدی بوڑھا کس طرح ہو گیا۔ پھر مجھے اپنی نئی ماں کا خیال آیا جو مجھے بولتے دیکھے بغیر مر گئی تھی اور شاید پاگل بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر مجھے شیشہ گھاٹ پر گذارا ہوا اپنا ایک سال یاد آنے لگا۔

میں وہاں پھیلی ہوئی اور بہت کم ٹوٹنے والی خاموشی سے کبھی کبھی اکتا جاتا تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ جگہ ہمیشہ آوازوں سے بھری رہتی تھی۔ شیشے والوں اور مچھیروں اور دوسرے گھاٹوں کی سمت سے مدھم پکاریں آتی تھیں اور جھیل پر آبی پرندے بولتے تھے۔ لیکن میں دھیان نہیں دیتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے زرا سا کانوں پر زور دیا تو سائبان کی طرف سے کنارے کو چھو کر پلٹتی ہوئی لہروں کی رکی رکی آوازیں آئیں اور بی بی کی ناؤ کے تختوں کی ہلکی چرچراہٹ سنائی دی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ شیشہ گھاٹ کو میرے ہی رہنے کے لیے اور مجھ کو شیشہ گھاٹ ہی پر رہنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

"کل صبح میں جہاز کو بتا دوں گا،" میں نے خود سے کہا اور سو گیا۔

صبح کو میری آنکھ روز کی طرح جہاز کے کھانسنے کی آواز سے کھلی۔ پھر مجھے پریا کی آواز بھی سنائی دی۔ دونوں روز کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ لیکن جہاز جہاں بیٹھا تھا وہاں سے پریا کی کشتی دکھائی نہیں دیتی تھی، اس لیے جہاز کو زور زور سے بولنا اور بار بار کھانسنا پڑ رہا تھا۔

میں اٹھ کر سائبان کے نیچے آ گیا۔ پریا سامنے ہی اپنی کشتی کے بیچ میں کھڑی تھی۔ اس نے جہاز سے ایک دو باتیں اور کیں۔ بی بی کا کچھ ذکر تھا۔ پھر وہ الٹے قدموں چلتی ہوئی کشتی کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی۔ اس کے پیروں کی ہلکی سی جنبش سے کشتی نے دھیرے دھیرے گھوم کر آدھا چکر کھایا۔ اب پریا کی پیٹھ سائبان کی طرف تھی۔ میں نے پہلی بار بی بی کی اس بیٹی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور یہ سوچ کر پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوا کہ بی بی کی سی عورت اس کی ماں ہے۔ اسی وقت اس کے بدن نے جھکولا کھایا اور کشتی سائبان سے دور ہونے لگی۔ پھر آہستہ سے ڈگمگائی اور رک گئی۔ پریا نے اپنے داہنے بائیں اور سامنے پھیلی ہوئی جھیل کو دیکھا۔ کشتی پھر آہستہ سے ڈگمگائی لیکن پریا نے اپنے بدن کو سادھ کر اس کا توازن درست کر دیا۔ اس کے پیروں کو پھر ہلکی سی جنبش ہوئی۔ کشتی نے ایک بار پھر بہت دھیرے دھیرے گھوم کر آدھا چکر کھایا اور میں نے سامنے سے بھی پریا کو سر سے پیر تک دیکھا۔ مجھے اندیشہ سا ہوا کہ اس کو میرا اس طرح دیکھنا بُرا نہ لگے، لیکن اس کی نظریں میری طرف نہیں تھیں۔ وہ گھاٹ کے ٹھہرے ہوئے پانی کو بہت غور سے، جیسے زندگی میں پہلی بار، دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ رک رک کر چلتی ہوئی کشتی کے سائبان

والے سرے پر آ گئی۔ تھوڑا جھک کر اس نے ایک بار پھر پانی کو غور سے دیکھا، سیدھی کھڑی ہوئی، اپنے پورے بدن کو سادھا اور بہت اطمینان سے جھیل کی سطح پر پیر رکھ دیا جیسے کوئی سوکھی زمین پر قدم رکھتا ہے۔ پھر اس کے دوسرے پیر نے کشتی کو چھوڑا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر دوسرا قدم۔

"پانی پر چل رہی ہے!" میں نے کچھ حیرت اور کچھ خوف کے ساتھ خود کو بتایا، زرا دور پر تمبا کو پیتے ہوئے جہاز کی طرف گردن موڑی، پھر جھیل کی طرف دیکھا۔ پریا کی خالی کشتی اور سائبان کے درمیان صرف پانی تھا جس پر موٹی لہروں کے دُہرے تہرے دائرے پھیل رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ان دائروں کے بیچ سے پریا کا سر اُبھرا۔ اس نے پانی پر کئی بار ہتھیلیاں ماریں جیسے جھیل کی سطح کو پکڑنا چاہ رہی ہو۔ پانی کی آواز کے ساتھ بہت سے چھینٹے اُڑے اور مجھے جہاز کی آواز سنائی دی:

"پریا، پانی کا کھیل نہ کرو۔"

پھر اس کے گلے میں دھوئیں کا پھندا پڑا اور وہ کھانستے کھانستے دُہرا ہو گیا۔ دم بھر کے لیے میری نگاہ اس کی طرف مڑی۔ اس پر دورہ سا پڑا ہوا تھا اور وہ کسی کی مدد کا محتاج معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے پھر جھیل کی طرف دیکھا۔ مجھے سپاٹ پانی پر لہروں کے نئے دائرے پھیلتے دکھائی دیے۔

وہ پھر اُبھری، اور پھر نیچے بیٹھنے لگی۔ میری نظر اس کی آنکھوں پر پڑی اور میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جہاز!" میں نے زور سے پکارا، پھر میری زبان میں گرہیں پڑ گئیں۔

میں جہاز کی طرف لپکا۔ اس کی کھانسی رک گئی تھی لیکن سانس گھر گھرا رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا سینہ اور دوسرے سے آنکھیں مل رہا تھا۔ میں نے زینے پر چڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے زور سے ہلایا۔

"... پریا..." میرے منھ سے نکلا۔

اپنی زرد آنکھوں سے کچھ دیر وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ سے کوئی شکاری پرندہ چھوٹ گیا ہے۔ سائبان میں اترنے والے کچے زینوں پر دھول اُڑ رہی تھی اور جہاز پانی کے کنارے تھا۔

پریا کی کشتی اب پورا چکر کاٹ چکی تھی۔ جہاز نے کشتی کو دیکھا، پھر پانی کو۔ پھر اس نے کسی اجنبی سی بولی میں پوری طاقت سے ایک آواز لگائی۔ میں نے سنا کہ ناؤ پر سے بی بی نے بھی اتنی ہی طاقت سے اس آواز کو دُہرایا۔ پھر دور دور تک کئی طرف سے یہی آواز آئی۔ مجھے پھر بی بی کی آواز سنائی دی:

"دکھیا؟"

"پریا!" جہاز نے اتنے زور سے کہا کہ اس کے سامنے جھیل کا پانی ہل گیا۔

دور اور قریب کی آوازوں نے جہاز کی آواز کو بار بار دُہرایا اور مجھے جال گھسیٹتے ہوئے اور خالی ہاتھ مچھیرے کئی طرف سے گھاٹ کی جانب دوڑتے دکھائی دیے۔ سائبان تک پہنچنے سے پہلے پہلے ان میں سے کئی پانی میں اتر گئے۔ جہاز انہیں اشارے سے کچھ بتا رہا تھا کہ بائیں طرف سے پانی کے اُچھلنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ بڑی ناؤ پر کتا بھونکتا ہوا اِدھر سے اُدھر دوڑ رہا ہے اور دورنگی بلی پیٹھ اونچی کیے ایک کوٹھری کی چھت پر سے اسے دیکھ رہی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ بی بی، قریب قریب ننگی، کسی خارش زدہ آدم خور مچھلی کی طرح پانی کو کاٹتی چلی آ رہی ہے۔ اس کا بدن پریا کی کشتی سے ٹکرایا اور کشتی اپنی جگہ پر پھِرکی کی طرح گھوم گئی۔ بی بی غوطہ لگا کر کشتی کے دوسری طرف اُبھری۔ اس نے جلدی جلدی مچھیروں کو کئی اشارے کیے اور پھر غوطہ لگایا۔

دوسرے گھاٹوں سے ملاحوں کی کشتیاں شیشہ گھاٹ کی طرف دوڑتی دکھائی دیں۔ کئی ملاح راستے ہی میں کود کر اپنی کشتیوں کے آگے آگے پیر رہے تھے۔

اب پریا کی کشتی سے سائبان تک اور سائبان سے کشتی تک پانی میں سر ہی سر تھے۔ جھیل کے کنارے بھی مجمع بڑھ رہا تھا۔ ہر چیز ہل رہی تھی اور ہر طرف ایک شور تھا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ پانی کی اُچھالوں کا شور سب سے زیادہ تھا جس میں وقت کے گذرنے کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ آخر [illegible] آواز نے بہت زور سے کچھ کہا۔ شور تیز ہو کر اچانک تھم گیا اور پانی میں اترے ہوئے سارے بدن بے آواز پیرتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ سب بالکل خاموش تھے، صرف ناؤ پر سے کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرا ایک ہاتھ کسی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ جہاز میرے پاس کھڑا تھا۔

Scanned with CamScanner

"چلو،" اس نے میرا ہاتھ ہلا کر کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے کدھر چلنے کو کہہ رہا ہے۔ مگر اب وہ مجھ کو مکان کے اندر لیے جا رہا تھا۔ میں نے پیچھے گھوم کر جھیل کی طرف دیکھنا چاہا لیکن جہاز نے میرے ہاتھ کو زرا سا جھٹکا دیا اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"چلو،" اس نے پھر کہا۔

ہم مکان کی پشت والے دروازے پر آئے۔ جہاز نے دروازہ کھولا۔ سامنے بنجر میدان تھا۔

"وہ مل گئی ہے،" اس نے مجھے بتایا، پھر میدان کے بائیں کنارے کی طرف اشارہ کیا اور جلدی جلدی کہنے لگا، "تھوڑی دیر میں شیشے والوں کے یہاں پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے سواری مل جائے گی۔ نہ ملے تو کسی کو بھی میرا نام بتا دینا۔"

اس نے رومال میں بندھی ہوئی کچھ رقم میری جیب میں ڈال دی۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے کہا:

"اسے صرف تم نے ڈوبتے دیکھا ہے۔ سب تم ہی سے ایک ایک بات پوچھیں گے۔ بی بی سب سے زیادہ۔ بتا پاؤ گے؟"

میری آنکھوں میں وہ منظر آ گیا؛ سارے لوگ، کانوں میں بالے پہنے ہوئے مچھیرے، اور ہاتھوں میں کڑے ڈالے ہوئے ملاح، اور گھاٹ گھاٹ کے سیلانی، میرے گرد دُہرے تہرے دائرے بنائے ہوئے ہیں، اور ہر طرف سے سوال ہو رہے ہیں، اور بی بی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ پھر سب چپ ہو جاتے ہیں اور بی بی آگے بڑھ کر میرے قریب آ جاتی ہے۔

جہاز نے میرے کپکپاتے ہوئے بدن کو دیکھا اور بولا:

"مجھے کچھ بتا دو... کچھ بھی... وہ پانی میں گر گئی تھی؟"

"... نہیں..." میں نے کسی طرح کہا۔

"پھر؟" جہاز نے پوچھا، "خود جھیل میں کود گئی تھی؟"

"نہیں،" میں نے کہا اور سر سے اشارہ بھی کیا۔

جہاز نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا:

"کچھ بتاؤ، جلدی۔"

مجھے معلوم تھا کہ میں زبان سے کچھ نہ بتا پاؤں گا، اس لیے میں نے ہاتھوں کے اشارے سے اسے بتانے کی کوشش کی کہ وہ پانی پر چلنا چاہ رہی تھی۔ لیکن میرے ہاتھ بار بار رک جاتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے اشارے بھی ہکلانے لگے ہیں اور ان کا کوئی مطلب نہیں نکل رہا ہے۔ لیکن جہاز نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا:

"پانی پر چل رہی تھی؟"

"ہاں،" میں نے پھر زرا مشکل سے کہا۔

"جہاز!" گھاٹ کی جانب سے بی بی کی دہاڑ سنائی دی۔

بوڑھے مسخرے کی زرد آنکھوں نے آخری بار مجھے دیکھا۔ اس کی گردن اقرار کے انداز میں ہلی اور میں مڑ کر آگے بڑھ گیا۔

**

نیر مسعود

نوشدارو

۱

سیدھی گلی کے آخر میں بائیں ہاتھ پر احاطہ تھا جس کے ایک سرے پر پڑا ہوا تخت اب شاید استعمال نہیں ہوتا تھا۔ دھوپ اور برساتوں نے اس کی ہیئت بگاڑ دی تھی۔ چولیں ڈھیلی ہو گئی تھیں اور چاروں پائے ایک ہی طرف جھکے ہوئے تھے۔ پھر بھی ابھی وہ استعمال ہو سکتا تھا۔

تخت کے سامنے والے سرے پر احاطے کا واحد درخت تھا جس میں ایک ساتھ زرد پھولوں کے فانوس نما گچھے اور لمبی موٹی سیاہ پھلیاں لٹک رہی تھیں۔ درخت کے پورے گھیر کے نیچے زمین پر سوکھی پنکھڑیوں کی دبیز تہہ اور اس کے اوپر تازہ پنکھڑیوں کا فرش تھا جس پر کئی جگہ درخت سے گری ہوئی آدھی پوری پھلیاں پڑی ہوئی تھیں۔

درخت کے تنے سے کچھ ہٹ کر ایک ڈیوڑھی کا ادھ کھلا دروازہ تھا۔ ڈیوڑھی کے اوپر ایک کمرے کے بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ کمرے کے اوپر مکان کی چھت تھی جس کی پتلی منڈیر پر درخت کی کچھ شاخیں اس طرح ٹکی ہوئی تھیں جیسے تھک جانے کے بعد سستا رہی ہوں۔

Scanned with CamScanner

آسمان پر منڈلاتی ہوئی ایک چیل نیچے جھکی اور دم بھر میں منڈیر پر آ بیٹھی۔ بھیلتے سکڑتے پروں کو اوپر نیچے کر کے اس نے ارادہ بدل دیا، اپنے بدن کو اُچھالا اور آسمان میں غائب ہو گئی۔

دوسری طرف سے دو ہاتھ آہستہ آہستہ بلند ہوئے۔ ٹیڑھی میڑھی انگلیوں نے منڈیر کی اوپری ناہموار اینٹوں کو ٹٹول کر مضبوطی سے پکڑ لیا اور دیر تک پکڑے رہیں۔ پھر دونوں ہاتھوں کے بیچ سے ایک تھکے تھکے بوڑھے آدمی نے سر اُبھارا اور منڈیر پر ٹھوڑی ٹکا دی۔ دیر تک وہ شاخوں کے اُس پار کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور ہاتھ بڑھا کر پھولوں کے ایک گچھے کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ جھک کر ناک اس کے قریب لے گیا اور دو چھوٹی چھوٹی سانسیں لے کر پھولوں کو سونگھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور نتھنے ذرا پھڑپھڑائے۔ اس نے گچھے کو چھوڑ دیا اور شاخوں کو اِدھر اُدھر کرنے لگا۔ ایک موٹی سی پھلی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ آنکھیں بند کیے کیے اس نے پھلی کو بھی سونگھا۔ پھر اور زور سے سانس کھینچ کر سونگھا۔ تیسری بار سونگھنے میں اس نے اتنے زور سے سانس کھینچی کہ اس کے دونوں نتھنے قریب قریب بند ہو گئے۔

"املتاس،" اس نے خود کو بتایا اور پھلی کو چھوڑ دیا۔

۲

ڈیوڑھی میں اندر والا دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر کا ایک آدمی ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا لٹکائے ہوئے ڈیوڑھی میں آیا۔ باہری دروازے سے اس نے ایک قدم نکالا تھا کہ مکان کے اندر سے کسی عورت کے کچھ کہنے کی آواز آئی۔ وہ پلٹ کر اندر والے دروازے کے قریب آیا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

اندر سے عورت نے کچھ کہنا شروع کیا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے سنتا رہا، پھر بولا:

"سب پوچھ لیں گے بھائی، ملاقات بھی تو ہو۔"

وہ پھر مڑ کر باہری دروازے کی طرف بڑھا لیکن دو قدم چلا تھا کہ اس کا تھیلا کسی چیز میں اٹک گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہتا ہوا رک گیا۔

Scanned with CamScanner

اس کے بائیں ہاتھ ڈیوڑھی کی دیوار سے لگی ہوئی ایک بائیسکل کھڑی تھی۔ اس کے دونوں ٹائر پچک کر کئی جگہ سے چرچ گئے تھے۔ اندر کے ٹیوب تھوڑے باہر نکل آئے تھے اور ان پر مٹی کی تہہ جم گئی تھی۔ ایک پیڈل لکڑی کا تھا اور دوسرے پیڈل کی جگہ صرف لوہے کی ڈنڈی رہ گئی تھی۔ گدی پر ایک میلا تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ ہینڈل کے دونوں طرف بدرنگ کپڑوں کی پوٹلیاں اور گھاس پھوس سے بھری ہوئی لمبی لمبی تھیلیاں لٹک رہی تھیں۔ اگلے پہیے کی کئی تیلیوں کے سرے رِم سے الگ ہو کر باہر کی طرف مڑ گئے تھے اور ایک تیلی نے آدمی کے ہاتھ والے تھیلے کو پھنسا لیا تھا۔ آدمی نے تھیلے کو دو تین چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیے، پھر جھک کر تیلی کو چٹکی سے پکڑا اور تھیلے کو اس سے چھڑا لیا۔ باہری دروازے کی طرف گھومتے گھومتے وہ پھر رکا۔ بائیسکل کے فریم میں سُتلی سے بندھا ہوا ایک چھوٹا ہَوا بھرنے کا پمپ اس کے جھٹکوں سے ڈھیلا ہو کر نیچے لٹک آیا تھا۔ اس نے جھک کر اسے اوپر کیا تو وہ فریم سے الگ ہو کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے پمپ کے ہوا پھینکنے والے سرے کو ایک انگلی کی پور سے بند کیا، دوسرے ہاتھ سے دستہ پکڑ کر پمپ کو دو تین بار چلا کے دیکھا، پھر اسے دروازے کے باہر اُچھال دیا۔ زنگ آلود پمپ پنکھڑیوں کے زرد فرش پر گرا اور خود بھی املتاس کی پھلی معلوم ہونے لگا۔

آدمی دروازے سے نکل کر احاطے میں، احاطے سے لمبی سیدھی گلی میں آیا۔ کوئی سو قدم چل کر داہنی طرف کی گلی میں، پھر بائیں ہاتھ والی گلی میں مڑا۔ کچھ دیر بعد وہ شاہراہ کے مشرقی کنارے پر کھڑا تھا۔ داہنے بائیں دیکھ کر اس نے تیزی سے شاہراہ پار کی اور مغربی سمت کے چوڑے فٹ پاتھ پر آ گیا۔ سامنے کی زینہ دار گلی میں اترا اور اس سے نکل کر ایک اور سڑک پر آیا۔ اسے پار کر کے ایک اور ڈھلوان گلی میں اترا اور چوک کے دورویہ بازار میں داخل ہو گیا۔ داہنے ہاتھ گھوم کر بڑھتا ہوا وہ پھول والوں تک پہنچا اور بائیں ہاتھ کی گلی میں مڑ گیا۔ سامنے کچھ بچے شیشے کی گولیوں سے کھیل رہے تھے۔ اس نے ایک بچے سے پوچھا:

"کیوں بیٹے، اِدھر کہیں ہینڈ پمپ لگا ہے؟"

"وہ خراب پڑا ہے،" بچے نے اسے بتایا اور چوک کی طرف اشارہ کیا۔ "اُدھر کے نل میں ابھی پانی آ رہا ہو گا۔"

"اور وہ خراب والا ہینڈ پمپ کدھر ہے؟"

Scanned with CamScanner

بچے نے ہاتھ ادھر اُدھر لہرا کر اسے پتا بتایا اور پھر کہا:

"مگر اس میں پانی نہیں نکلتا، خراب پڑا ہے۔"

پھر اُس نے اپنے کسی ساتھی کو کھیل میں بے ایمانی کرتے دیکھ لیا اور اس سے الجھ پڑا۔

آدمی اس کی بتائی ہوئی پہلی گلی میں داخل ہوا اور کئی تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا آخر اس گلی تک پہنچ گیا جس کے دہانے پر ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ گلی میں داہنے ہاتھ کے تیسرے مکان کا باہری کمرا اُسے کھلا نظر آیا۔ کمرے سے متصل ڈیوڑھی کے چھوٹے سے دروازے کے سامنے لکڑی کے اونچے سے اسٹول پر اسی کا ہم عمر ایک آدمی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے نظریں اٹھائیں۔

"کیوں بھائی صاحب،" آنے والے نے زرا جھجک کر پوچھا، "یہاں کہیں کشن چند عطار کی دکان..."

"یہی ہے،" بیٹھے ہوئے آدمی نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جواب دیا۔ "دکان تو یہی ہے لیکن اب... ویسے ہم پیٹنٹ حکیمی دوائیاں بھی رکھتے ہیں۔"

آنے والے نے کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ دیواری الماریوں کے کچھ خانوں میں سجی ہوئی شیشیوں اور ڈبوں کے سوا کمرا خالی خالی سا معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے کشن چند جی کے بارے میں کچھ معلوم کرنا تھا۔"

"ہاں ہاں، کہیے۔"

آنے والا کچھ کہتے کہتے رکا۔ ایک دفعہ پھر اس نے کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ اس بار اسے دروازے سے لگا ہوا وہ چوکور سائن بورڈ بھی دکھائی دیا جس پر صلیب کے چھوٹے سے سُرخ نشان کے نیچے "کشن چند اینڈ سنس" اور اس کے نیچے "انگریزی دواخانہ" لکھا ہوا تھا۔

"آپ ان کے..." وہ پھر کہتے کہتے رکا۔

"پوتا ہوں میں ان کا۔"

آنے والے کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہوا، لیکن اگلا سوال کرنے سے پہلے وہ پھر کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ دکان والا اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آنے والے نے رکتے ہوئے کہا:

Scanned with CamScanner

"ابھی وہ... مجھے معلوم کرنا تھا کیا وہ ابھی..." پھر اس نے ارادہ بدلا اور بولا، "میں یعقوب عطار صاحب کے یہاں سے آیا ہوں۔ ان کا بیٹا ہوں۔ آپ نے ان کا نام شاید سنا ہو۔"

دکان دار زرا چونچال ہو گیا۔

"یعقوب عطار صاحب؟ ہاں، بالکل بالکل۔ وہ تو ہمارے بابا کے گرو تھے، مطلب، بابا نے عطاری کا کام انھیں سے سیکھا تھا۔ آپ یعقوب صاحب کے بیٹے ہیں؟ تب تو اپنے ہی آدمی ہوے۔"

اس نے کھڑے ہو کر آنے والے سے ہاتھ ملایا، اخبار تہ کر کے اسٹول کے نیچے رکھا، کمرے کے اندر سے ایک چھوٹا اسٹول لایا اور بولا:

"وہ تو بابا کے پاس بہت آتے تھے۔ مجھے کچھ کچھ یاد بھی ہیں۔ آپ کا شُبھ نام؟"

"یوسف کہتے ہیں مجھے۔"

"میں لال چند ہوں۔ بیٹھیے بیٹھیے۔ آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔"

لیکن یوسف کو اس رسمی گفتگو میں دل چسپی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا:

"لال چند جی، مجھے زرا... مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ... پوچھتے اچھا نہیں معلوم ہو رہا ہے۔"

"نہیں نہیں، ایسی کیا بات ہے۔"

"لال چند جی، کیا کشن چند جی ابھی ہیں؟"

"جی ہاں، بابا بھگوان کی کرپا سے ابھی ہیں۔" یوسف دوسرے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"ملاقات بھی کرتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ملاقات؟ ملاقات تو مشکل ہے۔ کم زور بہت ہو گئے ہیں۔ چھیاسی پار کر چکے ہیں۔"

"چل پھر لیتے ہیں؟"

"ہاں، تھوڑا بہت تو... مطلب، اپنے چھوٹے موٹے کام کر لیتے ہیں۔"

"ان سے بہت ضروری کام تھا لال چند جی،" یوسف نے کہا۔ "اصل میں ان سے کچھ پوچھنا تھا۔ تیس بتیس سال ادھر کی باتیں ہیں۔"

"لیکن اب انھیں کچھ یادواد نہیں ہے۔ زرا زرا بہکنے بھی لگے ہیں،" لال چند نے کہا، اور پھر

Scanned with CamScanner

کہا، "چھیاسی پار کر چکے ہیں۔"

"پھر بھی...."

"پھر ایک بات اَور بھی ہے،" لال چند بولا اور چپ ہو گیا۔

"کہیے کہیے۔"

"کوئی ان سے ملنا چاہتا ہے تو منع کر دیتے ہیں۔ ناتے داروں سے بھی نہیں ملتے۔ بگڑنے لگتے ہیں۔"

"اچھا، اگر ان سے کہا جائے آپ کے استاد آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟ تب تو شاید انکار نہ کریں۔"

"تب تو دوڑے چلے آئیں گے۔ اب بھی کبھی کبھی پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ہمیں استاد کے پاس لے چلو۔"

"لال چند جی، ان کے استاد..."

اچانک لال چند نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو چپ کرا دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

چھوٹے قد کا ایک بہت دُبلا بوڑھا آدمی صرف ایک میلی دھوتی لپیٹے ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا تھا۔ آگے کو بڑھے ہوئے ہاتھوں کی مٹھی میں سلگتی ہوئی اگربتیاں پکڑے وہ کمرے کی طرف اس طرح بڑھا جیسے بچے جلتی ہوئی شمع لے کر چلتے ہیں۔ کھڑے ہوئے آدمیوں کی طرف توجہ کیے بغیر وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کے باہر خوشبودار دھوئیں کی پتلی پتلی لکیریں کئی بار نیچے اوپر ہوئیں، پھر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئیں۔ بوڑھا کمرے کے کسی ایسے گوشے میں پہنچ گیا تھا جہاں باہر والے اُسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"بابا،" کچھ دیر بعد لال چند نے دھیرے سے یوسف کو بتایا۔

یوسف کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بوڑھا کمرے سے باہر آ گیا۔ زرا سا رک کر اس نے دونوں ہتھیلیاں اپنے گالوں پر پھیریں، کھڑے ہوئے آدمیوں پر ایک چھلکتی ہوئی نظر ڈالی، پھر مڑا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

دونوں آدمی خاموش کھڑے تھے۔ پھر لال چند نے اسٹول پر بیٹھ کر یوسف کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

Scanned with CamScanner

"یہ تو بہت بوڑھے ہو گئے،" یوسف بیٹھتے ہوئے کہا۔

"چھیاسی پار کر چکے ہیں،" لال چند نے پھر اسے یاد دلایا۔ "یعقوب دادا نے کتنی عمر پائی ہو گی بھلا؟"

"وہ بھی ابھی ہیں،" یوسف نے بتایا۔ "چھیانوے سال کے ہو رہے ہیں۔"

لال چند کچھ کہنے چلا تھا لیکن پھر اس نے ارادہ بدلا، اور پوچھا:

"آپ کو بابا سے کیا معلوم کرنا تھا؟"

"کئی باتیں ہیں۔ بہت پرانی باتیں ہیں۔ دیکھیے جو انھیں یاد ہوں۔"

"پرانی باتیں کبھی کبھی کرتے تو ہیں، مگر سب مل جل گئی ہیں۔ کہیں کی بات کہیں جوڑ دیتے ہیں۔"

"پھر بھی، لال چند جی، ان سے ملنا ضروری ہے۔"

"اچھا دیکھیے۔ کسی موقعے سے کہوں گا۔ یعقوب دادا کے نام پر شاید راضی ہو جائیں۔"

"تو میں دو ایک دن میں آ کے پوچھ لوں گا،" یوسف نے کہا، گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھیے، کچھ چائے پانی..."

"نہیں، تکلیف نہ کیجیے۔ پھر آؤں گا۔ دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔"

وہ سلام کے لیے ہاتھ اٹھا کر مڑ رہا تھا کہ ڈیوڑھی کے دروازے سے بوڑھا عطار پھر باہر نکلا اور سیدھا لال چند کی طرف بڑھا۔

"ارے، للوا،" وہ یوسف کی طرف دیکھے بغیر لال چند سے مخاطب ہوا، "یہ ہمارے استاد کا بھیا تو نہیں ہے؟"

"ہاں بابا، یعقوب دادا کے سپتر ہیں، یوسف صاحب۔"

"وہی تو ہم کہیں۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر شمار آیا کہ یہ تو استاد کی آنکھ ہے۔"

پھر اس نے گردن گھما کر یوسف کی طرف دیکھا۔ یوسف نے زرا جھک کر اسے آداب کیا اور بولا:

"کِشن چاچا، ہمارے ابا آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔"

"کیوں نہ یاد کریں گے۔ اپنے کِشنا کو یاد نہ کریں گے تو کیا اس نکھٹو للوا کو یاد کریں گے؟"

Scanned with CamScanner

لال چند بچوں کی طرح اٹھلایا اور ہنسنے لگا۔ یوسف نے کہا:
"تو چاچا، کبھی ہمارے یہاں آیئے۔"
"کتنی بار تو کہا، یہ نکھٹو لے ہی نہیں چلتا۔"
"ہم آکر آپ کو لے جائیں گے،" یوسف نے کہا، "کب چلیے گا؟"
"للوا، بھیا کو کچھ پان شربت..."
"پھر کبھی، چاچا،" یوسف نے کہا، "آپ کے یہاں کوئی تکلف تھوڑی ہے۔ تو بتایئے، ہمارے یہاں کب آ رہے ہیں؟"

لیکن بوڑھے نے اس کی آواز شاید سنی ہی نہیں۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا:
"اساڑھ کا چھینٹا گرا، اور استاد... کِشنا! اٹھا سائیکل، سنبھال جھولے... پھر پانچ پانچ دن ندی نالے، تال تلیا، جنگل جھاڑی، کچھ نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک ایک جھولا تو بیر بہوٹی ہی سے بھر لیتے تھے۔ پھر لوٹ کر سب چیزوں کی چھنٹائی... کشنا! اس گوند کو پہچان... کشنا! بتا تو یہ کا ہے کا زیرہ ہے؟... ارے کشنا! جو ہزار چیز کو آنکھ پر پٹی باندھ کے نہ بتا دے وہ بھی کوئی عطار میں عطار ہے؟... پھر استاد، ہم سے تو یہ نہ ہوگا... ہوگا پُوت، ہوگا۔ بس لگے رہو۔ آنکھ پیدا ہو جائے گی... کیا بات ہے!"

بوڑھا سانس درست کرنے کو رکا۔ یوسف نے کھنکھار کر کچھ کہنا چاہا لیکن لال چند نے اشارے سے اسے چپ کرا دیا۔

"... اور استاد کی آنکھ!" بوڑھے نے پھر بولنا شروع کیا، "سو سو سال پرانے مرکب لے کر جاؤ... استاد! یہ معجون سمجھ میں نہیں آئی۔ استاد نے دیکھا، سونگھا، چکھا، بس۔ لکھو! ایک سانس میں پورا نسخہ بول دیا۔ پچاس پچاس جز، وزن سمیت۔ کیسے کیسے خاندانی حکیم، پشتینی نسخوں کو اولاد سے بھی چھپانے والے، استاد کے نام سے گھبراتے تھے۔ دوائی دینے سے پہلے مریض سے قسم لیتے تھے: دیکھو، اس کی ایک رتی بھی یعقوب کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اور استاد بھی ہمارے، کیا بات تھی، نسخہ چرانے کو پاپ جانتے تھے۔ کوئی خاندانی دوائی ہاتھ آئی بھی کبھی تو منھ پھیر لیا: نہیں، غلط بات ہے۔ ہاں، کسی خاندان سے حکمت جاتی رہے، اس کے نسخے کی قسم نہیں تھی۔ مگر بس بنایا اور رکھ لیا۔ بہت ہوا کسی کو ایک خوراک دو خوراک یوں ہی دے دی۔ کیا مجال جو ایک پیسہ اس

سے کھالیں۔ حکیم نبا صاحب کا گھرانا ختم ہوا تو ان کا مرہم پنجہ طاؤس بھی ختم تھا۔ ہمارے استاد کو کہیں سے ایک سینگ کے سرے پر لگا ہوا مل گیا۔ لیجیے میرے صاحب، مرہم پنجہ طاؤس تیار! ایک شیشی ہمیں بھی دی۔ ہم نے کہا: استاد! مرہم نہیں، جادو ہے جادو، نسخہ لکھ رکھیے۔ مگر نہ! کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ کشنا! ہماری چیز نہیں ہے۔ اسی طرح کالے کہانیوں کی نوشدارُو..."

"نوشدارُو!" اچانک یوسف بول پڑا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ لال چند اسے چپ رہنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ "کشن چاچا، آپ اس نوشدارُو کو پہچان لیں گے؟"

بوڑھا ٹھٹھک کر چپ ہو گیا تھا۔ یوسف نے کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا، پھر قدرے مایوسی کے ساتھ کہا:

"آپ نوشدارو کی بات کر رہے تھے، کشن چاچا۔"

"نوشدارو؟" بوڑھے نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جو آپ کے استاد نے بنائی تھی۔"

"ہمارے استاد؟ ہم خود استاد ہیں،" بوڑھے نے بے دلی سے کہا، لال چند کی طرف دیکھا، بولا، "للوا، ہم یہ کہنے آئے تھے، آج ہم تھوڑی سی مکو کی بھُجیا کھائیں گے۔"

پھر وہ مڑا اور ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

دونوں آدمی دیر تک ڈیوڑھی کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر لال چند نے لمبی سانس کھینچی اور بولا:

"بابا کو بولتے میں ٹوکنا غضب ہے۔"

"کیا کہیں، لال چند جی، غلطی ہو گئی۔ اصل میں نوشدارو کا نام سن کے رہا نہیں گیا۔"

"نوشدارو..." لال چند نے کہا، کچھ دیر تک آنکھیں سکیڑے رہا، پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولا، "بابا سے ہم نے نوشدارو کا نام کبھی نہیں سنا۔ مرہم پنجہ طاؤس کی بات تو بہت کرتے ہیں۔ ان کے پاس تھا بھی۔ کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ اب بھی کبھی کبھی ڈھونڈھنے لگتے ہیں۔ مگر نوشدارو کا نام آج پہلی بار لیا ہے۔ اکٹھا اتنی بہت سی باتیں بھی آج ہی کی ہیں، شاید استاد کا نام سن کر..."

"لال چند جی، ان دونوں کی ملاقات ضروری ہے۔ استاد شاگرد مل بیٹھیں گے تو کتنی ہی

باتیں یاد آجائیں گی۔ اسی میں ہو سکتا ہے نوشدارو بھی..." اس نے رک کر گھڑی دیکھی۔ "میں اصل قصہ بتادوں۔ آپ کو کوئی کام تو نہیں ہے؟"

"ہم تو دن بھر یہیں بیٹھتے ہیں،" لال چند بولا۔ "البتہ آپ..."

"نہیں، دفتر کا وقت تو گیا۔ درخواست بھیجنا ہو گی۔"

"پھر کیا غم ہے، بتائیے۔"

یوسف دیر تک خاموشی کے ساتھ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا:

"بتیس سال پہلے ابا نے عطاری کا کام چھوڑ دیا تھا۔ اصل میں ان سے دواؤں کی پہچان میں بھول چوک ہونے لگی تھی۔ ایک دن ایک جوان جوان سے حکیم صاحب دکان پر آکر بہت بگڑے کہ آپ میرے نسخوں میں اپنی حکمت نہ چلایا کیجیے۔ ابا نے کہا حکمت چلانے کی بات نہیں ہے، نسخے میں ایک دوا غلط بندھ گئی تھی۔ حکیم صاحب بولے اگر اسی طرح غلط دوائیں بندھنے لگیں تو پھر مریضوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر کوئی ٹھکانے لگ گیا تو میں کہاں جاؤں گا۔ ابا کچھ نہیں بولے۔ حکیم صاحب بک جھک کے چلے گئے تو بھی کچھ نہیں بولے۔ دیر کے بعد کہا تو صرف اتنا کہا کہ ان حکیم صاحب کے ابا ہم سے اپنے نسخوں کے وزن پوچھا کرتے تھے۔ دوسرے دن انھوں نے دکان ختم کر دی۔ دکان کا سامان، دوائیں، عرق ورق کچھ دن تک سینت کر رکھے رہے، پھر ایک دن اٹھے اور سب چیزیں دوسرے عطاروں کو بیچ دیں۔ جو بچ گئیں وہ خود سائیکل پر لاد لاد کر ادھر اُدھر بانٹ آئے۔ اچھا بھلا اپنے بیٹھنے کا تخت اندر سے اٹھوا کر باہر کھلے میں ڈلوا دیا اور کئی دن تک کسی سے کچھ نہیں بولے۔ پھر ٹھیک ٹھاک ہو گئے۔ سویرے گھومنے جاتے، باقی دن بھر گھر پر حکمت کی کتابیں دیکھتے رہتے تھے۔ اسی طرح برسوں گزر گئے۔ پھر ایک دن گھومنے نکلے تو آدھے راستے سے لوٹ آئے۔ کہنے لگے ٹانگیں ٹھیک کام نہیں کر رہی ہیں۔ اس دن رات بھر جاگتے رہے۔ دوسرے دن سویرے سویرے مجھے بلایا، ایک چھوٹی سی اچاری دی اور کہا اسے سنبھال کر رکھنا، اس میں ہماری نوشدارو ہے۔ پھر کہنے لگے ہمارے حواس بگڑ چلے ہیں اور ہاتھ پاؤں بھی رہے جا رہے ہیں۔ یہ نوشدارو سب صحیح کر دے گی۔ ہزاروں سال پرانا بادشاہی نسخہ ہے۔ میں نے کہا تو پھر اسے آج ہی سے شروع کر دیجیے۔ نہیں نہیں، کہنے لگے، اس کا کام اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی اور دوا کام نہیں کرتی۔ اس سے پہلے نقصان کر جاتی ہے۔ تم اسے چھپا کر رکھے رہو،

تب تک ہم دوسری دوائیں کھاتے رہیں گے۔ جب دیکھنا ہم بالکل بے کار ہو رہے ہیں تب اسے شروع کرنا، اس سے پہلے نہیں۔ پھر انھوں نے اچاری میرے ہاتھ سے لے لی اور اس کے پاس منھ لے جا کر چپکے سے کچھ کہا، وہ مجھے سنائی نہیں دیا..."

"اچھا، آپ نے بھی وہ دوائی دیکھی؟" لال چند نے پوچھا۔ "کس ٹائپ کی تھی؟"

"کچھ شہد کی سی چیز تھی،" یوسف نے جواب دیا۔ "خوشبو بہت تیز، ہلکی سی جھپک زعفران کی بھی تھی۔ خیر، اچاری ان سے لے کر میں نے پرانے کپڑوں کے صندوق میں رکھ دی۔ اس کو بھی برسوں گزر گئے ہیں۔ اب ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ کوئی بات سمجھ نہیں پاتے، آنکھوں کی روشنی قریب قریب جاتی رہی ہے، سنائی بھی بہت کم دیتا ہے، چل پھر بھی نہیں پاتے۔ ہاں، دن بھر میں ایک بار سرک سرک کر منڈیر تک جاتے ہیں اور کسی طرح منڈیر پکڑ کر کچھ دیر تک کھڑے رہتے ہیں۔ پھر وہیں بیٹھ جاتے ہیں اور اتنے ہی میں ایسے ہلکان ہو جاتے ہیں کہ آدھے دن تک ہل بھی نہیں پاتے۔"

"مطلب نوشدارو کا ٹائم آ گیا،" لال چند بولا۔

"وہی بتا رہا ہوں، لال چند جی،" یوسف نے کہا۔ "میں اسے بھول بھال گیا تھا، ڈاکٹری دوا چل رہی تھی۔ ایک دن انھوں نے ساری دوا زمین پر انڈیل دی اور دن بھر یہی کہتے رہے کہ کوئی دوا کام نہیں کرتی، کوئی دوا کام نہیں کرتی۔ تب مجھے نوشدارو یاد آ گئی۔ لیکن انھوں نے اس کی خوراک نہیں بتائی تھی، یا بتائی ہو، مجھی کو یاد نہ رہی ہو۔ خیر میں اچاری لے کر ان کے پاس پہنچا۔ بتایا کہ یہ نوشدارو ہے، آپ نے میرے پاس رکھائی تھی۔ مگر انھیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ میں نے کہا اسے کھائیے، فائدہ کرے گی۔ انھوں نے اچاری میرے ہاتھ سے لے کر کھولی، آنکھوں کے پاس کر کے اسے دیکھا۔ پھر زور زور سے سونگھا اور بڑے غصے میں آ کے چلّائے، زہر ہے، زہر! میں گھبرا گیا۔ اچاری ان سے لے کر واپس رکھ دی، مگر ان کو اس دن سے رٹ لگ گئی ہے کہ یوسف ہماری جان لینا چاہتا ہے۔ اپنی بہو کو بلا بلا کر کہتے ہیں ذرا یوسف سے پوچھو ہم نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ اسی دن سے میرے ہاتھ کا پانی تک پینا چھوڑ دیا۔ صرف بہو کا دیا ہوا کھا پی لیتے تھے۔ اب ان سے بھی انکار کر دیا ہے۔ آج دو دن سے یوں ہی ہیں۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر کشن چاچا... شاید کشن چاچا اس حالت میں کام آ جائیں۔"

"ہمارے بابا کی حالت بھی کچھ کچھ ایسی ہی ہو چلی ہے،" لال چند بولا، "لیکن آپ کا خیال ٹھیک ہے، یوسف بھائی، دونوں کی ملاقات بالکل ہونا چاہیے۔"

"تو میں کب آجاؤں؟"

"آپ کیوں تکلیف کیجیے۔ میں آج ہی کل میں بابا کو بھلا کر لاتا ہوں۔ شام کو ٹھیک رہے گا؟"

"ہاں، شام کے وقت کسی بھی دن، یا چھٹی کے دن کسی بھی وقت، مگر لال چند بھائی، زرا جلدی..."

"آپ چِنتا نہ کیجیے۔ مجھے خود فکر لگ گئی ہے۔"

"مکان کا پتا..."

"معلوم ہے۔ اُدھر جاتا رہتا ہوں۔ ایک دوست ہیں ادھر۔"

یوسف اٹھ کھڑا ہوا۔ لال چند نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا، کچھ دیر تک اسے واپس جاتے دیکھتا رہا، پھر اس نے ایک لمبی سانس لی، چھوٹا اسٹول اٹھا کر کمرے میں رکھا اور اپنے اسٹول پر بیٹھ کر زمین پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا۔

۳

ڈیوڑھی کے دروازے سے میلا پانی بہہ کر باہر احاطے میں پھیل رہا تھا۔ لال چند نے آہستہ سے کنڈی کھڑکائی۔ دروازہ کھل گیا۔ یوسف صرف ایک تہمد باندھے، ہاتھ میں چھوٹی سی بھیگی ہوئی جھاڑو لیے آدھے دھڑ سے باہر نکلا۔

"لال چند جی!" اس نے کہا، "آیئے آیئے۔"

"مجھے یہاں آکر پتا چلا۔ بڑا افسوس ہوا۔ کب...؟"

"آپ کے یہاں گیا تھا؟ اس کے دوسرے ہی دن رات کو کسی وقت،" یوسف نے کہا اور دروازہ پورا کھول دیا۔ "آیئے، اندر آجایئے۔ میں کرسیاں لا رہا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

"کرسی کی تکلیف نہ کیجیے، بیٹھوں گا نہیں،" لال چند بولا۔ "بات یہ ہے، بابا بھی ساتھ ہیں۔"

"کشن چاچا؟ آئے ہیں؟ کہاں ہیں؟"

"ادھر تخت پر آرام سے بیٹھے ہیں۔"

یوسف دروازے سے باہر نکلنے لگا مگر لال چند نے اسے روک دیا۔

"نہیں یوسف صاحب، اب اچھا ہی ہے کہ آپ ان کے سامنے نہ جائیں، کاہے سے کہ یہاں آتے آتے وہ بھول گئے ہیں کہ میں انھیں استاد سے ملانے لا رہا تھا۔ آپ کو دیکھیں گے تو... وہاں آرام سے بیٹھے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں،" یوسف نے دھیرے سے کہا۔

"پھر جو اصل کام تھا، مطلب، نوشدارو..."

"ہاں، لال چند جی،" یوسف بولا، "مگر نوشدارو انھیں یاد آ گئی تھی۔ اس دن شام کو انھوں نے مجھے بلا کر پاس بٹھایا۔ دیر تک بڑی محبت سے باتیں کرتے رہے۔ مجھے بھی تسلی ہوئی کہ آخر مجھ سے راضی ہو گئے ہیں۔ پھر اچانک بولے، یوسف، اتنے دن ہو گئے، تم نے ہم کو ہماری نوشدارو نہیں دی۔ میں دوڑ کر اچاری نکال لایا۔ ان کے ہاتھ میں دی۔ انھوں نے اسے کھول کر سونگھا، اور دھیرے سے پھر وہی بات کہی، زہر ہے، زہر! مگر غصہ بالکل نہیں کیا۔ پھر اچاری مجھے واپس کر دی اور بولے، یوسف، اب کیا دے رہے ہو۔ بس، پھر چپ سادھ لی۔ حالت بگڑی ہوئی تھی۔ اسی رات... صبح میں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوتا تھا سو رہے ہیں..." یوسف کی آواز گلے میں پھنس گئی۔

"بڑا افسوس ہوا،" لال چند نے کہا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے، پھر یوسف بولا:

"تو کشن چاچا..."

"انھیں واپس لیے جا رہا ہوں،" لال چند نے بتایا، "آج سویرے سے کپڑے وپڑے پہننے میں لگے ہوے تھے۔ رات ہی سے نکال رکھے تھے۔ بڑے خوش تھے کہ استاد کے پاس جا رہا ہوں۔ اب... دیکھیے پتا چلنے پر کیا کرتے ہیں۔ اچھا... مجھے کچھ دیر بیٹھنا چاہیے تھا لیکن..."

Scanned with CamScanner

"نہیں نہیں، ٹھیک ہے۔ آپ انھیں لے جائیے،" یوسف نے کہا، تہمد سے ہاتھ پونچھا اور لال چند سے مصافحہ کیا۔

"کبھی کوئی کام ہو،" لال چند نے کہا، "ہم سے یا بابا سے..."

"ضرور،" یوسف نے کہا۔

ڈیوڑھی کے اندر کھڑے کھڑے اس نے لال چند کو احاطے کے دوسرے سرے کی طرف جاتے دیکھا۔

تخت پر بیٹھا ہوا بوڑھا عطار قریب آتے ہوئے لال چند کے جسم کی اوٹ میں تھا، البتہ اس کے شفاف سفید کُرتے کی ایک باریک چنی ہوئی آستین اور کلف دی ہوئی دوپلّی ٹوپی کا ایک پلّہ دکھائی دے رہا تھا۔ لال چند نے اس سے کچھ کہا، پھر اسے سہارا دے کر اٹھانے کے لیے جھکا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہوا۔ پھر اس کے پیچھے سے گیلی زمین پر جھاڑو پھرنے کی آواز آنے لگی۔

**

Scanned with CamScanner

کراچی کی کہانی (۱)

ناؤں مل ہوت چند　　جان برنٹن　　کیول رام رتن مل ملکانی　　پیر علی محمد راشدی
نگیندر ناتھ گپتا　　لوک رام ڈوڈیجا　　سہراب کٹرک　　فیروز احمد
گوپال داس کھوسلا　　موہن کلپنا　　شیخ ایاز　　سوبھو گیانچندانی　　کیول موٹوانی
حاتم علوی　　حسن حبیب　　اے کے بروہی　　انوار شیخ
میر امداد علی　　عبدالحمید شیخ　　حسن منظر　　اسد محمد خاں
سگرڈ کابلے　　انیتا غلام علی　　عارف حسن

۴۱۵ صفحات، کراچی کے مختلف ادوار کے ۱۲ نقشے
مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

کراچی کی کہانی (۲)

فہمیدہ ریاض　　اختر حمید خاں　　آصف فرخی
محمد حنیف　　زینت حسام　　بجمن انتھونی　　شریف سوز
لیاقت منور　　بیکسٹر بھٹی　　نسرین اسٹیفن　　آصف شہباز
محبوب جان　　تسنیم صدیقی　　کینتھ فرنانڈیز
یان فانڈر لنڈن　　اکبر زیدی　　مارک ٹلی　　عارف حسن

۴۰۸ صفحات، کراچی کے بارے میں اہم اعداد و شمار، کتابیات
مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

Scanned with CamScanner

افضال احمد سید

رابرٹ کلائیو

"میری نیک نامی رہنے دو،
میری ساری دولت چھین لو"

اس کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا

اس نے درد کم کرنے کے لیے افیون کا استعمال ختم کر دیا تھا
اومی چند کا بھوت اب اس کے سامنے پریڈ نہیں کرتا تھا
اسے معلوم تھا
سچ اور خوش نصیبی پر اس کی اجارہ داری ختم ہو چکی ہے

اب کسی بارش میں
دشمن کا گولا بارود نہیں بھیگ سکے گا
کوئی حکمراں

Scanned with CamScanner

اس کے قدموں میں کھڑے ہو کر
اسے صلح کی دستاویز نہیں پیش کرے گا

پھر بھی وہ وہی تھا
جس نے تاریخ کی ایک اہم جنگ
صرف ۱۴ سپاہیوں کے نقصان پر جیتی تھی

وہ ایک مشکل دنیا کا باشندہ تھا
ہم اس کی خود کشی پر افسوس کر سکتے ہیں

جواہرات کی نمائش میں شاعر

جواہرات کی نمائش کھلے آسمان کے نیچے نہیں ہوتی
شہر کی سب سے خوب صورت لڑکی وہاں نہیں آئے گی
(وہ پھولوں کی نمائش میں گئی ہے)

لوگ ان قیمتی پتھروں اور نمائش کرنے والی لڑکیوں کو دیکھنے آئے ہیں
جنھیں شاہ زادی قحط لگا ہے

ایک بڑے زمرد کو تین کم سن لڑکیاں
(جنھیں شہر کے راستوں کا پتا نہیں)
ماہرانہ انداز سے دیکھ رہی ہیں

Scanned with CamScanner

جو اور یینٹل روبی مجھے پسند آیا ہے
(تصور میں مَیں اسے
بغیر آستینوں کے سیاہ لباس والی لڑکی کو پیش کرنے والا ہوں)
اس سے متصل ایک چھوٹی سی
"فروخت ہو چکا ہے" کی تختی پڑی ہے

"پانچ قیراط کے پتھر کو اٹھارہ پہلوؤں میں تراشنا
اوپن ہارٹ سرجری سے زیادہ نازک ہے"
ایک شخص غیر ضروری طور پر مجھے بتاتا ہوا گزر جاتا ہے

سب سے ادنیٰ موتی کے عوض
میں حساب لگاتا ہوں
آٹھ سو بتیس اعشاریہ تین تین روٹیاں مل سکتی ہیں

نمائش کے وسط میں
ایک فروش کار لڑکی کی مسکراہٹ مجھے روک لیتی ہے

"ایک ڈائمنڈ ہمیشہ کے لیے ہے"
اس نے دُہرایا
جیسے میری شاعری مٹ جانے والی چیز تھی

Scanned with CamScanner

ایک آئس کریم کو متعارف کرانے کی مہم

رینجرز کی موبائلوں
اور بکتر بند گاڑیوں کے آنے کے بعد
ٹینکوں کے آنے سے پہلے
وہ کھلونوں کی دکانوں سے نکل کر
ہماری سڑکوں پر آگئے

اپنے پہیوں والے سفید ڈبوں کے ساتھ
جن کے اوپر خوب صورت چھتریاں لگی تھیں

وہ اسٹرابری اور ونیلا کی زبان میں بات کرتے تھے
ان کے پاس لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے
ایک دلکش دھُن تھی

ان کی
ایک آئس کریم کو متعارف کرانے کی مہم
ہمارے شہر کے لیے آخری خوش گوار حیرت تھی

Scanned with CamScanner

وقت ان کا دشمن ہے

وہ کسی گیلیلیو کا انتظار نہیں کر رہے ہیں
ایک بڑی گھڑی تیار کرنے کے لیے
جسے شہر کی ایک یادگاری دیوار میں نصب کیا جا سکے

اس خلا میں
ہماری تاریخ کی عکاسی کے علاوہ
خواتین کے عالمی دن پر
جھولا ڈالا جا سکتا ہے

چینی طائفہ
بانس سے اُچھل کر اس میں سے گزر سکتا ہے

اس میں
ایک لاش کو مختصر کر کے لٹکایا جا سکتا ہے

اسے موئن جو دڑو کی اینٹوں سے
چُنا جا سکتا ہے

Scanned with CamScanner

اینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی

اینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی
اس اخبار میں
جس کے ۱۶ فیصد پڑھنے والے
ہماری پَر کیپیٹا انکم سے ۲۰ گنا زیادہ
جوتوں اور لباس پر صرف کرتے ہیں

اینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی
ٹوٹے پھوٹے اینکڈوٹس کے بجائے
سوئٹزرلینڈ کے بینکوں کے اکاؤنٹ نمبر
جہاں ہم سے لُوٹی ہوئی دولت جمع ہے

اینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی
کہ ٹیسی ٹس نے لکھا
نیرو کو چار گھوڑوں کے رتھ میں چڑھنے کی پرانی خواہش تھی
وہ چار گھوڑوں کے رتھ کو
سیاہ مرسیڈیز میں تبدیل کیوں نہیں کرتی

اینہ جیلانی سنسنی پھیلانے کے لیے کیوں نہیں لکھتی
ایک مشہور ایرلائن میں
مسافروں کو کتّے کا گوشت کھلایا جاتا ہے

اینہ جیلانی

پامال موضوعات
ماورائے عدالت قتل یا پانی کے قحط کو کیوں نہیں چھوتی

ایسا نہیں ہے کہ اینہ جیلانی
نوکی دے پوم یا پونسٹا پکانے کی ترکیبیں لکھا کرتی ہے

اینہ جیلانی جانتی ہے
کلفٹن کا پُل بہت مضبوط ہے
اور اُس کا یہ سال ایک حادثے سے شروع ہوا ہے

اینہ جیلانی جانتی ہے
ڈاکوؤں سے مقابلے کے دوران
جیپ سے کچلا جانے والا دنداں ساز
ابھی تک کوما میں ہے

لینن فہمیدہ ریاض کے حضور میں

لینن فہمیدہ ریاض کے پاس
اس طرح آیا
جیسے مقتول بادشاہ کی روح
ہیملٹ کے سامنے نمودار ہوئی

Scanned with CamScanner

وہ دوڑتی ہوئی اس کے لیے
راسپوتین ووڈکا کی آدھی بچی ہوئی بوتل اٹھالائی
جو اس کے شوہر نے چھپا رکھی تھی

کوئی بات شروع کرنے سے پہلے
اس نے تیزی سے وہ سب کچھ یاد کرنا چاہا
جو اس نے لینن کے متعلق پڑھا یا سُنا تھا

اسے صرف اتنا یاد آیا
اُس کی طرح لینن نے بھی بہت سے دن
جلاوطنی میں بسر کیے تھے

اسے بہت افسوس ہوا
اس نے لینن کی کسی کتاب کا ترجمہ کیوں نہیں کیا
یا، اس سے بڑھ کر،
لینن پر کوئی کتاب کیوں نہیں لکھی

کیا وہ اس سے روسی زبان میں گفتگو کرے گا؟
یہ سوچ کر وہ لرز گئی
اس نے روسی نہیں سیکھی تھی

سقوطِ ڈھاکا کے بعد
ایوانِ دوستی میں
اس نے "دانائی کا آفتاب: لینن" نامی ایک کتاب پر کچھ کہا تھا

Scanned with CamScanner

کہاں ہو گی اس وقت وہ کتاب؟
اس کی الماری میں تو بالکل بھی نہیں

برآمدے سے گزرتے ہوئے
اس کے بچوں نے اجنبی کو محض حیرت سے دیکھا

یہ بالکل ممکن تھا
اس نے سوچا
لینن کی تصویر اور مجسمے ملک میں ہر جگہ موجود ہوتے
اگر انقلاب آجاتا
اور ہمارے دارالحکومت کا نام لینن آباد ہوتا

وہ اس کی طرف
عدم دل چسپی سے دیکھ رہا تھا
اس نے سوچا
شاید وہ اس سے اتنا بھی متاثر نہیں ہوا
جتنا استالن
اشرف پہلوی سے ہوا تھا

(مگر وہ شاہ زادی نہیں،
شاعرہ تھی)

وہ اس سے روس کے ٹوٹنے کے بارے میں
(اگر اُس کی دل آزاری نہ ہو)

Scanned with CamScanner

پوچھنا چاہتی تھی
اور ان سارے مظالم کے بارے میں بھی
جو انقلاب کے نام پر کیے گئے
اور جن پر کچھ عرصہ پہلے اسے بالکل یقین نہیں تھا

اسے اچانک خیال آیا
اس کے پاگل دوست
کافی شاپ کے ایک کونے میں اس کا انتظار کر رہے ہوں گے
اور آج ذی شان تازہ نظمیں سنائے گا

وہ اٹھ کھڑی ہوئی
اور اس نے لینن کو خدا حافظ کہا
جس طرح مقتول بادشاہ کی روح نے
ہیملٹ کو الوداع کہا تھا

**

Scanned with CamScanner

عذرا عباس

سویرا اپنی مرضی سے کب جیتی ہے

سویرا اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوئی تھی
وہ ایسے ہی پیدا ہوئی تھی
جیسے خودرو درختوں میں سے کوئی ایک ہو
اچانک
اس کی ماں نے اسے ایسے ہی پالا
سویرا اپنے نام سے خود کو جانتی تھی
کوئی پکارتا تو پلٹ کر دیکھ لیتی
اور بس
کھانا، پانی، کپڑے جب دیے جاتے
تو کھا لیتی، پی لیتی، پہن لیتی
اکثر چلتے ہوئے سوچتی
چلوں یا نہ چلوں؟
کوئی کہہ سکتا ہے: کہاں چلی؟

Scanned with CamScanner

کیوں اٹھی؟
بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں سوچتی تھی
اپنے گھر کے سازوسامان کی طرح
ادھر یا اُدھر رکھ دی جاتی
اچانک
ایک دن اس کی ماں اسے دیکھ کر چیخ اٹھی
اُس کی کُرتی سے چھوٹے چھوٹے
اُبھرے ہوئے سینے کو دیکھ کر
ادھر آ!
سویرا ڈر گئی
ادھر آ! یہ کب ہوا؟
یہ کیا؟
اس کی ماں نے اسے آگے سے پھٹک پھٹک کر دیکھا
مجھے کیا پتا!
ارے کنجری، تو نے مجھے بتایا نہیں
سویرا خود حیران تھی
یہ کیا ہو رہا ہے؟
بس وہ سمجھی تھی
ہر چیز اس کی مرضی کے بغیر ہی تو چل رہی ہے
ایک دن برتن مانجھتی ہوئی سویرا کو
اس کی ماں نے گھسیٹا
تُو اب یہاں نہیں رہے گی
سویرا ایسے گھسیٹی گئی
جیسے وہ صحن کی بکری ہو

وہ گھسٹتی ہوئی ایک دوسرے گھر میں چلی گئی
اس کے اختیار میں کچھ بھی نہ تھا
وہ کب صبح کو، شام کو، رات کو
اور دن کو گزرتے ہوئے روک سکتی تھی
سویرا دوسرے گھر میں
حیران ہو کر سسکتی رہی
دوسرے گھر کا مالک اُسے نوچتا کھسوٹتا رہا
وہ دکھ اٹھاتی رہی
بہت دن ایسا ہی ہوتا رہا
ایک دن سویرا کو یہ سب اچھا لگا
وہ آدمی بھی
وہ بھی جو اس کے بھیتر ہو رہا تھا
اچانک
سرسراتی، سنسناتی،
اس کی رانوں، پستانوں میں
ریشمی ڈوریاں کھُل گئیں
مگر کس سے کہے
شام کو اس کی آنکھیں
اس کے بھیتر کی سرسراہٹ سے مدہوش تھیں
جب وہ آیا
وہ جلدی سے اٹھی
آگے بڑھی
اس سے پہلے کہ سویرا کچھ کہتی
سویرا کے بھیتر کو مار ڈالا گیا

Scanned with CamScanner

رنڈی، تیرا بھی دل چاہتا ہے!
اب جب بھی اس کے بھیتر
ریشمی ڈوریاں کھلنے لگتیں
وہ آٹا گوندھنے لگتی
یا صحن میں اُڑتی ہوئی دھوپ پر پانی ڈال کر
خوب جھاڑو لگاتی
سویرا نے جانے انجانے کئی بچے جنے
وہ سب کچھ ایسے کر رہی تھی
جیسے کولھو کے بیل کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو
بچے بڑے ہو گئے
اپنے اپنے گھر کے
وہ جب چاہتے
اپنی مرضی سے اس کی ڈولی اٹھا کر
کسی دوسرے کی چوکھٹ پر رکھ آتے
سویرا اپنی مرضی سے کب جیے گی؟
سویرا یہ بھی کب سوچے گی

مجھے معلوم ہے

اگر میں نے فوراً اس نظم کا ساتھ نہیں دیا
تو وہ نکل جائے گی
میری پہنچ سے بہت دور

Scanned with CamScanner

کہیں میرے کمرے کے سامنے والے کمرے میں
جہاں ایک شخص گردن نیہوڑائے
اس کے انتظار میں بیٹھا ہے
یا پھر کسی اَور گھر میں
جہاں کوئی اَور شاعر
اس کے لیے اپنی نیندیں خراب کر رہا ہے
یا نہیں تو اَور کہیں، کسی بھی گھر میں
جہاں کوئی عورت اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی
یا ان بچوں کے پاس جو کسی شادی ہال کے سامنے
ایک لائن میں بیٹھے
بچے بچائے کھانے کا انتظار کر رہے ہوں گے
وہ ان کی نگاہوں میں،
جو لوگوں کے پیروں کو آتا جاتا دیکھ رہی ہیں،
ان کی پُتلیوں میں اتر جائے گی
یا چاند کی دھیمی روشنی میں
بہت رات گئے، اوس میں بھیگتے ہوئے
اس کوڑا چننے والے کے روشن، چمک دار چہرے کے گرد
ہالا بنا لے گی
جس نے اس کے پاس سے
ایک تیز رفتار گاڑی میں گزرنے والی عورت کو
حیرت میں ڈال دیا تھا
وہ کہیں بھی جا سکتی ہے
مجھے اس نظم کا ساتھ دینا ہو گا
ابھی ابھی وہ میری تکیہ کے پاس

میرے آنسوؤں کے ارد گرد منڈلا رہی تھی
اور پوچھ رہی تھی: کیا تم میرا ساتھ دو گی؟
کہ فون کی گھنٹی بجتی ہے
کسی دور دراز علاقے سے ایک آواز آتی ہے
میں نے اس آواز کا انتظار کبھی نہیں کیا تھا
کبھی بھی میں نے اس امکان کو یقین میں نہیں بدلا تھا
کہ یہ آواز کسی دور دراز علاقے سے
میرے لیے آسکتی ہے
میں فون پر آواز سنتے ہوئے حیران ہوں
تم کیسی ہو؟
کیا کر رہی ہو؟ کیا لکھ رہی ہو؟
میں سوالات کے درمیان سوچتی ہوں
کیا یہ ممکن ہے
کہ دو کام ایک ساتھ کیے جائیں
یہ یقین کہ یہ آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے
اور پھر اس کا جواب
پھر وہ آواز مجھے جھنجھوڑ دیتی ہے
ایسے ہی جیسے اُس آنگن میں
جہاں بہت پہلے، بہت دور سے
کسی لاؤڈ اسپیکر سے نکلتے ہوئے
اُداس تانوں سے لبریز بول
ہوا کے ساتھ تڑپتے ہوئے میرے جسم کو چھوتے ہیں
میں بولوں کو نہیں سمجھتی
بس تانوں کی اداسی مجھے میرے پلنگ پر اٹھا دیتی ہے

وہ ہوا پھر واپس چلی جاتی ہے
کبھی نہ آنے کے لیے
آواز مجھ سے جواب طلب کر رہی ہے
سن رہی ہو... کیا لکھ رہی ہو؟
میں آواز یقین کے ساتھ سنتی ہوں
لیکن، اتنی دور سے اتنی صاف آواز
میں نظم لکھ رہی ہوں، اور عجلت میں ہوں
ابھی اس وقت مجھے
نظم کا ساتھ دینا بہت ضروری ہے
ورنہ وہ اس لاؤڈ اسپیکر کی آواز کی طرح
بہت دور چلی جائے گی
کسی ڈھلان پر، کسی پہاڑ کی کھوہ میں
یا پھر اس کے پاس
جس کے پاس وہ جانا نہیں چاہتی
آواز منقطع ہو جاتی ہے
اور نظم بالکل صاف
اس آواز کی طرح
لفظوں کی اداس تانوں میں
مجھے دکھائی دے رہی ہے
میں نظم کا ساتھ دے رہی ہوں

**

Scanned with CamScanner

استان سیسر (Stan Sesser)

استان سیسر ایک امریکی صحافی ہیں اور رسالہ "نیویارکر" میں جنوب مشرقی ایشیا کے مختلف ممالک کے بارے میں تفصیل سے لکھتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے "وال اسٹریٹ جرنل" کے لیے رپورٹنگ بھی کی ہے۔ وہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے، کے گریجویٹ اسکول آف جرنلزم میں استاد بھی رہے ہیں۔

برما کے بارے میں استان سیسر کے جس مضمون کا ترجمہ اگلے صفحات میں "برما کی کہانی" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے، وہ "نیویارکر" کے سلسلے A Reporter at Large کے تحت A Rich Country Gone Wrong کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اور بعد میں *The Lands of Charm and Cruelty: Travels in Southeast Asia* نامی کتاب میں بھی شامل کیا گیا۔ یہ کتاب، جس میں برما کے علاوہ سنگاپور، لاؤس، کمبوڈیا اور بورنیو کے متعلق مضامین شامل ہیں، ۱۹۹۳ میں شائع ہوئی۔

سیسر کا یہ مضمون برما پر مسلط آمریت اور اس کے خلاف برمی عوام کی جدوجہد کی کہانی سناتا ہے۔ اس جدوجہد کی قائد آؤن سان سُوچی کو ۱۹۹۲ کا نوبیل امن انعام پیش کیے جانے کے بعد دنیا کی توجہ برما میں ہونے والے واقعات کی طرف زیادہ شدّت سے مرکوز ہوئی، اگرچہ ان واقعات کی تفصیلات سے لوگ، کم سے کم ہمارے ہاں، زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ سیسر کے اس مضمون کے ترجمے کی اشاعت اسی کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

Scanned with CamScanner

اسٹان سیسر

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

برما کی کہانی

برما ایک ایسا ملک ہے جسے فضائی آلودگی کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ وہاں صنعت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس ملک کو ٹریفک کی گنجانی کے مسئلے سے بھی سابقہ نہیں پڑتا، کیوں کہ کاروں کی تعداد بہت کم ہے۔ کوئی شخص شہروں کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کی شکایت نہیں کرتا، کیوں کہ برما میں ــــ جس کا رقبہ امریکی ریاست ٹیکس کے برابر اور آبادی چار کروڑ ہے ــــ شہروں میں روزگار کے ایسے مواقع ناپید ہیں جو لوگوں کو دیہات سے نقل مکانی کرنے پر آمادہ کریں۔ وہاں کسی کو تاریخی آثار کے تحفظ کے سلسلے میں تحریک چلانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ ۱۹۴۸ میں انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد سے بہ مشکل ہی کوئی نئی عمارت بنی ہوگی۔ ملک میں کل دو بڑے شہر ہیں ــــ رنگون اور منڈالے ــــ اور ان میں ایک بھی ایسی عمارت نہیں جسے اسکائی اسکریپر کہا جا سکے؛ پورے ملک میں گنتی کی چند لفٹیں ہیں اور فقط ایک ایسکے لیٹر، جو بند پڑا ہے۔ ۱۹۶۲ کے بعد سے برما پوری دنیا سے کٹا ہوا، اور ایک سفاک اور آسیب خوف کی شکار فوجی آمریت کے زیرِ نگیں ہے؛ اگرچہ اس آمرانہ حکومت نے دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم رکھے ہیں اور بیرونی امداد لینے سے کبھی انکار نہیں کیا،

Scanned with CamScanner

تاہم وہ ہر روسی اور چینی شے کو بھی اتنی ہی شک بھری نظروں سے دیکھتی ہے جتنی کسی امریکی چیز کو۔ ۱۹۶۰ کے عشرے میں اس حکومت نے غیر ملکیوں کے برما میں قیام کی میعاد ایک دن تک محدود کر دی تھی تاکہ بیرونی خیالات کی آلودگی سے بچا جا سکے۔ اس میعاد میں رفتہ رفتہ، زرِ مبادلہ کی ضرورت کی مجبوری سے، اضافہ ہوتا گیا اور یہ بڑھ کر ۱۴ دن ہو گئی۔ لیکن اس نرمی کے ساتھ ساتھ ایک معنی خیز پابندی بھی عائد کر دی گئی: اب تمام غیر ملکی سیاحوں کے لیے سرکاری طور پر مہیا کردہ گائیڈ کو ساتھ رکھنا لازمی ہے، اور اس گائیڈ کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ سیاح کا برمی عوام سے رابطہ کم سے کم ہونے پائے۔

بہت برسوں تک بیرون ملک سے آنے والے سیاح برما پہنچ کر مسحور ہو جاتے رہے ــــ ایک ایسا ملک جس نے تین عشروں سے خود پر جدید دنیا کی کھڑکیاں بالکل بند کر رکھی تھیں، اور گویا نظروں سے مکمل طور پر اوجھل ہو چکا تھا۔ مگر پھر ۱۹۸۸ کے موسم گرما میں عوام کی ایک ایسی غیر معمولی تحریک ابھری جس نے برما کو امریکی روزناموں کے صفحۂ اول پر پہنچا دیا۔ یہ عوامی تحریک بظاہر بالکل بے ساختہ طور پر اُبھری تھی۔ کسی پہچان میں آنے والی قیادت کے بغیر، آزادی کے مطالبے کے سوا کسی پروگرام، کسی پلیٹ فارم کے بغیر، طالب علموں اور بودھ راہبوں نے ہر روز سڑکوں پر نکلنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنے ہم وطن شہریوں کو اس حد تک جھنجھوڑا کہ سرکاری ملازم اور پولیس والے بھی اپنے دفتروں اور چوکیوں سے نکل نکل کر مظاہرین میں شامل ہونے لگے۔ ستمبر کے آتے آتے پوری قوم متحد ہو کر ایک طرف آکھڑی ہوئی، اور حکومت اور فوج اس کے مقابل۔ امریکا ــــ ایک ایسا دور اُفتادہ ملک جہاں کی دولت اور آزادی کا لوگ صرف خواب دیکھ سکتے تھے ــــ ہر اُس شے کی علامت بن گیا جسے لوگ برما میں دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ہر روز لوگوں کا ہجوم دارالحکومت رنگون کے مرکزی علاقے میں واقع امریکی سفارت خانے کے سامنے اکٹھا ہونے لگا۔ لاکھوں کی تعداد میں برمی باشندے ــــ جن میں سے بیشتر انگریزی سے نابلد تھے ــــ "ڈیموکریسی" کا مطالبہ کرنے والے انگریزی بینروں کے نیچے مارچ کرنے لگے۔

لیکن ۱۹ ستمبر کو، ایک ایسے اقدام کے ذریعے جو آب نو ماہ بعد بیجنگ کے تیانن من چوک میں ہونے والے واقعات کا بلوپرنٹ معلوم ہوتا ہے، فوجیوں نے گلیوں میں اور چھتوں پر مورچے سنبھال لیے اور دکھائی دینے والے ہر شخص کو گولی مار کر ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ جب امریکی

سفارت خانے کے باہر فوجیوں نے مظاہرین کے ایک گروہ پر فائرنگ شروع کی تو سفارت خانے کے ملازمین دہشت زدہ ہو کر عمارت کے فرش پر لیٹ گئے۔ رنگون جنرل ہسپتال کی راہ داریوں میں ہلاک اور زخمی ہونے والے لوگ اوپر تلے پڑے تھے۔ حکومت نے اعلان کیا کہ اس تاریخ کے بعد بیرونِ در چار سے زیادہ آدمیوں کے ہر سیاسی اجتماع پر فائرنگ کی جائے گی۔ اس اعلان پر حرف بہ حرف عمل کیا گیا۔ رنگون کی زندگی اور بھی کئی لحاظ سے بدل کر رہ گئی: تمام اسکول بند کر دیے گئے، رات دس بجے سے کرفیو نافذ ہونے لگا، ہزاروں سیاسی گرفتاریاں ہوئیں۔ ان گرفتاریوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ جولائی ۱۹۸۹ میں جیلوں کو بیشتر عام مجرموں سے خالی کرا لیا گیا تاکہ نئے سیاسی قیدیوں کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔

جنوری ۱۹۸۹ میں جب برما کے حکمراں دنیا بھر میں بدنام ہو چکے تھے، بیرونی امداد منقطع کی جا چکی تھی اور ملک کی آبادی واضح طور پر غیر مطمئن تھی، برمی حکومت نے ایک ایسا اقدام کیا جو مغربی منطق کی رو سے ایک معمّا ہے۔ مہینوں سے حکومت کی جانب سے مستقبل میں کرائے جانے والے انتخابات اور سرمایہ کاری کی پالیسیوں میں نرمی کے اعلان کیے جاتے رہے تھے۔ اب — ۱۹۶۲ میں موجودہ ڈکٹیٹر، جنرل نےوِن، کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد پہلی بار — حکومت نے غیر ملکی اخبار نویسوں کو برما آ کر وہاں کے نئے، "کھلے" معاشرے کا جائزہ لینے کی دعوت دی۔ ریاست کے سربراہ جنرل ساماؤنگ (Saw Maung) نے، جسے جنرل نےوِن (Ne Win) نے ستمبر ۱۹۸۸ میں مقرر کیا تھا، اعلان کیا، "ہمارے پاس مہاتما بدھ کی دی ہوئی ہدایت ہے: خود آ کر سچ پر نظر ڈالنے والے کو خوش آمدید!" میں ۱۹۸۵ میں، اور پھر ۱۹۸۶ میں بھی، سیاح کے طور پر برما کا دورہ کر چکا تھا۔ اپنی ویزا کی درخواست پر میں نے پیشے کے خانے میں "استاد" تحریر کیا تھا۔ جنوری میں کیے جانے والے اس اعلان کے کچھ دن بعد میں نے اخبار نویس کے طور پر ویزا کی درخواست دی۔ وزارتِ خارجہ نے میری درخواست مارچ کے وسط میں منظور کر لی اور مجھے بتایا کہ میں ۱۷ اپریل کو برما میں داخل ہو سکتا ہوں۔ (وسط جولائی میں حکومت نے بیرونی اخبار نویسوں کو برما کا دورہ کرنے کی دعوت دینے کی پالیسی ترک کر دی۔)

برما آنے والے غیر ملکیوں کو اُن بلند پہاڑوں تک جانے کی اجازت نہیں جنھوں نے ملک کو گھوڑے کی نعل کی صورت گھیر رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کئی عشروں سے یہ پہاڑی علاقے نسلی

اقلیتوں کے کنٹرول میں ہیں جنھوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر رکھی ہے۔ علاوہ ازیں، غیر ملکی سیاح ملک کے شاندار ساحلوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہوسکتے، کیوں کہ وہاں سیاحوں کے لیے کوئی سہولت موجود نہیں۔ لیکن سیاح کا متعینہ راستوں ـــ یعنی رنگون، منڈالے، جھیل انلے، اور پاگان شہر کے خرابوں ـــ کا سفر بھی ایسے تجربات رکھتا ہے جنھیں ایشیا کے کسی اَور مقام پر پانا دشوار ہے۔ رنگون کو انگریزوں نے نو آبادیاتی دورِ حکومت میں بسایا تھا ـــ اس عمل کی ابتدا ۱۸۵۲ میں ہوئی تھی ـــ اور آج یہ قطعی طور پر اُسی حالت میں موجود ہے جیسا کہ انگریز اسے چھوڑ کر گئے تھے؛ بس عشروں کے نتیجے میں چھا جانے والی کھنگی نے اسے کچھ اَور پُر کشش بنا دیا ہے۔ اس کے باشندوں کی تعداد پچیس لاکھ ہے، لیکن اس شہر میں اتنے وسیع باغ، جھیلیں میدان اور دورویہ درختوں والی، اور ٹریفک سے تقریباً خالی، خیابانیں موجود ہیں کہ وہاں اس شور و غوغا کا نشان تک نہیں جو بہت سے ایشیائی مہانگروں کی پہچان ہے۔ سنگاپور اور بینکاک دوسری جنگِ عظیم سے پہلے غالباً ایسے ہی محسوس ہوتے ہوں گے جیسا رنگون آج محسوس ہوتا ہے۔ رنگون کے شمال میں خاصی دور برما کے وسیع و عریض وسطی میدانی علاقے میں، منڈالے واقع ہے، جس کے باشندے تعداد میں پانچ لاکھ ہیں۔ منڈالے، جو برما کے کلچر اور مذہب کا مرکز ہے، عمارتوں اور پگوڈوں کا ایک مجموعہ ہے جن کے بالائی سرے اُن اونچی دیواروں کے اوپر سے دکھائی دیتے رہتے ہیں جن کے اندر کبھی راجا منڈوں کا راج محل واقع تھا، اس شہر کی بنیاد اسی راجا نے ۱۸۵۷ میں رکھی تھی۔ مشرق کی جانب، شان ریاست میں واقع جھیلِ انلے کے ارد گرد دہقانوں اور ماہی گیروں کے گاؤں آباد ہیں۔ منڈالے کے مغرب کی سمت دریاے اِراوادی کے کنارے پاگان شہر کے خرابے واقع ہیں جو کرۂ ارض پر موجود شاندار ترین کھنڈر ہیں۔ ہموار میدان پر میلوں کے رقبے پر پھیلا ہوا پاگان دو ہزار سے زائد منقش اور آراستہ پگوڈوں اور مندروں پر مشتمل ہے جن کا تعلق بارھویں صدی عیسوی سے ہے۔

برمن ـــ یعنی وہ نسلی گروہ جو برمی آبادی کے دو تہائی حصے پر مشتمل ہے ـــ غیر معمولی طور پر حسین لوگ ہیں، اکثر دراز قد، چھریرے بدن اور ہلکی کافی کی سی رنگت والے۔ مردوں اور عورتوں کا لباس ایک ہی ہے: لنگی، یعنی ٹخنوں تک پہنچتی ہوئی چادر جسے کمر پر بڑی سی گرہ سے باندھا جاتا ہے۔ میرے پہلے دو سفروں میں انگریزی جاننے والے برمی باشندے غیر ملکیوں سے

بات چیت کرنے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے، اور بیشتر امریکی طرزِزندگی اور زبان سے حیران کن واقفیت کا اظہار کرتے تھے۔ دوسرے ایشیائی ملکوں میں وہاں کے رہنے والوں سے میری گفتگو عموماً خوش مزاجی کی ہلکی پھلکی سطحی باتوں تک محدود رہتی تھی۔ لیکن برما کا کوئی باشندہ ـــ ایک بار چاروں طرف نظر دوڑا کر پولس کے مخبروں کی عدم موجودگی کا اطمینان کرنے کے بعد ـــ جوش وخروش کے ساتھ کسی موضوع کی گہرائی میں اتر جاتا۔ اُن دنوں برما کے شہریوں سے ملنے میں کوئی خاص خطرہ نہیں تھا، اس مقصد کے لیے آپ کا فقط کسی چائے خانے میں داخل ہونا کافی تھا۔ چائے خانے برما کی سماجی زندگی کا مرکز ہیں، اور برمی باشندے چائے خانوں کے اونچے اسٹولوں پر، جو امریکی ٹانگوں سے اپنی نامناسبت بہت جلد واضح کردیتے ہیں، گھنٹوں بیٹھے رہ سکتے ہیں۔ وہاں کڑک سیاہ چائے، ڈبے کا میٹھا گاڑھا دودھ ملا کر، پیش کی جاتی ہے۔ اسے پیالی سے طشتری میں تھوڑا تھوڑا انڈیل کر منھ تک لے جا کر پیا جاتا ہے، اگر آپ پیالی سے براہِ راست پینے کی کوشش کریں تو اردگرد کی میزوں پر بیٹھے لوگ آپ کو گھورنے لگیں گے۔ اس گاڑھی چائے کے بعد ہلکی چینی چائے دی جاتی ہے جسے چھوٹے چھوٹے فنجانوں میں پیا جاتا ہے۔ ماضی میں کسی چائے خانے میں بیٹھا ہوا غیرملکی خود کو بہت جلد گفتگو میں مشغول پاتا تھا۔ ۱۹۸۵ میں ایک دن، جب میں منڈالے کے ایک چائے خانے میں بیٹھا طوفانِ بادوباراں کے تھمنے کا انتظار کر رہا تھا، ایک نوجوان برمی اندر داخل ہوا، اپنے ہیٹ پر سے پانی کے قطرے جھاڑے اور سیدھا میرے پاس آکر بولا: "It's raining cats and dogs." اس کے بعد اس نے ایک ایسی گفتگو کا آغاز کیا جس کا ہر جملہ امریکی محاوروں سے مزین تھا۔ آخرکار میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ یہ تمام محاورے کیوں استعمال کر رہا ہے۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بغیر اس نے جواب دیا، "To keep up with the Jonses!"

اُسی چائے خانے میں، برما کے میرے پہلے سفر کے دوران، میری یومنٹ تھیم (U Myint Thame) سے ملاقات ہوئی تھی، جو بعد میں قریبی دوستی میں بدل گئی۔ (برمی ناموں سے پہلے U کا سابقہ احترام کی علامت ہے، لیکن یہ اپنے انگریزی متبادل "مسٹر" سے کہیں زیادہ گہری معنویت رکھتا ہے۔ کوئی برمی اپنے بدترین دشمن کا نام بھی اس سابقے کے بغیر لینے کا تصور نہیں کر سکتا۔) یومنٹ تھیم نے میرے قریب آکر دریافت کیا کہ آیا میں امریکی ہوں، اور پھر

Scanned with CamScanner

ایک تسکین کے احساس کے واضح تاثر کے ساتھ بولا، "مجھے ریمبو مینیا (Rambo mania) کے بارے میں سب کچھ بتائیے۔" معلوم ہوا کہ وہ رنگون کا رہنے والا ہے اور رسالوں کے لیے فری لانس مضامین لکھا کرتا ہے۔ وہ امریکی رسالوں اور کتابوں کا بے حد مشتاق پڑھنے والا تھا اور اس کام کے لیے زیادہ تر یو ایس آئی ایس کی لائبریری جایا کرتا تھا۔ برمی رسالوں میں لکھنے کا معاوضہ اسے فی مضمون نو ڈالر ملتا تھا۔ اس نے امریکی راک اسٹارز کے بارے میں لکھنے کے عوض پندرہ ڈالر کی پیشکش مسترد کر دی تھی کیوں کہ اس کے نزدیک یہ عمل "بک جانے" کے مترادف تھا۔ وہ اپنی ڈھائی سو ڈالر سالانہ کی آمدنی سے اپنی بیوی اور بچے کا پیٹ پالتا تھا، اور وہ سب لکڑی کے ایک چھوٹے سے مکان کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ جو حصہ ان کے تصرف میں تھا وہ کتابوں کے ڈبوں سے بھرا ہوا تھا اور افقی شہتیر پر چپکایا ہوا ایک بڑا سا کاغذ اسے مکان کے بقیہ حصے سے (جس میں دوسرے کرایہ دار رہتے تھے) جدا کرتا تھا۔ یومنٹ تھیم کو امریکی سیاست اور کلچر سے وسیع واقفیت تھی، لیکن اگلے سال جب میں اور وہ ایک ساتھ منڈالے اور وہاں سے سابقہ برطانوی ہل اسٹیشن میمیو گئے تو مجھے اس کو فلش ٹائلٹ استعمال کرنے کا طریقہ سمجھانا پڑا، اور جب اس نے گرم پانی کے فوارے سے بھاپ نکلتے دیکھی تو اسے گمان ہوا کہ ہوٹل میں آگ لگ گئی ہے۔

یومنٹ تھیم نے اپنے طرزِ عمل سے مجھ پر برمی کلچر کی ایک خصوصیت واضح کی جس کے باعث مغربی باشندے برما سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد اس کے لیے گہری کشش محسوس کرنے لگتے ہیں: کسی برمی باشندے کے ساتھ دوستی کی ایک خاص سطح تک پہنچنے پر آپ اس کے خاندان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایک روز میں نے یومنٹ تھیم سے بوڑھے والدین کو نرسنگ ہوم میں ڈلوا دینے کے امریکی رواج کا ذکر کیا ــــ جو بیش تر ایشیائی باشندوں کے تخیل سے باہر کی بات ہے۔ وہ غم زدہ اور بے چین دکھائی دینے لگا اور بولا، "جب تم بوڑھے ہو جاؤ تو برما چلے آنا۔ میرے گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ ہم تمھارا خیال رکھیں گے۔" اس بار امریکا سے روانہ ہوتے وقت میں نے یومنٹ تھیم کو پیغام بھجوایا کہ میں برما آرہا ہوں اور اگر اسے اس عمل میں کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ ہو تو کیا وہ میرے ترجمان کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ آمادہ ہو تو جواب بھیجنے کے بجائے مجھے رنگون ایرپورٹ پر ملے۔

•

***

برما اس مخصوص موقعے پر غیر ملکی صحافیوں کو کیوں دعوت دے رہا تھا؟ اس سوال کے جواب کا ایک اشارہ میرے پاسپورٹ میں موجود تھا۔ بینکاک میں لگائی جانے والی ویزا کی مہر پر ملک کا نام "سوشلسٹ ری پبلک آف دی یونین آف برما" درج تھا، لیکن "سوشلسٹ ری پبلک" کے الفاظ کو نیلی پنسل سے کاٹ دیا گیا تھا۔ ۱۹۸۶ میں ملک کا نام سرکاری طور پر بدل کر "یونین آف برما" کر دیا گیا۔ (اور جون ۱۹۸۹ میں، شاید اس خیال سے کہ نیا نام سیاسی جبر اور معاشی تباہی کی ان یادوں کو مٹانے میں مدد کر سکے جو برما کے نام سے وابستہ ہو گئی تھیں، ملک کا نام ایک بار پھر بدل کر، اس بار "میانمار" رکھ دیا گیا (برمی زبان میں ملک کو ہمیشہ سے اسی نام سے پکارا جاتا تھا)۔ برمی حکومت دنیا بھر میں جمہوریت کے کاز کو پیش قدمی کرتا دیکھ رہی تھی۔ برما کی شمالی سرحد پر واقع چین نے خود کو خستہ حال معیشت کے حامل، دنیا بھر سے کٹے ہوئے ملک سے، عالمی برادری کے ایک امکانات سے پُر رکن میں منقلب کر لیا تھا؛ اب وہاں کے طلبا بھی جمہوریت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ تیان من چوک میں ہونے والا سانحہ ابھی افق پر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آگے قدم بڑھاتا ہوا چین، اور خستہ حال ہوتا ہوا برما: یہ تضاد برمی حکمرانوں کے سکون کو غارت کرنے کا امکان رکھتا تھا۔ برما نے عوامی طاقت کے ایک مظاہرے کو بندوق کے زور پر دبا لیا تھا، لیکن اس کے بعد؟ حکومت کے پاس ظاہر ہے کہ کوئی حل نہیں تھا، لیکن غیر ملکی صحافیوں کو ملک میں آنے دینا ایک علامتی عمل تھا ـــــ مغرب کی جانب اپنی کھڑکیاں کھولنے کا ایک مدھم اشارہ۔

جو قوتیں بہت سے دوسرے ملکوں میں نمایاں تبدیلیوں کا سبب بنی تھیں، نے ون نے کسی نہ کسی طرح ان تمام کا کامیابی سے مقابلہ کر لیا تھا: معیشت کی بابت عوامی بےاطمینانی، بغاوت پر آمادہ طالب علم برادری، آمرانہ حکومت کے ہتھکنڈوں پر بڑھتا ہوا طیش۔ اُس نے ایک ملک گیر تحریک کو کچل دیا تھا، اور میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کامیابی اسے کیوں کر حاصل ہوئی۔

یومنٹ تھیم رنگون ایرپورٹ پر مجھ سے ملنے کے لیے اپنی بیوی اور گیارہ سالہ بیٹے کے ساتھ موجود تھا۔ ہم بغل گیر ہو کر ملے اور پھر ایک جاپانی پک اپ کے پچھلے حصے میں ایک ڈھیر کی صورت سوار ہو کر اس ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے جہاں مجھے ٹھہرنا تھا۔ (ان جاپانی باربردار گاڑیوں

کے پچھلے حصے میں بنچیں اور اوپر کینوس کی چھت لگا کر انھیں ٹیکسیوں، بسوں یا نجی گاڑیوں کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان گاڑیوں نے زنگ آلود دی سوتو گاڑیوں کی جگہ لے لی ہے اور اب رنگون میں ان تمام لوگوں کے لیے جو شہر کی بسوں کے سوا کسی دوسری سواری میں سفر کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں، بنیادی سواری کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔) جب ہم ایرپورٹ سے دور ہونے لگے تو یومنٹ تھیم بولا، "میں جانتا ہوں تم نے کہا تھا کہ اگر خطرہ ہو تو تم مجھے اپنا ترجمان بنانا پسند نہیں کرو گے۔ خیر، کچھ نہ کچھ خطرہ تو ضرور ہے۔ لیکن مجھے یہ کام کرنا ہی تھا۔ تم میرے خاندان کے ایک فرد کی طرح ہو۔ میں تمھارا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

پچھلے دونوں سفروں میں رنگون کو دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے انگریزوں کے جانے کے بعد سے کسی شخص نے اس شہر پر رنگ کا برش تک استعمال نہیں کیا ہے، لیکن اس بار شہر کی ہر عمارت کی بیرونی دیوار پر تازہ سفیدی کی ہوئی تھی، اور پورا شہر گویا جگمگا رہا تھا۔ کئی برمیوں نے مجھے بتایا کہ حکومت نے "زیبائش کی مہم" کے سلسلے میں تمام عمارتوں اور مکانوں کے مالکوں میں سفیدی کے ڈبے تقسیم کیے تھے؛ اس عمل کا محرک حکومت کی یہ خواہش تھی کہ ان سیاسی نعروں کو دیواروں پر سے مٹایا جا سکے جو جمہوریت کے حق میں کیے جانے والے مظاہروں کے دوران لکھے گئے تھے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ لوگوں نے حکومت کی طرف سے ملنے والی سفیدی میں آور پانی گھول کر اسے پتلا کر لیا تا کہ زائد سفیدی کو چور بازار میں بیچ سکیں، اور غالباً گرمیوں میں آنے والے مون سون کے بعد تمام سفیدی دیواروں سے اتر کر نالیوں میں بہہ نکلے گی۔

رنگون میں پیدل چلنے والوں کے لیے سڑک پار کرنے کے نئے پُل بھی بن گئے تھے۔ جمہوریت کی تحریک کو کچل دینے کے بعد حکومت نے شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر ایسے پل تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایک عام مزدور دن بھر میں بیس کیات، یا چالیس امریکی سینٹ، کماتا ہے، جبکہ پٹرول کی قیمت ستر کیات فی گیلن ہے۔ (مقامی سکے کے مساوی امریکی ڈالر بیان کرنے کے لیے چور بازار کے نرخ کو بنیاد بنایا گیا ہے، جو ایک ڈالر مساوی پچاس کیات تھا، جبکہ سرکاری نرخ ایک ڈالر مساوی ساڑھے چھ کیات تھا۔) چوں کہ کوئی عام آدمی کار تو کیا، پٹرول تک خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا، لہٰذا ٹریفک تقریباً مفقود ہے؛ جب میں نے پہلی بار صبح کے "رش" کے وقت میں سڑک پار کرنے والے ایک پل پر نظر ڈالی تو اس کے نیچے

Scanned with CamScanner

سڑک پر ایک کتا سو رہا تھا۔ یہ پل کیوں بنائے گئے؟ اس سوال کا یہی جواب قرینِ قیاس لگتا ہے کہ فوج کو مکانوں کی چھتوں پر سے مظاہرین پر فائرنگ کرنے میں دشواری پیش آئی تھی۔ اس پل پر کھڑے ہو کر جلوس پر زیادہ موثر فائرنگ کی جا سکتی تھی۔

اس بات کی یاددہانی بہت سے اشاروں سے ہوتی رہتی ہے کہ ملک کا نظم و نسق فوج کے ہاتھ میں ہے۔ فوجیوں سے بھرے ٹرک رنگون کی سڑکوں سے گزرتے رہتے ہیں۔ شویداگون پگوڈا میں — جو برمی بودھ مت کی متبرک علامت ہے اور جس کا سنہری گنبد اور کلس رنگون شہر میں سب سے بلند دکھائی دیتا ہے — ہر طرف مسلّح فوجی دکھائی دیتے ہیں۔ بعض بڑے ٹریفک کے چوراہوں پر حال ہی میں کنکریٹ کے مورچے بنائے گئے ہیں جن کی دیواروں میں بندوقوں کے لیے موکھے بنے ہوئے ہیں؛ ان مورچوں پر وہی سرخی مائل نارنجی رنگ کیا گیا ہے جو سال بھر پہلے بنائی جانے والی وزارتِ دفاع کے احاطے کی چاردیواری پر کیا گیا تھا۔ ہر رات دس بجے، جب کرفیو کا وقت شروع ہوتا ہے، گلیاں فوج کے لیے خالی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۸ میں ہونے والے مظاہرین کے قتل کے بعد کے چند مہینوں میں کرفیو نافذ ہونے کے بعد سڑک پر نکلنے والا کوئی شخص کسی سپاہی کی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا؛ اب ایسے شخص کا تفتیش کے لیے لے جایا جانا زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ (کرفیو ۱۹۹۲ میں ختم کیا گیا۔) باقاعدہ ٹیکسیاں کرفیو کی خلاف ورزی کا خطرہ مول نہیں لیتیں، لیکن برما میں مناسب قیمت ادا کرنے پر ہر شے خریدی جا سکتی ہے۔ ایک رات میں رات کے کھانے کے لیے ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے باہر نہ نکل سکا اور سڑک پر کھڑا ہر گزرنے والی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کرتا رہا۔ آخرکار ایک گاڑی رک گئی؛ اس کا ڈرائیور مجھے ایک ریستوراں میں لے گیا، اور جب تک میں جلدی جلدی کھانا کھاتا رہا، وہ برابر کی میز پر بیٹھا بے چینی سے گھڑی پر نظر ڈالتا رہا۔ پھر اس نے مجھے واپس میرے ہوٹل پہنچایا۔ اس تمام خدمت کا معاوضہ اس نے ڈیڑھ سو کیات، یا تین ڈالر، طلب کیا جسے برما میں بہت بڑی رقم سمجھا جاتا ہے۔

اب رنگون شہر کی کیفیت بہت بدل گئی تھی۔ چائے خانے طالب علموں سے بھرے ہوئے تھے، کیوں کہ حکومت نے تمام یونیورسٹیاں بند کر دی تھیں اور کسی قسم کا روزگار میسر نہیں تھا۔ لیکن جب میں ایک چائے خانے میں داخل ہوا تو میں نے اُن مسکراہٹوں اور پُرتجسس نظروں کو مفقود پایا جو پچھلے سفروں میں عموماً میرا خیر مقدم کرتی تھیں۔ اِس بار اکثر لوگ مجھ سے آنکھ ملانے

سے کترا رہے تھے۔ میں لوگوں سے رابطہ قائم کرنے میں صرف اس وقت کامیاب ہوتا جب روز صبح سویرے رنگون کے مرکزی حصے سے ایک میل شمال میں واقع شاہی جھیل کے گرد جاگنگ کے لیے جایا کرتا۔ میرے نیکر پر امریکی جھنڈے کا نمونہ بنا ہوا تھا جسے دیکھ کر کئی برمی "امریکا" پکار اٹھتے یا ہاتھ ہلا دیتے؛ ایک روز ایک شخص نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور میرے ہاتھ میں ایک پھول تھما دیا۔

جو برمی باشندے غیر ملکی خبر نگاروں سے بات کرنے کی ہمت رکھتے تھے، انھوں نے رنگون کی زندگی کی خوفناک کہانیاں سنائیں۔ خاص طور پر اُن لوگوں کا احوال دہلا دینے والا تھا جنھیں سڑکوں پر سے اٹھا لیا گیا تھا تاکہ ان سے نسلی اقلیتوں کے خلاف کارروائی میں مصروف فوج کی قلیوں کے طور پر خدمت کی بیگار لی جا سکے۔ طلبا کے مظاہروں کے دوران فوج نے کارینوں (Karens) سے لڑنے میں مشغول بعض دستوں کو رنگون منتقل کیا۔ تقریباً پانچ لاکھ کارین، جو بیشتر مسیحی یا فطرت پرست (ahimist) ہیں، تھائی لینڈ کی سرحد کے قریب واقع اس علاقے میں رہتے ہیں جو برما کی کارین ریاست کے ایک تہائی رقبے اور اس سے ملحق چند قطعات پر مشتمل ہے اور باغیوں کے کنٹرول میں ہے۔ یہ لوگ ۱۹۴۹ سے اپنی آزادی کے لیے لڑتے آرہے ہیں۔ انھوں نے رنگون بھیجے جانے والے فوجی دستوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر کچھ اور علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اکتوبر ۱۹۸۸ میں، رنگون کے مظاہرین سے نمٹنے کے بعد، فوج نے اس علاقے کو باغیوں سے چھڑانے پر توجہ دی۔ کارینوں نے اس علاقے میں بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ فوج نے رنگون کی سڑکوں سے اٹھائے گئے متعدد جبری قلیوں کو سپاہیوں کے آگے آگے چلنے اور بارودی سرنگیں صاف کرنے والے انسانی آلات کے طور پر کام آنے پر مجبور کیا۔

رنگون روانہ ہونے سے پہلے امریکا میں میرے ایک دوست نے مجھے رنگون کے رہنے والے ایک برمی پروفیسر کا پتا دیا تھا جو روانی سے انگریزی بولتا تھا اور جس کے امریکیوں سے رابطے رہ چکے تھے۔ مجھے پتا چلا کہ اس پروفیسر کو بھی سڑک سے قلیوں کو اٹھانے کی ایک مہم کے دوران پکڑ کر کچھ وقت تک قید رکھا گیا تھا۔ "میں شویداگون پگوڈا کے قریب بس کے انتظار میں کھڑا تھا،" اس نے ملنے پر مجھے بتایا، "کہ اچانک ایک فوجی ٹرک آیا، اور سپاہیوں نے بس اسٹاپ پر کھڑے لوگوں کو پکڑنا شروع کر دیا۔ سب لوگ بھاگنے لگے۔ ایک عورت گر پڑی اور کچلی گئی۔ جوں ہی میں اس

Scanned with CamScanner

عورت کو سہارا دینے کے لیے رکا، ایک فوجی نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے تقریباً پچیس دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں ڈال دیا گیا۔ ہمیں ایک پولیس اسٹیشن لے جایا گیا اور وہاں ہر ایک کا نام، پتا اور پیشہ درج کیا گیا۔ تب تک یہ ممکن تھا کہ اگر کسی کے پاس قیمتی گھڑی یا کچھ رقم ہو تو وہ پولیس کو رشوت دے کر چھوٹ سکتا تھا۔ میرے پاس بہت تھوڑی سی رقم تھی، لیکن میں اپنے امریکی دوستوں کے خط ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ میں نے پولیس والوں کو بتایا کہ میں امریکیوں کے ساتھ کام کرتا ہوں، اور امریکی سفارت خانے کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھے آزمانے کے لیے فون نمبر دریافت کیا۔ نمبر میں نے حفظ کر رکھا تھا، اور اسی کی بدولت میری جان بچی۔ ایک پولیس کپتان اٹھ کر گیا، چند ٹیلی فون کیے اور آدھ گھنٹے بعد مجھے چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے مجھے تنبیہ کی کہ کسی سے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہوں۔"

برما اس مقام تک کیوں کر پہنچا جہاں حکومت اس غرض سے سڑک پار کرنے کے پل تعمیر کرے کہ ان پر چڑھ کر مظاہرین پر فائرنگ کی جا سکے گی، اور فوجی بارودی سرنگوں کی بھینٹ چڑھانے کے لیے رنگون کی سڑکوں سے آدمیوں کو پکڑنے لگیں؟ برما کی حکومت اور فوج سے متعلق بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح اس سوال کا جواب بھی اکیاسی سالہ جنرل نےوِن کی ذات کے گرد گھومتا ہے، جو جولائی ۱۹۸۸ میں برما سوشلسٹ پروگرام پارٹی کے چیئرمین کے عہدے سے استعفیٰ دے کر بظاہر ریٹائر ہو گیا تھا، لیکن جس نے تمام فیصلے واضح طور پر اب بھی اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں۔ نےوِن، جو انتہائی کم آمیز آدمی ہے، شخصیت پرستی کی تمام خصوصیات سے مکمل گریز کرتا ہے؛ اس کی تصویر آپ کو کسی سرکاری دفتر میں لگی ہوئی دکھائی نہیں دے گی۔ وہ عورتوں کے رسیا کے طور پر بدنام ہے اور سات شادیاں کر چکا ہے، لیکن اس نے برمی معاشرے پر سخت اخلاقی قیود عائد کر رکھی ہیں اور نائٹ کلبوں اور بوسہ بازی کی تصویروں پر پابندی ہے۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات انتہائی مہربانی اور سخاوت کا سلوک کرنے پر قادر ہے، لیکن اس نے اپنے متعدد قریبی دوستوں کو، جو حکومت کے اہلکار بھی تھے، جیلوں میں ڈلوایا ہے اور اپنی فوج کو نسلی اقلیتوں کے خلاف، اور حال ہی میں طالب علم مظاہرین کے خلاف، ناقابلِ بیان مظالم کا ارتکاب کرنے کی اجازت دی ہے۔ نےوِن غیروں کے آسیبی خوف میں اس شدت کے ساتھ مبتلا ہے کہ اس نے غیر ملکی اثرات کے شائبے تک کو برما سے کھرچ کر صاف کر

دینا چاہا ہے۔ اس کے باوجود وہ اکثر مہینوں ملک سے باہر رہتا ہے ــــ لندن، علاج کرانے کے لیے، سوئٹزرلینڈ کے صحت افزا مقامات کی سرپرستی کرنے کے لیے، اور، اس کے ایک دوست کے بیان کے مطابق، ویانا تحلیل نفسی کرانے کے لیے۔ وہ برما کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر اثرانداز ہوتا ہے۔ جب اس کی بیٹی ساندا وِن برطانیہ کے ایک میڈیکل اسکول میں داخلے کے لیے انگریزی زبان کا امتحان پاس نہ کر سکی تو نے وِن نے برما کے اسکولوں میں نہ صرف انگریزی زبان کی تدریس کو بحال کر دیا بلکہ اسے اہم حیثیت بخش دی۔ جب ۱۹۶۰ کے عشرے میں اسے گولف کھیلنے کا شوق ہوا تو پورا ملک گولف کھیلنے لگا؛ آج برما میں سو سے زیادہ گولف کورس ہیں، اور یہی مغربی سفارت کاروں اور برمی سرکاری اہلکاروں کی ملاقات کی کلیدی جگہیں ہیں۔

نے وِن شمالی رنگون میں واقع اِنیا جھیل کے کنارے، تین مکانوں پر مشتمل ایک احاطے میں، الگ تھلگ زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے مطالعے کا بے حد شوق ہے؛ رنگون یونیورسٹی کے ایک لائبریرین کو نے وِن کے ذاتی کتب خانے کا کیٹلاگ تیار کرنے میں تین ہفتے لگے تھے۔ اس کے گھر کے نزدیک کم سے کم دو ہزار فوجی تعینات رہتے ہیں۔ احاطے کی چاردیواری کے پیچھے فولادی جنگلے اور بارودی سرنگیں ہیں جو جھیل کی سمت سے کسی مداخلت کار کی آمد کے خطرے سے نمٹنے کے لیے ہیں۔ جب میں نے اپنے ڈرائیور سے نے وِن کے احاطے کی طرف چلنے کو کہا تو ہمیں کچھ خاص کامیابی نہ ہوئی؛ خاردار تاروں کے بڑے بڑے کچھوں نے سڑک بند کر رکھی تھی اور سب مشین گنوں سے مسلح فوجیوں نے ہمیں فوراً واپس پلٹ جانے کا اشارہ کیا۔ نے وِن شاذونادر ہی عوام کے روبرو ظاہر ہوتا ہے، لیکن اس کی مشغولیات کی کہانیاں پورے رنگون میں گردش کیا کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض کہانیوں کے اتنے زیادہ گواہ موجود ہیں کہ ان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ دو مغربی سفارت کاروں نے مجھے، الگ الگ، ایک ہی قصہ سنایا کہ کس طرح پندرہ سال پہلے نے وِن نے گولف کورس پر ایک برمی آدمی کا تعاقب کر کے اس پر گولف کے کلب سے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی؛ اس آدمی پر نے وِن کی بیوی کے ساتھ سونے کا الزام تھا۔ (یہ شخص ان دونوں سفارت کاروں کا دوست تھا۔) ۱۹۷۵ میں نے وِن نے اپنے مسلح محافظوں کو ساتھ لے کر انیا لیک ہوٹل میں ہونے والی ایک پارٹی پر چھاپا مارا جہاں لوگ مغربی موسیقی کی دھن پر رقص کر رہے تھے۔ اس نے ایک ڈھول بجانے والے کو پیٹا اور ڈھول کو لات مار کر اُلٹ دیا۔ غالباً موسیقی کی

Scanned with CamScanner

آواز اتنی بلند تھی کہ اسے جھیل کے پار، نے وِن کے گھر میں، سنا جا سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے مغربی موسیقی اور رقص برما میں ممنوع ہیں۔

نے وِن کے نمایاں طور پر دل چسپ غیر ملکی دوروں میں سے ایک اپریل ۱۹۸۷ میں اوکلاہوما سٹی کا پانچ روزہ خفیہ سفر تھا جو آرڈتھ ڈولیز نامی ایک دولت مند امریکی عورت سے ملاقات کرنے کی ترنگ میں کیا گیا تھا؛ اس عورت سے وہ پہلی بار لندن میں دوسری جنگ عظیم کے کچھ عرصے بعد ملا تھا۔ نے وِن نے ورلڈ ایرویز کا ایک ڈی سی ۱۰ طیارہ چارٹر کیا اور پینتالیس دوسرے اعلیٰ حکام کو بھی ساتھ لے لیا جن میں وزیرِ خارجہ، وزیرِ دفاع اور پانچ اونچے فوجی اہلکار، اور ان کے علاوہ اس کا ذاتی معالج اور اس کے خاندان کے کچھ افراد، شامل تھے۔ اس دورے میں، جس کا علم امریکی پریس کو بروقت نہ ہو سکا، نے وِن بیشتر وقت اپنے ہوٹل کے کمرے ہی میں ٹھہرا رہا اور امریکی رسالوں اور تیل کی تلاش کے مضمون کے تکنیکی جریدوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ اگلے مہینے نے وِن نے مسز ڈولیز کو اس کے چند دوستوں اور عزیزوں کے ہمراہ برما مدعو کیا۔ "اِنیا لیک ہوٹل کی ایک پوری منزل، مسلح محافظوں سمیت، ہمارے تصرف میں تھی،" مسز ڈولیز نے مجھے بتایا۔ "اس منزل پر اَور کوئی نہیں ٹھہرا تھا۔ ہم جہاں کہیں جاتے، محافظ ہمارے ساتھ ہوتے۔ ہر شخص نے ہمارے ساتھ بے حد شائستگی کا برتاؤ کیا، لیکن ہمیں کچھ زیادہ دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نہیں جانتی کہ ہماری اس قدر حفاظت کرنے کی کیا ضرورت تھی؛ میرا خیال ہے کہ جنرل نے وِن کے مہمانوں کے ساتھ ہمیشہ یہی کیا جاتا ہو گا۔"

نے وِن کے مغربی مقامات کے دوروں کے باوجود (لندن کے ہیمر سمتھ اسپتال میں ایک "برما سوئٹ" قائم کیا گیا ہے کیوں کہ نے وِن اس اسپتال کے بہترین سرپرستوں میں سے ایک ہے)، ۱۹۶۲ میں اقتدار پر قابض ہونے کے بعد اس نے برما سے غیر ملکی اثرات کا خاتمہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ اس نے صنعتیں، بینک، درآمد و برآمد کے کاروبار اور بیشتر خوردہ فروشی کے کاروبار کسی معاوضے کے بغیر قومیا لیے، اور ان میں ایسے کاروبار بھی شامل تھے جن کے مالک غیر ملکی تھے۔ اس نے برما میں مقیم ہندوستانی اور چینی باشندوں کی جائیدادیں ضبط کر لیں؛ ایسے دو لاکھ افراد کو، جن میں سے بعض کئی عشروں سے برما میں رہ رہے تھے، اپنے تمام اثاثے چھوڑ کر برما سے رخصت ہونا پڑا۔ اس نے برما میں ورلڈ بینک کی تمام سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔

خارجہ امور میں برما نے ایک نہایت سخت گیر غیر جانبداری ہمیشہ برقرار رکھی ہے؛ ۱۹۷۹ میں برما نے ناوابستہ ملکوں کی ایک کانفرنس میں سوویت یونین کی جانب خفیف سا جھکاو محسوس ہونے پر فوراً کانفرنس سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔

***

غیروں کی بابت نےون کے اس رویّے کے اسباب جاننا دشوار نہیں ہے۔ ۱۸۸۶ سے لے کر، جب برطانیہ نے برما کی بادشاہت کی باقیات کو اپنے قبضے میں لیا تھا، انگریزوں نے برما پر ہندوستان کے ایک صوبے کے طور پر حکمرانی کی تھی۔ تمام اونچے سرکاری عہدے انھوں نے خود سنبھال لیے، اور نچلے درجے کے اہلکاروں کے طور پر ہندوستانیوں کا تقرر کیا۔ ہندوستانی تاجر، مہاجن، پیشہ ور لوگ اور مزدور رفتہ رفتہ برمی معیشت پر چھا گئے، اور فوج میں بھی زیادہ تر ہندوستانیوں کو، یا پھر شمالی پہاڑی علاقوں کے قبائلیوں کو، بھرتی کیا گیا۔ برمنوں کو ان میں سے ہر شعبے سے باہر رکھا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہوتے ایک عام برمن کا تصوّر کسی بے زمین کاشتکار کا تھا جو گاؤں گاؤں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ صدر مقام، رنگون، بڑی حد تک غیر ملکیوں کا شہر تھا؛ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے یہاں ڈھائی لاکھ ہندوستانی اور چالیس ہزار چینی باشندے تھے، جبکہ برمیوں کی تعداد (جن میں برمن اور دوسرے مقامی نسلی گروہ شامل تھے) ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ جارج آرول (George Orwell) نے، جو ۱۹۲۰ کے عشرے میں برما میں پولیس افسر کے طور پر تعینات رہا تھا، اپنے ناول *Burmese Days* میں انگریز قبضہ گیروں کی نسل پرستی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس ناول کا ایک کردار، "تاریخ کی اُبتدا سے غلام رہنے والے ان بدبخت کالے سوّروں" کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے:

> اس کلب میں کسی نیٹو کے لیے کوئی جگہ نہیں! ایسی ہی چھوٹی رعایتیں دے دے کر ہم نے اپنی سلطنت برباد کر ڈالی ہے۔ ہم نے بہت نرمی کا سلوک کیا ہے، اسی لیے یہ پورا ملک بغاوت سے سلگ رہا

Scanned with CamScanner

ہے۔ درست پالیسی صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ ان لوگوں کے ساتھ اسی غلاظت کا سا برتاو کیا جائے جو کہ یہ ہیں... ہم سب کو متحد ہو کر ان سے کہنا ہو گا: "ہم مالک ہیں اور تم بھکاری۔ اور تم بھکاریوں کو اپنی حیثیت پہچاننی ہو گی۔"

نےوِن، جو آگے چل کر طالب علم مظاہرین کو اس قدر بے دردی سے کچلنے والا تھا، خود ایک قوم پرستانہ تحریک ـــ تھاکین (Thakin) تحریک ـــ کا جزو رہ چکا تھا، جو ۱۹۳۰ میں رنگون یونیورسٹی کے کچھ طالب علموں نے شروع کی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو "تھاکین" کے لقب سے پکارتے تھے جس کے لغوی معنی "مالک" کے ہیں، اور یہ وہ خطاب تھا جس سے برمی باشندے یوروپی افراد کو مخاطب کرتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد تحریک کے دو رہنماؤں، تھاکین آوَن سان (Aung San) اور تھاکین نُو (Nu) نے برما کی جدوجہدِ آزادی کی نمایاں ترین شخصیات کی حیثیت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۱ میں آوَن سان اور نےوِن ان تیس افراد میں شامل تھے جنھیں "تیس کامریڈ" سمجھا جاتا تھا، یعنی وہ نوجوان برمی قوم پرست جنھوں نے خفیہ طور پر ملک سے باہر جا کر جاپانیوں سے گُریلا جنگ کی تربیت حاصل کی تھی۔ وہ دسمبر ۱۹۴۱ میں جاپانی فوج کے حملے کے ساتھ ملک میں دوبارہ داخل ہوئے اور انھوں نے برمیوں کو قوم پرست لبریشن آرمی کی شکل میں منظم کیا۔ لیکن ۱۹۴۵ میں آوَن سان نے، جسے یقین تھا کہ جاپانی برما کو آزاد کرنے کے وعدے کا پاس نہیں کریں گے، اپنی دس ہزار نفر کی فوج کو اتحادیوں کی طرف منتقل کر دیا۔

جنگ کے خاتمے پر کلیمنٹ ایٹلی کی قیادت میں برطانیہ کی نئی لیبر حکومت نے جنرل آوَن سان کا برما کی آزادی کا مطالبہ فوراً تسلیم کر لیا۔ اپریل ۱۹۴۷ میں دستور ساز اسمبلی کے قیام کے لیے قومی انتخابات ہوئے جن میں آوَن سان کی جماعت ـــ اینٹی فاشسٹ پیپلز فریڈم لیگ ـــ نے اکثر نشستیں جیت لیں اور آوَن سان کی سرکردگی میں ایک عبوری حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ کو دو افراد، جو سب مشین گنوں سے مسلح تھے اور دائیں بازو کے ایک مخالف سیاست داں کے کرائے کے سپاہی تھے، عبوری حکومت کے ایک اجلاس کے دوران اندر گھس آئے اور فائر کھول دیا۔ آوَن سان، جس کی عمر اُس وقت تینتیس برس کی تھی، اپنے چھ

Scanned with CamScanner

وزیروں سمیت ہلاک ہو گیا، اور یوں برما اپنے واحد حقیقی قومی ہیرو سے محروم ہو گیا۔ انگریزوں نے یونُو (U Nu) سے، جو تھاکین گروپ کا معمر ترین اور دانشمند ترین رکن تھا، ایک نئی انتظامی کاؤنسل قائم کرنے کو کہا، اور عبوری حکومت برقرار رہی۔ ۴ جنوری ۱۹۴۸ کو، نجومیوں کی تجویز کردہ مبارک ساعت میں یعنی صبح چار بج کر بیس منٹ پر، یونو نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا۔ (نجوم کو برمی عقائد میں ہمیشہ سے نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ مثلاً کوئی شخص جس مخصوص دن کو پیدا ہوا ہو، وہ دن اس کے نام اور کردار کا تعین کرتا ہے۔)

۱۹۶۲ میں جنرل نےوِن کی کمان میں برمی فوج کے اقتدار پر قبضہ کر لینے تک کے بیشتر برسوں میں پارلیمانی جمہوری حکومت کی قیادت یونو ہی کے پاس رہی۔ لیکن وزیراعظم کے طور پر یونو کا دورِ حکومت سنگین مسائل کا شکار رہا۔ ۱۹۴۹ میں کئی مخالف گروپوں نے، جن میں کارین نسلی اقلیت اور دو کمیونسٹ تنظیمیں شامل تھیں، حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور قریب تھا کہ اس کا تختہ الٹ دیں، کہ جنرل نےوِن کی فوج نے حکومت کے حق میں مداخلت کی اور رفتہ رفتہ باغیوں کو دھکیل کر سرحدی علاقوں میں پہنچا دیا۔ یونو برما کی معیشت کو دوسری جنگ عظیم کے زمانے کے تباہ کن اثرات سے نکالنے میں بھی ناکام رہا۔ علاوہ ازیں، اسے خود اپنی پارٹی کے اندر بھی مسائل درپیش رہے؛ فریڈم لیگ ۱۹۵۸ میں دو دھڑوں میں بٹ گئی جس کے نتیجے میں حکومت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ یونو نے اقتدار نےوِن کی قیادت میں ایک نگراں حکومت کو سونپنے کا فیصلہ کیا جس کے ذمے امن اور استحکام کو بحال کرنے کا کام تھا تاکہ نئے انتخابات کرائے جا سکیں۔ تمام بیانات کے مطابق، نےوِن نے بڑی احتیاط سے آئین کے دائرے میں رہتے ہوئے کام کیا اور حکومت کا استحکام بحال کرنے اور مطلوبہ اصلاحات نافذ کرنے کے سلسلے میں موثر نتائج حاصل کیے۔

۱۹۶۰ کے انتخابات کے نتیجے میں یونو کی حکومت بحال ہو گئی؛ اس نے فریڈم لیگ کے دوسرے دھڑے پر، جسے فوج کی حمایت میسر تھی، نمایاں فوقیت حاصل کی۔ فروری ۱۹۶۲ میں اس نے نسلی اقلیتوں کے پیچیدہ مسائل کا حل نکالنے کی کوشش میں ان اقلیتوں کے نمائندوں کو ایک کانفرنس کے لیے رنگون مدعو کیا۔ ابھی یہ کانفرنس جاری تھی کہ ۲ مارچ کو صبح سویرے جنرل نےوِن اور اس کی زیرِ کمان فوج نے ایک تیز رفتار اور موثر کو دیتا (coup d'etat) کے ذریعے،

جس میں صرف ایک شخص کی جان گئی، اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ بظاہر نے ون کو یہ خطرہ تھا کہ یو نو چند اقلیتی گروہوں کو آزادی دینے والا ہے ــــ یہ اقدام اُس کے نزدیک برمی ریاست کو تباہ کر ڈالنے کے مترادف تھا، لیکن دوسری طرف یہ بھی محض اتفاق نہیں کہ اس اقدام کا مطلب برمی فوج کا اس ممکنہ خطرے سے محروم ہو جانا ہوتا جس کی اسے برمی معاشرے میں اپنا نمایاں اور طاقت ور کردار برقرار رکھنے کے لیے ضرورت تھی۔ یو نو کو ریوالور سے مسلح ایک لیفٹننٹ نے اس کی خواب گاہ سے گرفتار کر لیا؛ اسے چار برس قید خانے میں رکھنے کے بعد جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۸۰ میں وہ، نے ون کی دعوت پر، برما لوٹ آیا۔

نے ون کے کودیتا کی عملاً کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ لیکن اُس کے دورِ حکومت میں برما کی معیشت تباہی کی ایسی گہرائیوں میں اتر گئی کہ یو نو کی حکمرانی کا زمانہ مقابلتاً نہایت خوش حالی کا دور محسوس ہونے لگا۔ برطانوی نو آبادیاتی دور میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے تک، دریائے اراوادی کے ڈیلٹا کی بے حد زرخیز زرعی زمین کی بدولت، برما دنیا بھر میں چاول برآمد کرنے والے ملکوں کی صفِ اوّل میں شامل تھا اور ہر سال ۳۵ لاکھ ٹن چاول برآمد کرتا تھا، یعنی عالمی منڈی میں بکنے والے چاول کی کل مقدار کا نصف۔ یو نو کی حکومت کے آخری برسوں میں چاول کی برآمد کم ہو کر بیس لاکھ ٹن سالانہ ہو چکی تھی۔ لیکن ۱۹۸۸ تک اس چاول کی مقدار فقط بیس ہزار ٹن رہ گئی تھی، اور، ایک ایسے ملک سے جس کی آبادی نسبتاً کم اور زرخیز زمین کا رقبہ بہت وسیع ہے، پہلی بار غذا کی قلت کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ برطانوی حکمرانی کے دنوں میں برما دوسرے ایشیائی ملکوں کو خام تیل مہیا کرنے والے ملکوں میں ممتاز تھا؛ آج وہ اپنی ضرورت بھر کا بھی تیل پیدا نہیں کرتا۔ سرکاری ملکیت کے کارخانے، جن کا انتظام فوجی نوکر شاہی کے افسروں کے ہاتھ میں ہے جو ہر قسم کی غیر ملکی مہارت اور ٹیکنولوجی کے سخت خلاف ہیں، مسلسل نقصان میں چلتے ہیں۔ رنگون کے ایک ماہرِ اقتصادیات نے مجھے ایسے ایک کارخانے کی کہانی سنائی جو جنوب کے شہر باسین میں واقع تھا۔ "شیشہ سازی کا یہ کارخانہ ۱۹۷۰ کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں قائم کیا گیا تھا،" اس نے بتایا۔ "اگرچہ باسین کے نزدیک ریت دستیاب نہیں، پھر بھی اسے وہاں قائم کیا گیا، کیوں کہ کسی نے نے ون سے وعدہ کیا تھا کہ اس مقام پر ایک کارخانہ لگایا جائے گا۔ جون ۱۹۸۸ میں اس کارخانے کو خام مال دستیاب ہونا بالکل بند ہو گیا۔ لیکن شیشہ سازی کے کارخانے کو عارضی

طور پر بند کرنا اس کی پیداوار کو بھٹی میں ڈال کر دوبارہ پگھلانے کی نسبت زیادہ مہنگا پڑتا ہے، اور کچھ عرصے تک ایسا ہی کیا جاتا رہا۔ آخر کار اس کارخانے کو واقعی بند کر دیا گیا، جبکہ ۵۰ کروڑ کیات کی مالیت کا غیر فروخت شدہ شیشہ اس کے گودام میں موجود تھا۔ اس شیشے کو فروخت کرنا ناممکن ہے ـــ اس کی قیمت ادا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں، اسے کسی اَور جگہ منتقل کرنا نہایت گراں ہو گا، اور، اس کے علاوہ، یہ گھٹیا قسم کا شیشہ ہے جو کسی کو درکار نہیں۔"

۱۹۸۷ کے اوائل میں برمی حکومت نے اپنی خودداری ترک کرتے ہوئے اقوام متحدہ سے درخواست کی کہ برما کو سب سے کم ترقی یافتہ ملکوں (LDCs) کے زمرے میں شامل کر لیا جائے، تاکہ اسے اضافی امداد ملنے کا مستحق سمجھا جا سکے۔ یہ درخواست کرنا فوجی حکومت کے لیے سخت ذلت کی بات رہی ہو گی، کیوں کہ اس کا مطلب یہ تسلیم کرنا تھا کہ اس نے برما کو جو کبھی اپنی زرخیز زمین اور تیل، عمارتی لکڑی اور جواہرات کے وسیع ذخائر سے مالامال ملک تھا، ایک بھکاری ملک کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ اس درخواست کے نتیجے میں برما کو آخر کار سب سے کم ترقی یافتہ ملکوں میں شامل کر لیا گیا کیوں کہ اس کی فی کس سالانہ آمدنی ۲۱۰ ڈالر کے مساوی تھی۔ لیکن اس نے اس زمرے میں شامل ہونے کی ایک اَور شرط پوری نہیں کی جس کا تعلق شرحِ خواندگی سے ہے: برما کی خواندگی کی شرح مجموعی طور پر ۶۶ فیصد اور شہروں کی حد تک ۸۵ فیصد ہے۔

برما کی صورتِ حال سب سے کم ترقی یافتہ زمرے میں شامل دوسرے چالیس ملکوں سے مماثلت نہیں رکھتی؛ وہاں اُبھری ہوئی پسلیاں اور پھُولے ہوئے پیٹ اور لوگوں کے بدن پر لٹکتے ہوئے چیتھڑے دکھائی نہیں دیتے۔ رنگون کی سڑکوں پر آپ کو نیویارک شہر کے مقابلے میں کم گداگر نظر آئیں گے۔ "اس ملک کو دیکھیے اور پھر اس کا مقابلہ افریقا کے کسی بھی ملک سے کر لیجیے؛ آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ کوئی غریب ملک نہیں ـــ یہ ایک مالدار ملک ہے جو اپنا راستا کھو بیٹھا،" رنگون میں تعینات ایک سفارت کار نے مجھ سے کہا۔ لیکن یہ بات کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مستقبل میں عام قحط کی سی صورتِ حال پیدا نہیں ہو گی۔ چاول کے دام بڑھ گئے ہیں؛ دودھ کے ایک ڈبے کے برابر چاول (گاڑھے دودھ کے ڈبے خالی ہونے کے بعد برما میں ناپ تول کے پیمانوں کے طور پر دُہری خدمت انجام دیتے ہیں) پانچ کیات میں آتے ہیں، اور یہ قیمت ایک سال پہلے کے مقابلے میں دگنی سے زیادہ، اور مظاہرے شروع ہونے سے پہلے کے دنوں کی نسبت

Scanned with CamScanner

چوگنی سے زیادہ ہے۔ ایک دن میں رنگون کے ایک غریب ترین علاقے تھاکیتا سے گزر رہا تھا، جو پازونگداں کریک کے کنارے واقع شکستہ چوبی مکانوں پر مشتمل بستی ہے۔ میں نے ایک بوڑھے پنشن یافتہ شخص سے بات کی جو اپنی بیوی، بیٹے، بہو اور تین پوتے پوتیوں کے ساتھ دو تنگ کمروں میں رہتا تھا۔ اسے فوج کی طرف سے تین ڈالر بیس سینٹ کے مساوی پنشن ملتی ہے، لیکن اس رقم میں ظاہر ہے کہ گزارا نہیں ہو سکتا چناں چہ اس کے گھر کے ساتوں افراد سڑک پر پھل اور سبزیاں بیچتے ہیں۔ ان سب کی مجموعی آمدنی ۲۸ اور ۶۰ سینٹ کے درمیان بنتی ہے۔ "ہمیں کبھی پیٹ بھر چاول میسر نہیں ہوتا،" وہ بولا۔

برما کی آج کی صورتِ حال کو دیکھ کر یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب یہ ملک جنوبی ایشیا میں مینوفیکچرنگ، تجارت اور ٹرانسپورٹ کے میدانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ "رنگون اپنے شاندار ایرپورٹ کے لیے معروف ہے جو تین بڑے فضائی راستوں کا نقطۂ اتصال ہے،" ۱۹۳۹ میں "نیشنل جیوگرافک" نے تحریر کیا۔ "دنیا کے گرد فضائی چکر لگانے والے اور ہوائی جہاز کے سفر کے دلدادہ لوگ اتنی تعداد میں یہاں آتے ہیں کہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ رنگون کی فضائی سفر کے باب میں وہی حیثیت ہو گی جو شنگھائی کی بحری سفر کے سلسلے میں ہے ـــــ یعنی مشرق کی گزرگاہوں کا سنگم!" ۱۹۵۲ میں امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس ولیم او ڈگلس نے لکھا: "برما آج ایشیا بھر کے روشن ترین نقطوں میں سے ایک ہے... اگر برما کو بیرونی حملے سے محفوظ رکھا جا سکے تو وہ فیوڈل ایشیا کو کمیونزم کا ایک متبادل فراہم کر کے دکھا سکتا ہے۔" برطانوی دور سے لے کر ۱۹۶۰ کے عشرے کے اوائل تک رنگون کو بینکاک اور سنگاپور کے backwaters سے فرار پانے کا مقام سمجھا جاتا تھا۔ یہاں جنوبی ایشیا بھر میں کتابوں کی بہترین دکانیں واقع تھیں، شاندار غذائیں اور تفریح کے مواقع، اور تمام مغربی رسالے میسر تھے۔

نےوِن نے برمی معیشت کو کیوں کر برباد کیا؟ اس سوال کا جواب پانے کی ابتدا اس کی کتاب **The Burmese Way to Socialism** سے ہوتی ہے جو برما کے مستقبل کے موضوع کا ایک حیرت ناک حد تک اُلجھا ہوا خاکہ پیش کرتی ہے اور جو ۱۹۶۲ میں، اس کے اقتدار پر قابض ہونے کے بمشکل دو ماہ بعد، شائع ہوئی تھی۔ نےوِن کا سوشلزم مشرقی یوروپ کے مارکسزم سے مبہم سی مشابہت رکھتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں غیر قوموں کے آسیبی

خوف کی بھی آمیزش ہے جو ہندوستانی اور چینی منتظم طبقے کی ملک بدری کے اقدام اور تمام مغربی سرمایہ کاری اور تکنیکی مہارت کے مکمل استرداد کی بنیاد ہے۔ نےوِن نے اپنے فوجی افسروں سے کہا کہ وہ برما کی تجارت سنبھالیں۔ "فوجی افسروں نے اپنے عہدے ترک کر دیے اور سویلین بن گئے،" جان بیجلی نے، جو کورنیل یونیورسٹی میں جنوب مشرقی ایشیا کے ذخیرے کا کتاب دار اور برما کے امور کا ماہر ہے، مجھے بتایا۔ "مینوفیکچرنگ یا تجارت اختیار کرنے پر انھیں پُرکشش مراعات ــــ مکان، گاڑی اور پٹرول ــــ حاصل ہوتیں۔ لیکن دس میں سے نو صورتوں میں انھیں قطعی اندازہ نہ ہوتا کہ وہ کیا کام کر رہے ہیں۔ برمی باشندوں کے لیے اپنی صنعتوں کا انتظام چلانا اس ناکارہ اوپری سطح کے بغیر ہی خاصا دشوار تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کا افسرِ اعلیٰ ہمیشہ فوج سے آیا ہوا کوئی شخص ہوتا، جس کے آنے کا مقصد فقط لوٹ کھسوٹ ہوتا اور نےوِن کے اس قول پر جس کا ایمان مضبوط ہوتا کہ مغرب میں تعلیم پایا ہوا کوئی برمی پی ایچ ڈی بھروسے کے لائق نہیں۔"

آج برما میں روزی کمانا ایک نہایت پیچیدہ اور دشوار عمل ہے، جس میں عموماً بیک وقت کئی ملازمتوں کی ضرورت پڑتی ہے، جن میں سے تمام قانونی طور پر جائز نہیں کہلائے جا سکتے۔ رنگون کے ایک باشندے نے اپنے تمام کاروباری لین دین کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مجھے بتایا، "اپنے گھر والوں کے لیے چاول خریدنے کے لیے ہر روز دس سے پندرہ کیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کسی سرکاری دفتر کا کلرک مہینے بھر میں، اپنے عہدے کے لحاظ سے، ۲۱۰ سے ۴۰۰ کیات تک کما سکتا ہے۔" یہ رقم چار سے آٹھ ڈالر تک کے مساوی ہے۔ "چناں چہ اس کی ماہوار تنخواہ محض چاول کے خرچ کے لیے بھی ناکافی ہے۔ ہر شخص کو زندہ رہنے کے لیے تین یا چار ملازمتیں کرنی پڑتی ہیں۔ دن میں وہ خواہ کسی سرکاری دفتر میں کام کرتا ہو، مگر رات کے وقت اسمگلنگ کرنے یا سڑک پر کوئی چیز بیچنے پر مجبور ہوگا۔ سرکاری ملازمت میں قطعی کوئی کام نہیں کرنا پڑتا ــــ بس پورے وقت بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ سرکاری دفتروں میں کوئی کام نہیں ہوتا؛ نہ درآمد کرنے کے لیے کچھ ہے نہ برآمد کرنے کے لیے، اور نہ کسی کارخانے کے لیے کوئی خام مال موجود ہے۔" اس شخص نے بھی رنگون کے ماہرینِ اقتصادیات، سفارت کاروں، طالب علموں اور ان تمام دوسرے لوگوں کی طرح جن سے میری بات چیت ہوئی، صرف اس شرط پر اپنا حوالہ دینے کی اجازت دی کہ اس کا نام ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ چند ایک مستثنیات کے علاوہ، برمی باشندوں کے نزدیک کسی

Scanned with CamScanner

مغربی کتاب یا رسالے میں ان کے نام کی اشاعت لازماً قید خانے کی تمہید ہے۔

خستہ حال معیشت کے نتیجے میں آج برما میں ایک نہایت پھلتا پھولتا چور بازار موجود ہے، اور یہ سرکاری گٹھ جوڑ سے کام کرتا ہے۔ رنگون کے منگالا بازار میں اسمگل کی ہوئی اشیا ـــ کپڑے، اسٹیریو اور پُرتعیش غذائیں ـــ دس ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ دکانوں کے درمیان کی گزرگاہیں گاہکوں سے کھچا کھچ بھری رہتی ہیں۔ رنگون کے مرکزی علاقے میں واقع بوگیوک مارکیٹ میں ایک عورت مجھے کھینچ کر ایک طرف لے گئی اور انگریزی میں مجھے غیر ملکی شرابوں کی ان اقسام کے نام گنوانے لگی جو اس کے پاس دستیاب تھیں۔ پھر اس نے مجھے کاؤنٹر کے پیچھے لے جا کر امریکا، فرانس، آسٹریلیا، یوگوسلاویا اور جرمنی میں تیار کردہ شراب کی بوتلیں دکھائیں۔ بوردو کی بنی ہوئی ۱۹۸۵ کی موتوں کادے اور کیلیفورنیا کی ۱۹۸۵ ہی کی بولیو شابلی محض ساڑھے چار ڈالر کے عوض مل سکتی تھیں، جس سے اس چور بازار کے بے پناہ تحرک کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جہاں سامان تقریباً اتنی ہی قیمت پر دستیاب ہے جو تیار کرنے والے ملک میں ہوگی۔ اب تو ڈاکٹروں کے نسخے پر ملنے والی مخصوص دوائیں تک چور بازار کے اسٹالوں پر دستیاب ہیں۔ تین سال پہلے میں نے اس قسم کی صرف چند ایک دوائیں چور بازار میں بکتی دیکھی تھیں ـــ اور وہ یہاں کے سوا کہیں نہ مل سکتی تھیں۔ ان میں سے بیشتر کے لیبل پیلے پڑ چکے تھے اور ان کے استعمال کی مدت کبھی کی گزر چکی تھی۔ اب وہاں پوری پوری فارمیسیاں موجود ہیں جن میں ہر قسم کی مغربی دوائیں مل سکتی ہیں۔ ان میں سے اکثر دکانوں میں، کہا جاتا ہے، وہ طبی اشیا فروخت ہوتی ہیں جو بیرونی ملکوں سے عطیے کے طور پر ان اسپتالوں کے لیے بھیجی گئی تھیں جنھوں نے خطرناک حد تک کم دواؤں کے ساتھ زخمی مظاہرین کے علاج معالجے کا بوجھ اٹھایا تھا۔ مثال کے طور پر، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۸۸ میں اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ نے ۸۳ ٹن دوائیں اور طبی اشیا عطیے کے طور پر برما بھیجی تھیں۔ لیکن ڈاکٹر تن میووِن (Tin Myo Win) نے، جو رنگون جنرل اسپتال میں دسمبر ۱۹۸۸ تک کام کر چکا ہے، مجھے بتایا، "ہمیں سمندر پار کے ملکوں کی طرف سے دواؤں کی بڑی بڑی مقداروں کے بھیجے جانے کی خبریں ضرور ملیں، لیکن کوئی چیز ہمارے اسپتال میں نہ پہنچی۔"

اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ حکومت چور بازار کو ایک اہم سیفٹی والو کے طور پر دیکھتی ہے؛ سرکاری اہلکار اور مسلح افواج دونوں اس میں آزادی سے حصہ لیتے ہیں۔ ایک دن جب

میں ایک زرعی گاؤں کے سفر پر نکلنے والا تھا، میرے ڈرائیور نے پٹرول لینے کے لیے اُس فوجی یونٹ کے احاطے کے صدر دروازے کے عین سامنے گاڑی روکی جسے حکومت کے رہنماؤں کی حفاظت کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔ ایک عورت نے کاؤنٹر کے نیچے سے پٹرول سے بھرے کئی کنستر کھینچ کر نکالے جو فوجی گاڑیوں میں سے نکال کر جمع کیا گیا تھا۔ جس وقت ڈرائیور اپنی گاڑی کے ٹینک میں پٹرول ڈال رہا تھا، فوجی سپاہی ہمارے ارد گرد چاروں طرف پھر رہے تھے اور ان میں سے کسی نے اس سودے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

سرکاری ملازمتیں رکھنے والے افراد کے لیے سامان کی براہ راست خُرد بُرد بالکل عام بات ہے۔ رنگون میں بسوں اور سرکاری گاڑیوں کے بُڈ میں تالا لگا ہوتا ہے تاکہ ڈرائیور انجن کے پُرزے نکال کر چور بازار میں نہ بیچ دیں؛ اگر کسی وجہ سے انجن کو دیکھنا ضروری ہو جائے تو ایک خاص نمبر پر ٹیلی فون کر کے مخصوص سرکاری سروس وین منگوانی پڑتی ہے۔ "برمی کسی بھی چیز کو چلانے میں مہارت رکھتے ہیں، بشرطے کہ اسے اپنے خاندان کے فائدے میں چلایا جا رہا ہو،" جان بیجلی کا کہنا ہے۔ "ریاست کے لیے کوئی شخص کچھ بھی چلانے پر آمادہ نہیں۔ بیورو کریسی کی روایت یہاں بالکل اجنبی ہے۔" اپنے خاندان کے لیے کام کرنے اور ریاست کے لیے کام کرنے کا فرق اُس وقت بالکل واضح ہو گیا جب ایک رات میں نے اپنے ہوٹل میں کھانا کھانے کا فیصلہ کیا؛ کاندا وگی نام کا یہ ہوٹل شاہی جھیل کے کنارے واقع ہے اور سرکاری انتظام کے تحت ہے۔ اس سے پہلے میں رنگون کے پرائیویٹ ملکیت کے چینی ریستورانوں میں رات کا کھانا کھانے جایا کرتا تھا جہاں مینو میں بے شمار قسم کی غذائیں انتخاب کے لیے موجود تھیں، سروس نہایت عمدہ تھی، اور کھانا نہ صرف اچھا تھا بلکہ مقدار میں بھی کافی ہوتا تھا۔ (رنگون میں ایک بھی برمی ریستوراں نہیں ہے — جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نے ون کے اقدامات کے باوجود معیشت کے بعض شعبوں پر چینی نژاد باشندوں کی گرفت اب تک کتنی مضبوط ہے۔ اگر آپ برمی کھانا کھانے کے خواہش مند ہوں، جو عموماً دھیمے مسالوں والے خوشبودار سالنوں پر مشتمل ہوتا ہے، تو آپ کو سڑک کے کنارے کسی ٹھیلے سے رجوع کرنا ہو گا یا پھر خود کو کسی کے گھر مدعو کرانا ہو گا۔) میں نے اپنے ہوٹل میں رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ اس وجہ سے کیا کہ ہر صبح ناشتے پر میں ایک عجیب منظر دیکھتا تھا۔ ہوٹل کے تمام باورچی — جو تعداد میں تقریباً ایک درجن تھے — شیف کی سفید

وردیاں پہن کر اور ٹوپیاں لگا کر، ایک قطار میں ڈائننگ روم سے کچن کی طرف مارچ کرتے۔ چوں کہ باورچیوں کی تعداد بظاہر ہوٹل کے مہمانوں سے زیادہ تھی، اور وہ دیکھنے میں نہایت بے داغ پیشہ ور معلوم ہوتے تھے، میں نے خود کو رات کے کھانے پر پیش کرنا مناسب خیال کیا۔ میں نے ویٹر سے مینو طلب کیا، جس نے جواباً کہا کہ مینو نہیں ہے لیکن میں مچھلی، پورک، چکن اور بیف کے درمیان انتخاب کر سکتا ہوں۔ میں نے مچھلی کا انتخاب کیا، اور وہ چلا گیا، لیکن پانچ منٹ بعد واپس آیا اور پوچھنے لگا کہ میں نے کیا آرڈر دیا تھا۔ مزید پانچ منٹ بعد وہ ایک پلیٹ میں بیف کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا، فرنچ فرائز اور سبزیوں سے سجائے، پھر نمودار ہوا (دونوں چیزوں کا ذائقہ سڑے ہوئے تیل کا سا تھا۔) اس کے بجائے اگر میں باورچیوں کے گھر جا کر کھانا کھاتا تو فائدے میں رہتا، کیوں کہ تازہ خوردنی تیل غالباً وہیں پہنچا ہوگا۔

چور بازار کی بعض سرگرمیوں کی پیچیدگی اس قدر متاثر کن ہے کہ آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت ان انتظامی صلاحیتوں کے قانونی استعمال کی اجازت دے دے تو برما کس قدر خوش حال ملک بن سکتا ہے۔ "یہ لوگ واقعی انتظامی لحاظ سے جینیئس ہیں،" رنگون میں تعینات ایک مغربی سفارت کار کہتا ہے۔ "اگر انھیں قانونی دائرے میں لایا جا سکے تو تھوڑے ہی عرصے میں اس ملک کی حالت بدل جائے۔" چیزیوں کی سرحد پار اسمگلنگ ـــ چاول بنگلادیش کو، اور ٹیک کی لکڑی، معدنیات اور جواہرات تھائی لینڈ اور چین کو بھیجی جاتی ہیں اور صارفانہ اشیا اور مضبوط کرنسیاں برما میں منگوائی جاتی ہیں ـــ اس قدر موثر آپریشن ہے کہ برما کے چور بازار میں اسمگل شدہ اشیا بینکاک کی نسبت محض ذرا سی مہنگی ہیں۔ ایک ماہرِ معاشیات نے تخمینہ لگایا ہے کہ برما کی چور بازار معیشت کم سے کم اُتنی ہی بڑی ہے جتنی پوری سرکاری معیشت۔

افیون کی تجارت اس کے علاوہ ہے۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کا اندازہ ہے کہ دنیا بھر میں افیون کی موجودہ سپلائی میں سے تقریباً نصف برما فراہم کرتا ہے۔ افیون کی پیداوار اور افیون کی اسمگلنگ کا کام آج کل زیادہ تر برمی کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہے ـــ اس پارٹی نے منشیات کی تجارت کے کام کو کسی نظریے کے پرچار سے کہیں زیادہ منافع بخش پایا ہے ـــ اور اس پارٹی کے علاوہ شان ریاست کی فوج، جو منشیات کی دنیا کے ایک بدنام سردار کھُن سا (Khun Sa) کی ذاتی فوج ہے، منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے۔ (کارین اور کاچین، برما کے دو بڑے اقلیتی گروہ، اس

کاروبار میں ملوث نہیں ہیں۔ وہ اپنی آمدنی تھائی لینڈ کے اندر اور وہاں سے باہر اسمگل کی جانے والی اشیا پر ٹیکس عائد کر کے حاصل کرتے ہیں۔) مشرقی برما میں واقع شان ریاست کا پہاڑی علاقہ افیون کے ڈوڈوں کی کاشت کے لیے دنیا کی بہترین زمین ہے۔ کھن سا نے ــــ جس کا چیانگ مائی، تھائی لینڈ، میں ایک تعطیلاتی بنگلا ہے جس نے، اپنے میناروں اور خاردار تاروں سمیت، شہر کا ایک پورا بلاک گھیر رکھا ہے ــــ ماضی میں کئی موقعوں پر انٹرویو اور پریس کانفرنس کے لیے غیر ملکی اخبار نویسوں کو مدعو کر کے برمی حکومت کو اشتعال دلایا ہے، اور ان اخبار نویسوں کے ذریعے امریکی حکومت کو کھلا پیغام بھیجا ہے کہ وہ چاہے تو افیون کی پوری فصل اس سے خرید کر اسے تلف کر سکتی ہے۔

اس میدان میں امریکا کی کوششیں خاصے بحث مباحثے کا موضوع بنی ہیں۔ ۱۹۵۰ کے عشرے میں سی آئی اے نے چین میں کمیونسٹوں کی فتح کے بعد وہاں سے فرار ہو کر برما آنے والے کومنتانگ کے سپاہیوں کو اسلحہ فراہم کیا تھا تاکہ وہ چینی سرحدوں پر حملے کر سکیں۔ اس کے بجائے کومنتانگ سپاہیوں نے اس اسلحے کی مدد سے قوم پرست چینیوں کے افیون کے کاروبار کی حفاظت شروع کر دی۔ حالیہ برسوں میں ــــ یعنی ۱۹۸۵ سے لے کر ستمبر ۱۹۸۸ کی خوں ریزی کے بعد امریکی امداد کی معطلی تک ــــ امریکا برمی فوج کو افیون کی فصل پر فضائی چھڑکاؤ کرنے کے لیے زہریلی ادویات، ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہاز فراہم کرتا رہا ہے، لیکن اقلیتی گروپوں کے حامیوں نے الزام لگایا کہ رنگون کی حکومت افیون کی کاشت کے بڑے بڑے علاقوں میں ان جہازوں کی پرواز کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں، اور اس کے بدلے مخالف نسلی اقلیتوں کے دیہات میں ترکاریوں کی فصلوں کو زہریلا کر رہی ہے۔

حال میں، جبکہ معیشت کی حالت دگرگوں اور زرمبادلہ کے ذخائر بہت کم تھے، برمی حکومت نے معیشت کی اصلاح کے لیے کچھ اقدامات کیے۔ لیکن بہت کم سودے طے پا رہے ہیں، جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اصلاح کے اثرات زیادہ دور تک نہیں پہنچے ہیں۔ اب تک بینکنگ کے کسی نجی نظام کا وجود نہیں ہے، اور حکومت ــــ ایک رپورٹ کے مطابق، نے ون کے اصرار پر ــــ سرکاری سودوں میں ساڑھے چھ کیات فی ڈالر کی مضحکہ خیز حد تک قلیل شرحِ تبادلہ پر اڑی ہوئی ہے۔ اب تک معاشی ترقی کی واحد علامت تھائی لینڈ کے ساتھ ہونے والا تجارتی معاہدہ ہے، جس

Scanned with CamScanner

کے مذاکرات دسمبر ۱۹۸۸ میں ہوے تھے جب تھائی لینڈ نے، برما کے بین الاقوامی بائیکاٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوے، اپنے چوٹی کے فوجی افسر، جنرل چوالِت یونگ چائے یدھ (Chavalit Yongchaiyudh) کو رنگون بھیجا تھا۔ اس معاہدے سے ہونے والے فوائد کی حیثیت مشکوک ہے۔ زیادہ تر رپورٹوں کے مطابق جنگل کاٹنے کے حقوق تھائی کمپنیوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کر دیے گئے اور مچھلیاں پکڑنے کے حقوق کی فروخت کے باعث برما کی سو سے زیادہ ماہی گیری کی کشتیاں بے کار ہو گئیں اور تھائی ماہی گیر اپنے ترقی یافتہ آلات کے ساتھ برمی پانیوں میں داخل ہو گئے۔ لیکن یہ معاہدہ تھائی لینڈ کے لیے اور ذاتی طور پر جنرل چوالِت کے لیے نہایت منفع بخش ثابت ہونے والا تھا۔ اس لین دین سے واقفیت رکھنے والے ایک اونچے سفارت کار کے مطابق چوالت کی بیوی لکڑی کاٹنے والی ان کمپنیوں میں سے ایک کے حصص کی مالک ہے جنھیں اس معاہدے سے فائدہ ہو گا، اور اس کا بیٹا ماہی گیری کی ایک فرم میں اپنا حصہ رکھتا ہے جسے برما میں مچھلیاں پکڑنے کے حقوق ملے ہیں۔ جنوری ۱۹۸۹ میں — تھائی لینڈ کے برمی ٹیک حاصل کرنے کے حقوق کا مالک بننے کے بعد — تھائی حکومت نے اعلان کیا کہ ماحولیاتی اثرات کے باعث تھائی لینڈ میں جنگل کاٹنے پر مکمل پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ ایک مغربی ماہرِ معاشیات نے مجھے بتایا کہ ٹیک کی قیمت فی میٹرک ٹن ۱۹۰۰ ڈالر سے فوراً ہی بڑھ کر دس ہزار ڈالر تک جا پہنچی۔ جنگل کاٹنے اور مچھلیاں پکڑنے کے اس حقوق کے عوض برمی حکومت کو ایک کروڑ ڈالر سے زیادہ زرمبادلہ ہاتھ آیا جس کی اسے شدید ضرورت تھی تاکہ فوج کی اسلحے کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ اسے تھائی حکومت کی یہ یقین دہانی بھی حاصل ہوئی کہ برما سے بھاگ کر تھائی لینڈ میں پناہ لینے والے بیشتر طالب علموں کو واپس وطن بھیج دیا جائے گا۔ "تھائی اپنے ملک کے ماحول کو پہلے ہی زنا بالجبر کا نشانہ بنا چکے ہیں،" رنگون میں مقیم ایک مغربی سفارت کار نے کہا۔ "خلیجِ سیام میں ایک بھی مچھلی باقی نہیں بچی ہے۔ اب یہی سب یہاں بھی ہو گا۔ اور دس برس کے اندر اندر برما میں تعمیراتی لکڑی کا ایک بھی تنا سلامت نہیں رہے گا۔"

***

نےوِن نے برمی معیشت کو چاہے تباہ کر ڈالا ہو، لیکن ۱۹۸۸ تک وہ سیاسی طور پر کہیں زیادہ کامیاب تھا۔ اس نے برما کو ایک جابر فوجی آمریت میں تبدیل کر دیا، مگر یہ ایک ایسی پولیس اسٹیٹ تھی جس کی آبادی مقابلتاً صابر تھی۔ عوام کے پاس بغاوت میں اٹھ کھڑے ہونے کے اسباب یقیناً، نےوِن کے دورِ حکومت کے آغاز ہی سے، موجود تھے۔ ابلاغ کے تمام پیرایوں ــــ کتابوں، رسالوں، ڈراموں، فلموں، موسیقی ــــ پر حکومت کا سخت کنٹرول اور سنسر عائد تھا۔ خلوت یا جلوت میں حکومت پر تنقید کرنے والا شخص گرفتاری کا خطرہ مول لیتا تھا۔ حکومت نے تفریح کی قریب قریب تمام صورتوں کو ممنوع قرار دے دیا تھا، اور لوگوں کے ایک جگہ جمع ہونے کا واحد مقام سیاسی اجتماع تھا۔ شہری آزادیوں کا تصور تک اجنبی تھا۔ ۱۹۸۸ میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ۳۴ بنگالی نژاد مسلمانوں کو، غیر قانونی مہاجر ہونے کے شبہے میں، طویل میعاد کی سزائیں دیے جانے پر احتجاج کیا تھا؛ ان میں سے بعض اس جرم میں تینتیس برس جیل میں گزار چکے تھے۔ اس تنظیم نے "برما: نسلی اقلیتوں کے افراد کی ماورائے عدالت ہلاکتیں اور ان پر تشدد" کے عنوان سے ۱۷ صفحوں پر مشتمل ایک دستاویز بھی جاری کی، جس میں کہا گیا، "بیشتر صورتوں میں نشانہ بننے والے فرد کے سر یا دل میں گولی ماری گئی، اور بعض صورتوں میں چاقو گھونپ کر، ذبح کر کے، پانی میں ڈبو کر، گلا گھونٹ کر، پھانسی دے کر یا تشدد کے ذریعے سے ہلاک کیا گیا... کسانوں کو اپنے کھیتوں میں فصلوں کی دیکھ بھال کرنے کے جرم میں گولی مار دی گئی، کیوں کہ برمی چاہتے تھے کہ وہ اپنے گاؤں کی حد سے باہر نہ نکلیں۔ اکثر ان کی آنکھیں نکال لی جاتیں۔" گرفتاری کسی بھی وجہ سے، یا بغیر کسی وجہ کے، کسی بھی وقت ہو سکتی تھی، اور اس امکان سے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ برما سے لوٹنے کے کچھ ہی دن بعد میں سان فرانسسکو کے ایک برمی ریستوراں میں کھانا کھانے گیا اور اس کے مالک سے گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ برما میں ایک آرکیٹیکٹ تھا، اور ۱۹۶۰ کے عشرے میں ایک مقامی فوجی کمانڈر کے لیے ایک ہیڈکوارٹر کا ڈزائن تیار کرنے کی غرض سے دریائے اراوادی کے ڈیلٹا کے ایک شہر میں گیا تھا۔ عین اسی موقعے پر وہ کمانڈر جنرل نےوِن کی نظروں سے گر گیا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ حکام نے فیصلہ کیا کہ کمانڈر کے آرکیٹیکٹ کو بھی ساتھ ہی گرفتار کر لینا مناسب ہو گا؛ آرکیٹیکٹ کو ڈھائی برس جیل میں ــــ اور اس مدت میں سے سات مہینے قیدِ تنہائی میں ــــ گزارنے پڑے، اور اس تمام وقت اس کے گھر والوں کو اس کا

کوئی اتا پتا نہ بتایا گیا۔

حکومت کے متواتر اشتعال دلانے کے باوجود برما میں، ۱۹۸۷ کے اواخر سے پہلے، صرف دو بار بڑے پیمانے پر احتجاج ہوا۔ ایک بار ۱۹۶۲ میں، نےون کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے صرف چار ماہ بعد، طالب علموں نے رنگون یونیورسٹی میں نئے اور سخت ضوابط کے نفاذ کے خلاف مظاہرے کیے۔ نےون نے اس احتجاج کا جواب اُسی انداز سے دیا جو آگے چل کر اس کے طرزِ حکومت کی پہچان بن گیا؛ اُس نے طالب علموں پر گولی چلانے کے لیے فوج کو بھیج دیا۔ بعض رپورٹوں کے مطابق سیکڑوں افراد مارے گئے۔ ایک دن بعد فوج نے کیمپس میں واقع اسٹوڈنٹس یونین کی عمارت کو بم سے اُڑا دیا؛ یہ عمارت ۱۹۳۰ کے عشرے سے برمی قوم پرستی کی ایک اہم علامت رہی تھی۔

دوسرا اور کہیں زیادہ سنگین احتجاج ۱۹۷۴ میں رنگون میں یو تھانت (U Thant) کی آخری رسوم کے موقعے پر پیش آیا۔ یو تھانت، جو دنیا کا مشہور ترین برمی باشندہ تھا، اقوام متحدہ میں اعلیٰ مقام تک پہنچنے سے پہلے خود اپنے ملک میں ایک نسبتاً غیر اہم فرد تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے وہ ایک قصباتی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا، اور ۱۹۵۴ میں یو نُو کا چیف آف اسٹاف اور قریبی معتمد بن گیا۔ تین برس بعد یو نو نے اسے اقوام متحدہ میں برما کا سفیر نامزد کر دیا۔ چوں کہ برما کرۂ ارض پر غالباً سب سے زیادہ غیر جانب دار ملک تھا، اسے اقوام متحدہ کے سربراہ کے عہدے کے لیے موزوں ترین متفقہ امیدوار سمجھا گیا، اور ۱۹۶۱ میں سیکرٹری جنرل بن گیا۔ بلاشبہ اپنے نیویارک میں ہونے ہی کی بدولت وہ نےون کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے وقت اپنے دوست یو نو کے ساتھ جیل جانے سے بچ گیا۔ یو تھانت کا انتقال ۱۹۷۴ میں نیویارک میں ہوا اور اس کے گھر والے اس کی لاش کو آخری رسوم کے لیے رنگون لے آئے۔ اس کے پوتے تھانت مِنت یو (Thant Myint-U) کو، جس کی عمر اُس وقت نو برس کی تھی، اب تک یاد ہے کہ کیا ہوا تھا۔ "جب ہم ایرپورٹ سے ٹرف کلب گراؤنڈ تک پہنچے، جہاں اُن کی میت کو رکھا جانا تھا، تب تک وہاں سڑک کے ساتھ ساتھ ہزاروں، بلکہ شاید لاکھوں کا مجمع ہو چکا تھا،" اس نے مجھے بتایا۔ "اس سے حکومت خوف زدہ ہو گئی۔ حکام چاہتے تھے کہ آخری رسوم جلد سے جلد پوری کر لی جائیں۔ لیکن لوگ محض کسی قبرستان میں تدفین نہیں بلکہ ایک یادگار کی تعمیر چاہتے تھے۔ تدفین

کے دن ہزاروں طالب علموں اور راہبوں نے تابوت کو گھیر لیا۔ انھوں نے اسے میت گاڑی سے اتار لیا، ٹیکسی میں رکھا اور رنگون یونیورسٹی کیمپس لے گئے۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ عورتیں اپنے زیور اتار اتار کر یادگار کی تعمیر کے لیے عطیے کے طور پر دے رہی تھیں۔ ہمارے پہنچنے کے چار یا پانچ دن بعد فوج نے صبح چار بجے یونیورسٹی پر حملہ کر دیا۔ ہزاروں طالب علموں کو سنگینیں گھونپی گئیں، جن میں سے بہت سے مر گئے۔ یو تھانت کو شویداگون پگوڈا کے نزدیک دس فٹ کنکریٹ کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک ہنگامے ہوتے رہے، لیکن انھیں مارشل لا کے ذریعے کچل دیا گیا، اور حکومت نے ہمارے خاندان کو ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا۔"

یو تھانت کو کسی نہ کسی قسم کی یادگار بہرحال مل گئی۔ میں اس کے مزار پر گیا ___ کنکریٹ کی ایک مایوس کن عمارت جس کی فولادی سلاخوں کے درمیان سے کنکریٹ کے اس موٹے سلیب کو دیکھا جا سکتا ہے جو یو تھانت کی قبر ہے۔ چھت گرنے کو ہے؛ فرش غلیظ ہے؛ احاطے میں کوڑے کرکٹ کا انبار ہے۔ ستمبر ۱۹۸۸ کی خوں ریزی کے بعد جس وقت باقی رنگون کی دیواروں پر سفیدی کی جا رہی تھی، اس عمارت کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا۔

نے ون نے برما پر تین عشروں پر پھیلی ہوئی آمریت کیوں کر مسلط کی، جس کے دوران صرف دو بار بڑے پیمانے پر احتجاج ہوا؟ اس کا جواب جزوی طور پر برمی بدھ مت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں دیا جا سکتا ہے۔ "لوگ نے ون کی بابت جس احترام کے رویے کا اظہار کرتے ہیں، میں اسے ہیبت کے لفظ سے بیان کرتا ہوں، جیسا کہ اسے کلاسیکی مفہوم میں خدا کے بارے میں استعمال کیا جاتا تھا،" جان ہیجلی کا کہنا ہے۔ "برمیوں کا عقیدہ ہے کہ حاکم جس طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے وہ اس کی پیدائشی خوبیوں کا ثمر ہے۔ نے ون نے اپنی خوبیاں پچھلے کئی جنموں میں جمع کی ہیں ___ لوگ جانتے ہیں کہ ایسا ہی ہے، ورنہ وہ اتنے عرصے تک اقتدار پر فائز کیوں کر رہ سکتا تھا۔ اسے نقصان پہنچانے کے بارے میں زبردست خوف پایا جاتا ہے۔ طاقت کو سمجھنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ طاقت اچھے کاموں سے زیادہ بُرے کاموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ زندگی کا پہلا مقصد دُکھ اٹھانا ہے؛ نروان کی خواہش اسی دکھ سے نجات پانے کے لیے ہے۔" لیکن اگرچہ مسلح افواج میں نے ون کے لیے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے، پھر بھی وہ کسی شے کو محض اتفاق کے

رحم و کرم پر چھوڑنے کا قائل نہیں۔ وہ اپنے ماتحتوں کو ___ خصوصاً خفیہ پولیس کے سربراہ کو ___ وسیع اختیارات دیتا ہے، لیکن پھر اچانک انھیں برطرف کر دیتا ہے، اور بعض صورتوں میں جیل بھجوا دیتا ہے۔

۱۹۸۳ میں بریگیڈیر جنرل تِن اُو (Tin Oo) کو، جو کبھی ملٹری انٹیلیجنس کا سربراہ اور نےوِن کا نامزد جانشین تھا، غیر متوقع طور پر برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کا جرم بظاہر سرکاری رقم کا غلط استعمال تھا۔ آج ملٹری انٹیلیجنس کا ایک اور طاقتور سربراہ، بریگیڈیر جنرل کِھن نینت (Khin Nyunt) اپنے انجام کا منتظر ہے۔ چوّن سالہ کھن نینت کو اپنے سے کہیں زیادہ معمر اور بااثر جنرلوں کے معاملات پر نظر رکھنے کے وسیع اختیارات دیے گئے ہیں؛ یہ اپنے ماتحتوں کو غیر متوازن رکھنے کا نےوِن کا مخصوص حربہ ہے۔

نےوِن کے بظاہر نارسا مقام کو دیکھتے ہوئے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ پوری قوم اس کی مخالف ہو جائے، جیسا کہ ۱۹۸۸ میں ہوا۔ لیکن اس کے پچھلے سال ایک ایسا تباہ کن اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا کہ صبر و رضا پر کاربند برمیوں تک کے لیے خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتے رہنا ناممکن ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۸۷ میں حکومت نے اچانک اعلان کیا کہ تین سب سے بڑے ___ یعنی ۷۵، ۳۵ اور ۲۵ کیات کے ___ کرنسی نوٹ اب اپنی قدر کھو چکے ہیں اور ان کی جگہ ۹۰ کیات اور ۴۵ کیات کے نوٹ جاری کیے جا رہے ہیں۔ منسوخ شدہ نوٹوں کو نہ بھُنایا جا سکتا تھا اور نہ ان کے بدلے میں نئے نوٹ حاصل کیے جا سکتے تھے؛ رات بھر میں ان کی قیمت ردّی کاغذ کے برابر رہ گئی تھی۔ اس وقت جتنی کرنسی گردش میں تھی، اس حکم کے باعث اس میں سے ۵۶ فیصد ختم ہو گئی اور بہت سے برمیوں کی زندگی بھر کی بچت بالکل غائب ہو گئی۔ برما میں تقریباً کوئی بھی شخص اپنی بچت بینک میں نہیں رکھتا؛ اپنے اکاؤنٹ میں سے پیسے نکلوانے کے لیے کم و بیش آدھے دن قطار میں کھڑے رہنا پڑتا ہے، اور اگر نکالی جانے والی رقم دو سو ڈالر سے زیادہ ہو تو حکام کے پاس حاضری دے کر انھیں قائل کرنا ہوتا ہے کہ آپ کے پاس اپنی رقم نکلوانے کا کوئی قابلِ قبول جواز موجود ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ برما میں لوگوں کی بچت گھر میں چھپائے ہوئے، بلکہ اکثر صندوقوں میں بھر کر زمین میں دبائے ہوئے، کرنسی نوٹوں کی شکل میں رہتی ہے۔ اب کسی کے پاس کوئی بچت نہ رہی؛ طلبا کے پاس اسکول جانے کے لیے پیسے نہیں

Scanned with CamScanner

تھے؛ جو لوگ ریڈیو، ٹی وی یا پنکھا خریدنے کے لیے کبھی کبھار ایک آدھ نوٹ بچار کھتے تھے، وہ دوبارہ وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔ اس تبدیلی کی کسی کو پہلے سے سُن گن نہ تھی ــــ فوج تک کو نہیں۔ جب میں نے رنگون میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر سے بات چیت کی تو اس نے کہا کہ خود اس کا سولہ سو ڈالر کے برابر نقصان ہوا تھا۔ رنگون میں تعینات ایک مغربی سفارت کار نے کہا، "نےون نے ہر شخص کو گرفت میں لے لیا ــــ خود اپنے وزیروں تک کو، ہر ایک کو۔ صرف فوجیوں کو ایک مہینے کی اضافی تنخواہ دی گئی، اور بس۔"

اس عجیب تبدیلی کی تین توضیحات پیش کی گئی ہیں، لیکن ان میں سے دو ــــ یعنی افراطِ زر پر قابو پانا اور چور بازاری کرنے والوں کو سزا دینا ــــ بالکل لغو ہیں۔ ملک بھر میں گردش کرنے والی رقم کے نصف سے زیادہ کو نیست و نابود کر دینے کو، اصولاً، افراطِ زر ختم کرنے والا اقدام ثابت ہونا چاہیے، لیکن برما میں اس کا بالکل اُلٹ اثر ہوا۔ چوں کہ لوگوں کا اعتبار نقد رقم سے بالکل اٹھ گیا، اب کمائے جانے والے ہر کیات کو وقت ضائع کیے بغیر زمین یا ٹھوس اشیا میں تبدیل کیا جانے لگا، اور قیمتیں کم ہونے کے بجائے بے تحاشا بڑھ گئیں۔ "نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں رہنے والے لوگ، اس ڈر سے کہ کہیں نوٹ دوبارہ منسوخ نہ ہو جائیں، اپنی کمائی سے فوراً کوئی بھی چیز ــــ زمین، چاول پکانے کے برتن، کچھ بھی ــــ خرید لیتے،" ایک ماہرِ معاشیات نے کہا۔ "چناں چہ اگر نےون کے اس اقدام کا مقصد افراطِ زر کو کم کرنا تھا تو اس کے برعکس اس نے مزید افراطِ زر کو جنم دیا۔" جہاں تک چور بازاری کرنے والوں کو سزا دینے کا تعلق ہے، تو نوٹ منسوخ کر دینے کے اقدام کے باعث مادی اشیا کی ایسی شدید اشتہا پیدا ہوئی کہ چور بازار کو زبردست بڑھاوا ملا۔ تیسری توضیح زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ وہ نےون کی افتادِ طبع سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے: کہ اس نے بڑے نوٹوں کی جگہ ۹۰ اور ۴۵ کیات کے نوٹ اس لیے رائج کیے کہ وہ نو کے ہندسے سے خاص رغبت رکھتا ہے۔ نےون کو زندگی بھر علم الاعداد سے گہرا شغف رہا ہے، اور برما میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اُس کا نو کے ہندسے سے قریبی تعلق نکلتا ہے۔ کٹھ پتلی سویلین حکومت کی فوج کے ہاتھوں برطرفی، جس کا نتیجہ اگلے روز طالب علم مظاہرین کے قتل کی صورت میں برآمد ہوا، ۱۸ ستمبر کو، یعنی نویں مہینے کے اٹھارویں دن پیش آئی۔ یومِ مسلح افواج ۲۷ مارچ کو منایا جاتا ہے۔ جب حکومت نے سیاسی پارٹیوں کو ۱۹۹۰ کے اعلان کردہ انتخابات کی تیاری کے سلسلے میں

رجسٹریشن کرانے کی اجازت دی تو نویں، اٹھارویں اور ستائیسویں نمبر پر رجسٹر کی جانے والی پارٹیاں حکومت کی حامی تھیں۔ نو کا ہندسہ ہی کیوں؟ برمی زبان سے واقفیت رکھنے والے ایک مغربی سفارت کار کا کہنا ہے، "نو کا عدد محض خوش قسمتی ہی کی علامت نہیں۔ یہ ایک طاقتور عدد ہے جسے فتح کرنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ یہ آپ کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔"

لیکن بہت کم برمی باشندے ۹۰ کیات اور ۴۵ کیات کے نوٹ اپنے قبضے میں رکھ کر نو کے عدد پر فتح پانے کو تیار ہوے؛ وہ تو ان نوٹوں کو کسی سے لینے کو بھی تیار نہ ہوتے تھے کہ کیا معلوم کب یہ نوٹ بھی منسوخ ہو جائیں۔ میں نے رنگون کے ریستورانوں میں بہت سے لوگوں کو اپنے بِل چھوٹی مالیت کے نوٹوں کی گڈیوں کی شکل میں ادا کرتے دیکھا۔ ایک شخص کو، جس سے میری بات ہوئی، ایک لاکھ کیات ٹرین کے سفر میں اپنے ساتھ لے جانے تھے تاکہ اسمگل شدہ جواہرات خرید سکے؛ وہ چھوٹے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا ایک بڑا شاپنگ بیگ اپنے ساتھ ٹرین پر لے گیا۔ ایک ماہرِ معاشیات نے مجھے بتایا کہ وہ ایسے لوگوں سے واقف ہے جنھیں بڑی نقد رقموں کی ضرورت پڑتی ہے اور جنھوں نے اب اپنے گھر کا ایک کمرہ نقدی رکھنے کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

برمی عوام کے لیے، جو برسوں سے ایک کے بعد دوسری ذلت برداشت کرتے چلے آ رہے تھے، یہ اقدام، جس نے ان کی بچتوں کو نیست و نابود کر ڈالا، برداشت کی حد تھا۔ نوٹوں کی منسوخی نےون کے طویل دورِ حکومت میں وہ پہلا موقع ثابت ہوا جب لوگ احتجاج کرنے کے لیے مقررہ وقفوں سے سڑک پر نکلنے لگے۔ اگر نےون کی نو کے عدد سے وابستگی ہی اس اقدام کا اصل سبب تھی، تو مارچ ۱۹۸۸ میں ہونے والے ایک اُتنے ہی غیر از معمول واقعے نے مسئلے کو اور گمبھیر کر دیا۔ رنگون انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کے نزدیک ایک چائے خانے میں کچھ طالب علموں نے ملازموں سے اس بات پر تکرار شروع کر دی کہ ٹیپ ریکارڈر پر کون سی موسیقی بجائی جائے، اور دونوں فریق ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ پولیس بلوائی گئی اور اس نے آ کر نہایت سفاکی کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا؛ اس نے طلبا اور طالبات پر بے تحاشا لاٹھیاں برسا کر انھیں فرش پر گرا دیا جس کے نتیجے میں ایک طالب علم ہلاک ہو گیا۔ کچھ طلبا کو گرفتار کر کے ایک پولیس وین میں ٹھونس دیا گیا۔ وین کو گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رکھا گیا، اور اکتالیس طلبا دم گھٹنے سے مر گئے۔

ان اموات نے بظاہر نے ون تک کو ہلا کر رکھ دیا، کیوں کہ اس نے اس واقعے کی برسرِ عام معافی مانگی۔ (تاہم اس بات پر تھوڑی بہت بحث ضرور ہوئی کہ آیا نے ون کے صدمے کا سبب اموات تھیں یا یہ کہ دم گھٹنے کے واقعے کو اس سے پوشیدہ رکھا گیا۔) اس واقعے کے نتیجے میں رنگون کی سڑکوں پر کچھ فسادات بھی ہوئے جن کے دوران مرنے والوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی۔ سفارت کاروں نے بیان کیا کہ مارچ میں پولیس کی بربریت اس بات کا بڑا سبب تھی کہ طالب علموں کی حمایت معاشرے کے دوسرے عناصر تک پھیل گئی۔ پھر ۲۱ جون کو طالب علموں اور پولیس کے درمیان ایک اور لڑائی ہوئی؛ یہ اس وقت شروع ہوئی جب ایک ہزار طالب علموں نے، رنگون یونیورسٹی کیمپس میں کانووکیشن ہال کے سامنے ایک سیاسی احتجاجی جلسے کے بعد، رنگون کے مرکزی علاقے کی طرف مارچ کیا۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق اس لڑائی میں پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے طالب علموں کی تعداد کئی سو رہی ہو گی، اور "ایک موقعے پر پولیس نے پُرامن مظاہرہ کرنے والے ہائی اسکول کے طلبا کے ایک گروپ پر تین ٹرک چڑھا دیے جس سے چار یا پانچ طلبا ہلاک ہوے۔" اس احتجاج کے جواب میں حکومت نے ملک کی تمام یونیورسٹیاں بند کر دیں؛ چند روز بعد تمام اسکول بھی بند کر دیے گئے۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۸ کو نے ون نے رنگون میں برما سوشلسٹ پروگرام پارٹی کے ایک خصوصی اجلاس سے خطاب کیا۔ "چوں کہ میں بالواسطہ طور پر مارچ اور جون میں ہونے والے واقعات کا ذمے دار ہوں، اور چوں کہ میری عمر بھی بہت زیادہ ہو چکی ہے، میں پارٹی کے چیئرمین کے عہدے سے، اور رکنیت سے بھی، استعفیٰ دے رہا ہوں،" اس نے مندوبین کو بتایا۔ اس نے کہا کہ دو مہینوں کے عرصے میں ایک ریفرنڈم منعقد کرایا جائے گا تاکہ یہ طے کیا جا سکے کہ لوگ کثیر جماعتی نظام چاہتے ہیں یا نہیں، اور اگر چاہتے ہیں تو اس کے بعد انتخابات کرائے جائیں گے۔ "ریفرنڈم کا خواہ کچھ بھی نتیجہ نکلے، اور نئی حکومت کسی بھی طرح کی ہو، میں سیاست سے مکمل طور پر ریٹائر ہو جاؤں گا،" اس نے کہا۔ اس کے یہ فقرے محض لغوی مفہوم نہیں رکھتے تھے، جیسا کہ کسی مغربی ملک میں ہوا ہوتا۔ دراصل یہ ایک تفصیلی فریب کا آغاز تھا۔ اس شے کو جان بیچلی برمی تھیئٹر کا نام دیتا ہے ___ یعنی ایک ایسا کھیل جس کی قیمت ہزاروں انسانی جانوں میں ادا کی گئی، جس نے برما کو انتشار کی صورت حال میں دھکیل دیا، اور جس کا نتیجہ ایک ایسی پولیس اسٹیٹ کی

Scanned with CamScanner

صورت میں برآمد ہوا جو ملک میں اس سے پہلے کی کسی بھی حکومت سے کہیں زیادہ جابرانہ تھی۔ اس ڈرامے کی ہدایت کاری نےوِن نے اِنیا جھیل کے کنارے واقع اپنے گھر سے کی جہاں وہ "ریٹائرمنٹ" کی زندگی گزار رہا تھا۔

یہ خیال کہ نےوِن کی یہ ریٹائرمنٹ تالیفِ قلب کے مقصد سے ہے، فوراً ہی غلط ثابت ہو گیا جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ریاست کے سربراہ کے طور پر اس کی جگہ جنرل سائن لوِن (Sein Lwin) کا تقرر ہوا ہے جس سے برما بھر میں سب سے زیادہ نفرت کی جاتی ہے۔ سائن لوِن نے، جسے قصّاب (Butcher) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، نےوِن کی آمریت کے تین سفاک ترین اقدامات کی نگرانی کی تھی: ۱۹۶۲ میں اسٹوڈنٹس یونین کی عمارت کو بم سے اُڑانا، ۱۹۷۴ میں یوتھانت کی تدفین کے موقعے پر خوں ریزی، اور مارچ ۱۹۸۸ میں ہونے والے مظاہروں کو کچلنا۔ اس کے اقتدار سنبھالنے کے دو ہفتوں کے اندر اندر دسیوں ہزار برمی رنگون، منڈالے اور دوسرے شہروں کی سڑکوں پر نکل آئے۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی تیار کردہ انسانی حقوق کی ایک رپورٹ میں ۸ اگست اور ۱۳ اگست کی درمیانی مدت میں ہونے والے واقعات بیان کیے گئے ہیں:

> فوجیوں نے سائن لوِن کے اقتدار سنبھالنے کے خلاف احتجاج کرنے والے پُرامن اور نہتے مظاہرین پر فائر کھول دیا۔ متعدد عینی شاہدوں کے بیانات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ فوجیوں نے مظاہرین کا تعاقب کر کے انھیں ہلاک کیا اور تماشائیوں پر اور اردگرد کے مکانوں کے اندر بھی اندھادھند فائرنگ کی۔ ۱۰ اگست کو فوجیوں نے رنگون جنرل اسپتال کے سامنے ڈاکٹروں، نرسوں اور دوسرے لوگوں کے ایک گروپ پر فائرنگ کر کے کئی ڈاکٹروں اور نرسوں کو ہلاک کر دیا جو اُن سے فائرنگ روکنے کی استدعا کر رہے تھے... رنگون کے مضافات میں واقع مزدور بستی نارتھ اوکالاپا میں ۱۰ اگست کو ہونے والے واقعات کے چار الگ الگ عینی شاہدوں نے تفصیل سے بیان کیا کہ کس طرح ایک کیپٹن کے احکام پر فوجی قطار بنا کر اور ایک گھٹنا سڑک پر ٹکا کر جنگی ترتیب میں کھڑے ہو

گئے اور مظاہرین پر لگاتار فائرنگ کرتے رہے۔ سب سے پہلے گولیوں کی زد میں آنے والی پانچ یا چھ نوعمر لڑکیاں تھیں جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں بینر اور برما کے مقتول قومی رہنما آؤں ساں کی تصویریں اٹھار کھی تھیں۔ چاروں عینی شاہدوں نے بہت لوگوں کے ہلاک اور زخمی ہونے کا ذکر کیا اور ان کی تعداد کا اندازہ سیکڑوں میں لگایا۔ ۸ اور ۱۰ اگست کے درمیانی عرصے میں رنگون کے دیگر علاقوں میں بھی عینی شاہدوں نے اسی قسم کے واقعات کی رپورٹیں دیں۔ اموات کی کل تعداد اغلب یہ ہے کہ دو ہزار سے زیادہ رہی ہو گی، لیکن اصل تعداد کا کبھی پتا نہ چل سکے گا۔ اکثر صورتوں میں فوجیوں نے فائرنگ کا کام ختم کرتے ہی اپنی گولیوں کا شکار ہونے والوں کو گھسیٹ کر لے جانا شروع کر دیا تاکہ انھیں اجتماعی طور پر ٹھکانے لگا کر قتل ہونے والوں کی تعداد کو چھپایا جا سکے۔

اُن دنوں ڈاکٹر تن میو ون رنگون جنرل اسپتال میں سرجن کے طور پر کام کرتا تھا؛ اس سے پہلے وہ مظاہرین پر فائرنگ کے خلاف احتجاج میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی قیادت کر چکا تھا۔ وہ میرے رنگون میں قیام کے دوران مجھ سے ملنے پر رضامند ہو گیا اور اس نے باقاعدہ اصرار کیا کہ اس کا ذکر نام لے کر کیا جائے۔ ڈاکٹر تن میو ون، جس کی عمر چالیس سال ہے، کبھی برما سے باہر نہیں نکلا ہے، لیکن اپنے ہموار، پیشہ ورانہ لہجے میں رواں انگریزی بولتا ہے۔ اس نے سائن لوئن کے خلاف ہونے والے مظاہروں کے دنوں کے ایک واقعے کی تفصیل یوں بیان کی: "۱۲ اگست کو رات گیارہ بجے دو ٹرک، جنھیں فوجی چلا رہے تھے، اسپتال کے پاس آ کر رکے۔ ان ٹرکوں کے پچھلے حصے میں طالب علموں کی لاشوں کے ڈھیر تھے۔ ان میں سے بعض کو سہ پہر تین یا چار بجے قتل کیا گیا تھا، اور اب انھیں اسپتال لایا جا رہا تھا۔ فوجیوں نے اس تاخیر پر میرے احتجاج پر قطعی توجہ نہ دی؛ انھوں نے کہا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے اور محض احکام کی پابندی کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے زیر تربیت طلبا سے ٹرکوں میں جا کر دیکھنے کو کہا کہ ان میں کوئی زندہ ہے یا نہیں۔ کسی زندہ شخص کی تلاش میں لاشوں کے ڈھیر کو اُلٹنا پلٹنا ایک ہولناک منظر تھا۔ کچھ افراد کے پیٹ

Scanned with CamScanner

میں گولی ماری گئی تھی اور ان کی آنتیں باہر نکل پڑی تھیں۔ میرے شاگرد ڈھیر میں سے کوئی ٹانگ کھینچتے اور یہ پتا چلانے کی کوشش کرتے کہ یہ کس بدن کا حصہ ہے۔ چالیس افراد میں سے بارہ اس وقت تک زندہ تھے۔ ہم ان میں سے چار کی جان بچا سکے۔"

دواؤں وغیرہ کے ذخیرے کے لحاظ سے اسپتال کی حالت اُس وقت بھی بہت خراب تھی، اور مظاہروں کے وسط ستمبر تک جاری رہنے پر صورتِ حال اور ابتر ہو گئی۔ "میں نے رنگون جنرل اسپتال میں صرف دس برس کام کیا،" ڈاکٹر تن میووِن نے کہا۔ "اس پورے عرصے میں ہمیں ہر لحاظ سے ـــ خواہ وہ دوائیں ہوں یا سہولتیں یا کتابیں ـــ قلت کا سامنا رہا۔ بے ہوش کرنے کی گیسوں کی قلت کے باعث ہمیں ریڑھ کی ہڈی میں لگائے جانے والے انجکشنوں سے کام چلانا پڑتا۔ سرجری کے لیے چاقو اور قینچیاں بھی ناکافی تھیں۔ ایکسرے مشینوں کے لیے فلمیں نہیں تھیں، اور یہ ہمیں چور بازار سے خریدنی پڑتیں۔ اسپتال میں موجود واحد اینٹی بایوٹک دوا پینیسلِن تھی۔ کسی مریض کو دواؤں کی ضرورت ہوتی تو ہم اس کے گھر والوں کو بھیج کر چور بازار سے دوائیں منگواتے۔ اگر ان کے پاس رقم کم ہوتی تو مریض کو سب کچھ برداشت کرنا پڑتا؛ کئی بار ایسا ہوا کہ آپریشن تو کامیاب رہا لیکن مریض دواؤں کے نہ ملنے کے باعث مر گیا۔ میڈیسن کے طالب علموں کے لیے درسی کتابیں دستیاب نہ تھیں؛ انھیں لیکچر نوٹس پر انحصار کرنا پڑتا۔ سرجری کے چار سو طلبا کو اسپتال کا راؤنڈ کرانے کے لیے صرف چار کلینیکل ٹیوٹر تھے۔ میرے کچھ شاگرد اب دو فوجی اسپتالوں میں اسپیشلسٹوں کے طور پر تعینات ہیں۔ ان کے پاس اپنی ضرورت کی تمام دوائیں اور آلات موجود ہیں۔" مظاہروں کے کچھ ہی عرصے بعد ڈاکٹر تن میووِن نے رنگون جنرل اسپتال چھوڑ دیا اور ایک پرائیویٹ کلینک میں سرجری کی پریکٹس شروع کر دی۔ "بہت سے ڈاکٹروں کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا، نرسوں کو بھی، کیوں کہ انھوں نے پُرامن احتجاج میں حصہ لیا تھا،" اس نے مجھے بتایا۔ "مجھے معلوم تھا وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گے، سو میں نے خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ اب بہت سے اسپیشلسٹ ڈاکٹر اور پروفیسر ملک چھوڑ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

مظاہرے روکنے کے لیے سائن لوئن کے حربے ناکام ہو گئے، اور ۱۹ اگست ۱۹۸۸ کو (اس تاریخ یعنی ۱۹/۸ کے اعداد کا حاصل جمع نو پر پورا تقسیم ہو جاتا ہے)، نےوِن نے حکومت کو ایک بار پھر تبدیل کرنے کا اعلان کیا۔ سائن لوئن کی جگہ، جو نےوِن کے تمام سخت گیر ساتھیوں

میں سب سے زیادہ سخت گیر تھا، یو ماؤنگ ماؤنگ (U Maung Maung) کو لایا گیا جسے سب سے زیادہ نرم مزاج سمجھا جاتا تھا۔ ماؤنگ ماؤنگ، جو نے وِن کی کابینہ میں اٹارنی جنرل رہ چکا تھا، اس لحاظ سے اس پوری حکومت کا منفرد رکن تھا کہ اس نے مغربی تعلیم پائی تھی۔ اس نے لندن اور ہالینڈ میں قانون پڑھا تھا اور ییل (Yale) میں دو برس پڑھا بھی چکا تھا۔ وہ نے وِن کی ایک سوانح کا مصنف تھا اور امریکی رسالے "دی نیشن" سمیت کئی رسالوں کے لیے مضامین لکھ چکا تھا۔ ماؤنگ ماؤنگ نے اب تین ماہ کے اندر انتخابات کرانے کا ایک منصوبہ پیش کیا، اور پارلیمنٹ نے ووٹنگ کے عمل کی نگرانی کے لیے حکومت سے وابستہ کئی معمر لوگوں کے نام تجویز کیے۔ حزبِ مخالف کے رہنماؤں نے انتخابات کا یہ منصوبہ مسترد کر دیا اور ماؤنگ ماؤنگ کے استعفے اور انتخابات کے انتظامات کے لیے ایک نگراں حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ماؤنگ ماؤنگ پر، جو اتنے طویل عرصے تک نے وِن کا قریبی اور وفادار ساتھی رہ چکا تھا، کسی کو بھروسا نہ تھا، اور اس بات پر بھی کوئی سنجیدگی سے یقین نہیں کرتا تھا کہ معاملات اب تک نے وِن کے کنٹرول میں نہیں ہیں۔

***

ماؤنگ ماؤنگ کے دورِ حکومت میں، جو صرف ایک ماہ پر محیط ہوا، برما میں ایک نہایت غیر معمولی بات واقع ہوئی، اور کوئی بھی یقین سے اس کی وجہ نہیں بتا سکتا۔ جوں جوں مظاہرین جمہوریت کا مطالبہ کرتے ہوئے سڑکوں پر نکلتے گئے، حکومت نے آہستہ آہستہ کام کرنا چھوڑ دیا۔ پہلے پہل یہ ہوا کہ فوجی احتجاجی مظاہروں کا تماشا دیکھتے رہتے اور کوئی کارروائی نہ کرتے؛ چند روز بعد [illegible] نے خاردار تاروں کی بنی رکاوٹیں لپیٹیں، اپنے ٹرکوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور نظر آنا بند ہو گئے۔ طلبا اور راہب جو پورے سال فوج کی لاٹھیوں اور گولیوں کو بڑی بہادری سے سہتے آ رہے تھے، اب انھیں ڈاکٹر، وکیل، فلمی اداکار، اخبار نویس، اور، سب سے اہم بات یہ کہ، مزدوروں کے ہجوم اپنے دوش بہ دوش کھڑے دکھائی دیے۔ پھر سرکاری اہلکار بھی اپنے اپنے دفتروں سے نکل کر مظاہروں میں شامل ہونے لگے۔ آخر میں پولیس، ایئرفورس اور نیوی کے

کچھ ملازمین بھی ان سے آملے اور ان کا پُر مسرت نعروں کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ پانچ لاکھ برمی باشندے سرخوشی کے عالم میں رنگون کی سڑکوں پر، ویران سرکاری دفتروں کے پاس سے، گزر رہے تھے۔ مظاہروں کا مرکز امریکی سفارت خانہ تھا۔ جب امریکی سفیر، برٹن لیون، اپنی سرکاری گاڑی میں امریکی پرچم لہراتا گزرتا تو ہجوم استقبالیہ نعرے لگاتا؛ جیساکہ برمی عوام جانتے تھے، ریاست ہائے متحدہ امریکا نے سب ملکوں سے پہلے سائن لوین کی حکومت کی جانب سے کی جانے والی خوں ریزی کی مذمت کی تھی۔ ہر روز سفارت خانے کے سامنے والی سڑک پر تقریریں کی جاتیں۔ ان تقریروں کا موضوع جمہوریت ہوتا تھا، اور امریکا ہر اُس شے کی علامت بن گیا جو برمیوں کو درکار تھی اور ان کے پاس نہیں تھی۔ کچھ مظاہرین امریکی جھنڈے اٹھائے ہوئے ہوتے، اور ایک موقعے پر طلبا کا ایک گروپ سفارت خانے کی عمارت کے صدر دروازے پر پہنچا اور انھوں نے گیٹس برگ والی تقریر انگریزی میں لفظ بہ لفظ سنائی۔

اور اچانک، سخت سنسرشپ کے تین عشروں کے بعد، برما میں پریس بھی آزاد ہو گیا۔ درجنوں اخبار نہ جانے کہاں کہاں سے نکلنے لگے جنھوں نے سرکاری اخبار "ورکنگ پیپلز ڈیلی" کے خشک اور یکساں انداز سے متضاد صحافت کا نمونہ پیش کیا۔ اس سے پہلے "ورکنگ پیپلز ڈیلی" کے صفحۂ اول پر اس قسم کی بڑی بڑی سرخیاں چھپتی تھیں: "صدر یو سان یو کا حکومتِ مصر کو پیغامِ مبارکباد۔" (برما میں صدر کا عہدہ، ۱۹۸۱ میں نےون کے صدارت چھوڑنے کے بعد سے محض رسمی ہو گیا تھا۔) اب لوگوں کو بہت مختلف قسم کی خبریں پڑھنے کو مل رہی تھیں۔ نئی نئی آزادی پائے ہوئے اخبار نویسوں نے اس بے مثال موقعے کا فائدہ اٹھانے میں ذرا دیر نہ کی اور نےون پر تنقید شروع کر دی۔ "عیاشوں کا بادشاہ،" ایک اخبار میں سُرخی لگائی گئی، اور متن میں بتایا گیا کہ اس نے ایک نوخیز لڑکی سے شادی کی ہے جو اس کی بیٹی کی ہم عمر ہے۔ ایک کامک اسٹرپ میں نےون کو خطاب کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا؛ پہلی دو تصویروں میں ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اور تیسری تصویر میں بندوق چلاتے ہوئے۔ تصویروں کے کیپشن تھے: "خلوص اور مہربانی بہت عمدہ چیزیں ہیں"، "محبت اور دوستی انسانوں کے طرزِ عمل کی خصوصیات ہیں"، اور "لیکن مجھے قتل کرنے کا شوق ہے۔" ایک اخبار پورا کا پورا برمی زبان میں تھا، سوائے بہت بڑی سرخی کے جو انگریزی میں تھی:

Wanted Dead or Alive Nga Myaing

نگا میانگ نےون کے نجومی کا نام ہے، اور بہت سے برمی نےون کی درازیِ عمر کا ذمے دار اسی کے مشورے کو ٹھہراتے ہیں۔ سرکاری اخبار "ورکنگ پیپلز ڈیلی" تک، جس کا ہر روز ایک ایڈیشن برمی اور ایک انگریزی میں شائع ہوتا ہے، زیادہ معروضی انداز میں خبریں چھاپنے لگا۔ اس کی سرخیاں اس طرح کی ہونے لگیں:

Peaceful Demonstrations Continue with Calls for Democracy

لیکن اس تمام سرخوشی کے عقب میں خطرہ موجود تھا۔ اگرچہ حکومت نے کام کرنا بند کر دیا تھا لیکن یہ اطلاع خفیہ پولیس ـــ یعنی ڈائرکٹریٹ آف ڈیفنس سروسز انٹیلیجنس ـــ تک نہ پہنچی تھی۔ "ڈی ڈی ایس آئی کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں،" ایک مغربی سفارت کار کہتا ہے۔ "اس بات کے بے شمار اشارے ملتے ہیں کہ اس ادارے کو ہر شخص کے بارے میں فکر ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کے دفاتر میں لوگوں سے گھنٹوں پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ اس کے لوگ ایرپورٹ پر کسٹم کے عملے میں بھی شامل ہیں؛ وہ سفارت کاروں کے لائے ہوئے سامان کو بھی مشکوک انداز میں دیکھتے ہیں۔" دوسری خطرناک علامت یہ تھی کہ احتجاج کرنے والوں کے پاس کوئی قیادت نہ تھی۔ "عوامی طاقت" کے مظاہروں کی پشت پر طلبا کی قوت تھی، لیکن اب تھوڑی بہت آزادی پانے کے بعد ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آگے کیا کیا جائے۔

اپریل ۱۹۸۹ میں میں نے اس موضوع پر یوزانہ کھِن (Yuzana Khin) سے گفتگو کی جو تب آل برما فیڈریشن آف اسٹوڈنٹس یونینز کی خزانچی کے طور پر ایسے طالب علم رہنماؤں میں سے ایک تھی جو اُس وقت تک زندہ اور جیل سے باہر تھے۔ رنگون یونیورسٹی میں نفسیات کے دوسرے سال کی طالبہ، یوزانہ کھِن، جب میں اس سے ملا، بینکاک میں روپوش تھی۔ (ایک ہزار سے دو ہزار تک برمی طلبا سرحد پار کر کے تھائی لینڈ میں جا چھپے تھے، اور ان میں سے کئی سو بینکاک میں رہ رہے تھے۔ چھ ہزار کے قریب طلبا نے تھائی سرحد کے قریبی علاقے میں، جو باغیوں کے کنٹرول میں تھا، مون اور کارین نسلی اقلیتوں کے پاس پناہ حاصل کر لی تھی۔) "ہم جانتے تھے کہ موجودہ حکومت کے تحت کسی تعمیری تبدیلی کا آنا ناممکن ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ "لیکن ہمیں اندازہ ہوا کہ بیرونی دنیا کے بارے میں ہمارا علم نہایت محدود ہے۔ ہم موجودہ حکومت کا تختہ الٹ

Scanned with CamScanner

کر اقتدار ایسے لوگوں کے سپرد کرنا چاہتے تھے جو نئی حکومت بنا سکیں۔ ہم دن بھر جلسے کرتے لیکن ہمارے منصوبے محض موجودہ حکومت کے خاتمے تک محدود تھے۔" تاہم، حزبِ مخالف نہایت منتشر تھی: جب یو نو نے، جس کی عمر تب بیاسی برس اور صحت بہت خراب تھی، ایک عبوری حکومت ترتیب دینے کی کوشش کی تو اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آوَن سان سُوچی (Aung San Suu Kyi) کو، جو کچھ عرصے بعد حزبِ مخالف کی رہنما بننے والی تھی، ستمبر ۱۹۸۸ میں مظاہرین کے قتل کے بعد ہی سیاسی قوت حاصل ہوئی۔ پہلی بار اس نے ۲۶ اگست کو پہلی بار عوام سے خطاب کیا۔ جہاں تک طالب علموں کا تعلق ہے، وہ ایک خواب کی سی کیفیت میں عمل کر رہے تھے ـــ ان کا خیال تھا کہ امریکا برما کو بچانے کے لیے مداخلت کرے گا۔ "ہمیں امید تھی کہ ایک عبوری حکومت قائم ہو جائے گی اور ہتھیار اور گولا بارود، یہاں تک کہ فوجی بھی، امریکا سے مل جائیں گے،" یوزانہ کھِن نے کہا۔

ستمبر ۱۹۸۹ میں مجھے یوزانہ کھِن سے دوبارہ ملاقات کا موقع ملا، اور اس بار بہت مختلف ماحول میں۔ نو مہینوں کی شدید جدوجہد اور امریکی ایوانِ نمائندگان کے رکن اسٹیفن جے سولارز اور نیویارک کے سینیٹر ڈینیل پیٹرک موئنیہان کی عملی مدد سے اسے آخرکار امریکی ویزا مل گیا تھا، اور میں اس سے سان فرانسسکو ایرپورٹ پر ملا جہاں سے وہ طالبہ کے طور پر اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لیے واشنگٹن ڈی سی جاتے ہوئے گزر رہی تھی۔ اس کے آنے سے ہفتہ بھر پہلے "نیویارک ٹائمز" نے تھائی لینڈ میں پناہ لینے والے برمی طالب علموں سے امریکا کے سخت گیر رویّے کے بارے میں ایک اداریہ تحریر کیا تھا؛ بعض صورتوں میں بینکاک میں امریکی سفارت خانہ ویزا کے خواہش مند برمی طالب علموں کو مشورہ دیتا کہ وہ ضروری کاغذات حاصل کرنے کے لیے رنگون واپس جائیں ـــ یہ ایسا مشورہ تھا جس پر عمل کرنے کے نتیجے میں انھیں سزائے موت سے سابقہ پڑ سکتا تھا۔ "ایک طرف بُش انتظامیہ خطرے کی زد میں آئے ہوئے چینی جمہوریت پسندوں کو پناہ دیتی ہے، اور دوسری طرف میانمار سے آنے والوں سے سرد مہری کا سلوک کرتی ہے،" اداریے میں کہا گیا تھا۔ "واشنگٹن نے برمی طلبا کی ان اپیلوں کو مسترد کر دیا کہ تھائی حکومت کو انھیں برما واپس بھیجنے کی کوششوں سے باز رکھا جائے۔ کیوں؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ واشنگٹن کو منشیات کے کاروبار روکنے کے سلسلے میں برمی فوج کا تعاون درکار ہے؟ بے پناہ بدعنوانی کے باعث اس فوج کا

Scanned with CamScanner

اعتبار پہلے ہی سے نہایت مشتبہ ہو چکا ہے۔ ایسی رپورٹیں بھی ہیں کہ برمی فوجی افسروں اور منشیات کی دنیا کے بادشاہوں کے درمیان ویسے ہی تعلقات موجود ہیں جیسے نوریگا (Noriega) کے تھے۔ یا پھر اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کو اس بات کی فکر ہے کہ کہیں تھائی لینڈ ناراض نہ ہو جائے جس کے میانمار کے ساتھ نئے اور منافع بخش تجارتی روابط قائم ہو گئے ہیں؟"

۱۹۸۸ کے موسم گرما میں رنگون کے طلبا اس امید کے ہر تنکے کا سہارا لینے پر آمادہ تھے کہ امریکا مداخلت کرے گا۔ اسٹیفن سولارز کو، جو اس وقت ایشیا اور بحرالکاہل کے امور کی ہاؤس سب کمیٹی کا سربراہ تھا، برما میں ایک قسم کے قومی ہیرو کی سی حیثیت حاصل ہو گئی تھی کیوں کہ اس نے ایوان سے برمی طالب علموں کے حق میں ایک قرارداد منظور کرالی تھی۔ رنگون میں گردش کرنے والی ایک بے بنیاد کہانی میں بتایا گیا تھا کہ امریکی سفیر لیون نے طبی اشیا کا عطیہ رنگون جنرل اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کی تھی: ایک طالب علم نے مجھے نہایت تفصیل سے بتایا کہ کس طرح لیون نے اسپتال کے پھاٹک پر متعین ایک سپاہی سے تکرار کر کے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ایک زیرزمین اخبار کی سرخی تھی: "امریکی بحری بیڑا برما کے سمندر میں داخل ہو گیا۔"

طالب علموں اور دوسرے لوگوں کو بغاوت کی یہ فضا نہایت خوشگوار محسوس ہوئی ہو گی، لیکن اس کی کوئی مضبوط نظریاتی بنیاد نہ تھی۔ طلبا کو اس کا بہت ہی مبہم سا اندازہ تھا کہ جمہوریت کیا ہوتی ہے؛ انھوں نے کبھی مغرب کا سفر نہیں کیا تھا، اور زندگی بھر نےون کے زیر تسلط برما کے سوا ان کا کسی اور نظام کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ وہ کس چیز کے مخالف ہیں ــــ سوشلزم اور کمیونزم کے، کیوں کہ ان دونوں کا معاشی نظام نےون کے برما سے گہری مماثلت رکھتا تھا۔ اور وہ یہ جانتے تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں ــــ آزادی، جس کی مثال امریکا ہے۔ بس، اتنا کافی تھا۔ "حیرت ہے کہ آپ امریکا سے آئے ہیں اور مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ مجھے جمہوریت کیوں چاہیے،" ایک زرعی گاؤں میں چاول چھڑنے والے ستر سالہ شخص نے سخت مایوس ہو کر مجھ سے کہا۔ "جمہوریت اور سوشلزم کا فرق ہر شخص کو معلوم ہے: سوشلسٹ ملکوں میں صرف بندوقیں اور گولیاں ملتی ہیں۔ یہ بات صرف شہر والوں ہی کو نہیں، ہم دیہاتیوں کو بھی معلوم ہے۔" اس کے گھر میں ایک میز پر ایک کتاب رکھی تھی جسے یو ایس آئی ایس والوں نے برمی زبان میں ترجمہ کرا

کے شائع کرایا تھا: مشہور امریکی تاجر لی ایاکوکا (Lee Iacocca) کی سوانح حیات۔

خفیہ پولیس کی سرگرمیوں میں اضافے کے علاوہ، آزادی کے اس مہینے کے دوران رنگون میں ایک اور پریشان کن واقعہ پیش آیا۔ ۱۲ اگست سے پہلے کے ہفتے میں حکومت نے ملک بھر کی جیلوں کو خالی کروا لیا؛ دروازوں کے تالے کھول دیے گئے اور قیدیوں کو باہر نکل جانے دیا گیا۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ اس مہینے کے تمام واقعات کی ہدایت کاری نےون نے کی تھی، وہ قیدیوں کی اس رہائی کو اپنے خیال کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس کا مقصد، ان کے نزدیک، رنگون کی صورتِ حال کو اس حد تک مخدوش کر دینا تھا کہ فوج کو طلب کرنا ضروری ہو جائے۔ اگر منصوبہ یہی تھا تو اسے مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔ قیدیوں کے پاس نہ پیسے تھے اور نہ کوئی کام، چناں چہ انھوں نے رہا ہو کر وہی ایک کام شروع کر دیا جو انھیں آتا تھا: وہ جرائم کرنے لگے۔ سرکاری گودام اور کارخانے لُوٹ لیے گئے؛ چوروں کو اقوام متحدہ کے غذا اور زراعت کے ادارے کے دفتر سے ایر کنڈیشنر اور دفتری آلات چرا کر لے جاتے دیکھا گیا۔ اور یہ سرگرمیاں صرف قیدیوں تک محدود نہ رہیں۔ ایک طالب علم نے، جو لوٹ مار کے مناظر دیکھ چکا تھا، مجھے بتایا، "لوگوں کو محض زندہ رہنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی جبکہ سرکاری اہلکاروں کو خصوصی دکانوں پر رعایتی اشیا حاصل ہوتی تھیں۔ لہٰذا اب جوان کو موقع ملا تو انھوں نے دکانوں کو تباہ کر دیا اور تمام سامان سڑکوں کے کنارے کھڑے ہو کر بیچ ڈالا۔ دکانیں لُٹنے کے پہلے دن میں نے بیس انچ کا ایک ٹی وی پچہتر ڈالر میں اور جانی واکر کی ایک لٹر کی بوتل ایک ڈالر میں بکتے دیکھی۔ اس علاقے کو جہاں یہ چیزیں بک رہی تھیں، لوگوں نے سائن لوئن مارکیٹ کا نام دے دیا تھا۔" مجرموں سے محفوظ رہنے کے لیے محلّوں میں لوگوں نے بانسوں کی رکاوٹیں بنالی تھیں۔ ہر محلّے کی ایک کمیٹی بن گئی تھی جس کے لوگ باری باری گشت پر نکلتے تھے۔ "جِنگلیوں" کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی — جِنگلی سائیکل کے پہیوں کی تیز کی ہوئی تیلیوں کو کہتے ہیں جنھیں تیر کی طرح غلیل سے چھوڑا جاتا ہے۔ بعض محلّوں میں غضب ناک ہجوموں نے ایسے افراد پر حملے کیے جن پر سرکاری مخبر ہونے کا شبہ تھا، اور ان میں سے چند کی گردن کاٹ ڈالی گئی۔

اس تمام عرصے میں، جب برما میں اخبار نویسوں اور سیاحوں کا داخلہ ممنوع تھا، دنیا کو وہاں کی خبریں رنگون میں واقع مغربی سفارت خانوں کے توسّط سے مل رہی تھیں؛ بینکاک میں مقیم صحافی

Scanned with CamScanner

ہر روز فون پر سفارت کاروں کا انٹرویو کرتے۔ لیکن منڈالے کی خبر حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ منڈالے ـــــ بودھ راہبوں کی کوششوں سے جن کا یہاں ہمیشہ سے گہرا اثر رہا ہے ـــــ اُس لوٹ مار سے بالکل محفوظ رہا۔ راہبوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ "امن و امان" کا قیام، جس کی باتیں برمی حکام ہر وقت کرتے رہتے ہیں، جبر کے بغیر ممکن ہے۔ مجھے منڈالے میں ہونے والے واقعات کا پتا اس وقت چلا جب میں نے ایک امریکی طالب علم کو ڈھونڈ نکالا جو بودھ مت کی تعلیم حاصل کرنے برما آیا ہوا تھا اور اس کے ویزا کی میعاد اکتوبر ۱۹۸۸ تک تھی۔ جون سے اکتوبر تک وہ منڈالے کی ایک دھرم شالا میں رہا تھا؛ برمی زبان روانی سے بولنے والے اس طالب علم نے مظاہروں میں بھی شرکت کی تھی۔ اس شرط پر کہ میں اس کا نام ظاہر نہ کروں، کیوں کہ اسے برما واپس جانا ہے، اس نے مجھ سے ملنے اور مجھے اپنی کہانی سنانے پر آمادگی ظاہر کی۔

۱۹ اگست کو ماؤنگ ماؤنگ کے حکومت سنبھالنے سے کئی دن پہلے منڈالے کا کنٹرول مظاہرین کے ہاتھوں میں آ گیا تھا اور یہ شہر بڑی حد تک فوج کے ہاتھوں ہونے والی ہلاکتوں سے محفوظ رہا جو اگست میں، جب سائن لوئن کی حکومت قائم تھی، رنگون میں پیش آئیں۔ "۸ اگست سے پہلے مظاہرین کی اکثریت طالب علموں اور راہبوں پر مشتمل تھی،" اس نے بتایا۔ "لیکن ۸ اگست کو ایک عام ہڑتال ہوئی۔ برما کا رواج ہے کہ دوسرے غریب ملکوں کی بہ نسبت یہاں بے کس لوگوں کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے، اور روزگار سے محروم افراد دھرم شالاؤں میں چھوٹے موٹے کام کر کے سر چھپانے کی جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔ راہبوں نے سب میں یہ بات پھیلا دی کہ عام ہڑتال کے نتیجے میں جو لوگ اپنی ملازمتوں سے محروم ہوں گے ان کی دیکھ بھال کی جائے گی۔ لوگ بڑی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے؛ ان میں سے چند مارے بھی گئے۔ اگلے روز لاکھوں افراد نے مارچ کیا، دفتر بند ہو گئے، اور بس۔ فوج پسپا ہو کر شہر کے وسط میں واقع فصیل دار قلعے میں جا چھپی، اور پولیس اپنی بیرکوں میں۔ راہبوں کے ساتھ ایک خاموش معاہدہ تھا کہ اگر مظاہرین ان مقامات کا رخ نہ کریں تو فوج احتجاج میں مداخلت نہیں کرے گی۔ امن قائم رکھنے والے دراصل راہب تھے ـــــ خاص طور پر ریڈ ایگل بریگیڈ۔ اس کا نام اس گروپ کے سربراہ کے نام کا انگریزی ترجمہ تھا۔ یہ ایک مقامی ملیشیا تھی؛ اس کے ارکان سرکاری وینوں اور ٹرکوں کو لوٹتے، اور خود کو لکڑیوں اور سمورائی تلواروں سے مسلح رکھتے۔ ایسی تلواریں بنانے کی ایک گھریلو صنعت راتوں رات

وجود میں آگئی۔ اگر کہیں کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا تو مسلح راہب وین میں سوار ہو کر فوراً وہاں پہنچتے۔ لوگ راہبوں سے، خصوصاً ریڈ ایگل بریگیڈ والوں سے، ڈرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر محلّے میں ایک چھاپامار دستہ بن گیا تھا اور سڑکوں پر چوکیاں بنالی گئی تھیں۔ میرے ساتھ ایسے دوست تھے جو شہر کے دوسری طرف والے حصے میں رہتے تھے۔ ہم سیاست پر گفتگو کرتے، اور واپسی پر مجھے ہر حفاظتی چوکی پر روکا جاتا۔ میں ہر جگہ بات چیت کرنے لگتا، اور یوں گھنٹوں میں واپس پہنچتا۔

"پگوڈے، دھرم شالائیں اور یونیورسٹیاں ڈی فیکٹو حکومت کے اجلاس منعقد کرنے کی جگہوں کے طور پر استعمال کی جاتیں۔ چالیس اخبار شائع ہونے لگے۔ ان میں سرکاری مخبروں کی تصویریں چھاپی جاتیں، اور ہدایت کی جاتی کہ ان میں سے کوئی دکھائی دے تو انفارمیشن بُوتھ پر اطلاع دیں۔ یہ بوتھ دراصل کھوکھے تھے جن میں طالب علم اور ڈاکٹر باری باری ڈیوٹی دیتے۔ چوں کہ پورے شہر میں افواہوں کا زور تھا، اس لیے یہ کھوکھے بنا دیے گئے تھے جہاں سے لوگوں کو حقائق معلوم ہو سکتے تھے۔ مقامی خبریں، مثلاً تقریروں کا وقت اور مقام، وہاں لکھ کر چپکا دی جاتیں۔ اس دوران ریڈ ایگل بریگیڈ نے تمام تاجروں اور دکان داروں کو رضامند کر لیا تھا کہ چیزوں کی قیمتیں نہ بڑھائیں۔ بلکہ چین سے آنے والی چیزوں کی قیمتوں میں تو باقاعدہ کمی آئی کیوں کہ راستے میں بھتا وصول کرنے والے فوجی غائب تھے۔ سائیکلوں کی قیمتیں نصف کے برابر رہ گئیں۔ ان سرگرمیوں میں ہر شخص شامل تھا ــــ غریبوں کو خوراک فراہم کرنا، زخمیوں کی دوائیں خریدنے کے لیے چندا جمع کرنا۔ کوئی شخص بھوکا نہیں رہا۔ مظاہرے ہر روز ہوتے تھے۔ ایک دن چھ لاکھ افراد مارچ میں شامل ہوئے ــــ یہ تعداد شہر کی کل آبادی سے بھی زیادہ تھی۔ میں نے ایسا کوئی منظر کبھی نہیں دیکھا۔ مطالبوں کی حمایت قریب قریب سو فیصد تھی۔

"رنگون میں لوگ بہت مضطرب تھے۔ قیدیوں کو چھوڑ دیا گیا تھا؛ غنڈے ہر طرف دندناتے پھر رہے تھے۔ لوگ دیوانگی کے عالم میں تھے، چناں چہ مشتبہ افراد کو پکڑ کر انھیں مارتے پیٹتے یا قتل کر دیتے۔ لیکن منڈالے شہر کی جیل ایک فصیل دار قلعے میں واقع تھی جس کے چاروں طرف خندق تھی، لہٰذا پل پار کر کے آنے والے مجرموں کو آسانی سے پکڑا جا سکتا تھا۔ جوں ہی قیدیوں کو جیل سے چھوڑا جاتا، راہب انھیں پکڑ لیتے اور پگوڈوں میں لے جاتے۔ انھیں کھانا، کپڑے اور ضروری دوائیں دی جاتیں، اور پھر نگرانی کے لیے مقامی محلہ کمیٹیوں کے سپرد کر دیا جاتا۔"

Scanned with CamScanner

***

جس وقت منڈالے شہر کا بندوبست راہبوں کے ہاتھ میں تھا اور رنگون سخت افراتفری کے نرغے میں تھا، فوجی سپاہی، فرار ہو کر مظاہرین سے آملنے کی چند شہرت یافتہ مثالوں سے قطع نظر، اپنے احاطوں میں اور نےون کی کمان میں رہے۔ فوج اور حکومت تقریباً پورے ملک کی آبادی کے خلاف صف آرا تھی۔ مسلح افواج میں کوئی دراڑ کیوں نہیں پڑی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نےون فوج کو، سب سے نچلے درجے کے سپاہی سے لے کر اعلیٰ ترین عہدے دار تک، ایک الگ تھلگ، مراعات یافتہ طبقے کے طور پر قائم کرنے کی پالیسی کے فائدہ مند نتائج حاصل کر رہا تھا۔ فوج کے اپنے اسکول تھے؛ اپنے الگ اسپتال، جن میں ضرورت کی تمام اشیا لامحدود مقدار میں موجود ہوتی تھیں؛ اپنے خاص اسٹور جہاں وہ تمام چیزیں ملتی تھیں جو کہیں اور نایاب تھیں؛ یہاں تک کہ فوج کے گولف کورس بھی الگ تھے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں یونیورسٹی کا کوئی گریجویٹ بھی، اگر اس کے والدین کی فوج یا حکومت میں رسائی نہ ہو، ملازمت حاصل نہیں کر سکتا تھا، فوج کے کسی معمولی سپاہی کے لیے فوجی ملازمت تحفظ کی علامت تھی۔ افسر کے لیے فوج سے ریٹائر ہونے پر سرکاری ملکیت کی کسی صنعت میں اونچے عہدے پر فائز ہونے کا موقع موجود تھا۔ رنگون میں فوج کے ایک کیپٹن کے بیٹے نے مجھے بتایا، "ملٹری بیس پر رہائش مفت ہے۔ کوئی بیمار پڑ جائے تو فوجی اسپتال موجود ہے ـــــ اور علاج کی سہولت کسی فوجی کے تمام رشتے داروں کو حاصل ہے۔ خوراک کا وافر راشن ملتا ہے، اور خاص چیزیں، مثلاً کوڑے کرکٹ کی سڑاند والے مقامی دودھ کے بجائے نیسلے کا عمدہ دودھ۔ فوجی افسروں کے بیٹوں بیٹیوں کو برما میں اچھی ملازمتیں ملتی ہیں، یا پھر وہ برمی سفارت خانوں میں ملازم ہو کر بیرون ملک جا سکتے ہیں۔"

چناں چہ جب ۱۸ ستمبر آئی ـــــ یعنی نویں مہینے کی اٹھارہ تاریخ ـــــ تو فوج کارروائی کے لیے تیار تھی۔ سہ پہر چار بجے برما کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں نے معنی خیز انداز میں جنگی موسیقی نشر کرنی شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد چند اہم اعلانات کیے گئے: برمی حکومت کو توڑ کر انیس فوجی ارکان پر مشتمل اسٹیٹ لا اینڈ آرڈر ریسٹوریشن کاؤنسل (SLORC) قائم کر دی گئی۔ کاؤنسل نے ہڑتال کرنے والے مزدوروں کو فوراً کام پر لوٹنے کا حکم دیا، مظاہروں کو ممنوع قرار دے دیا،

Scanned with CamScanner

رات کے وقت کا کرفیو نافذ کر دیا، اور چار سے زائد افراد کے ایک جگہ جمع ہونے پر پابندی لگا دی۔ اگلے دن کئی امریکی اخباروں نے اس تبدیلی کو ملٹری کودیتا کا نام دیا، لیکن یہ درست نہ تھا، کیوں کہ فوج نے ایک ایسی حکومت سے اقتدار لیا تھا جسے وہ خود ہی چلاتی رہی تھی۔ اصل بات صرف یہ تھی کہ فوج نے حکومت کا سویلین بہروپ اتار دیا تھا۔ کابینہ، پارلیمنٹ، اور حکومت کی ہر سطح کے دوسرے ادارے ختم کر دیے گئے اور فوجی افسر براہِ راست اپنا کنٹرول نافذ کرنے لگے۔ اس بندوبست کے سب سے اونچے مقام پر نےون کا ایک اور قریبی ساتھی جنرل سا ماؤنگ فائز تھا جو پچھلے دو ماہ سے وزیرِ دفاع اور ۱۹۸۵ کے بعد سے آرمی چیف آف اسٹاف تھا۔ اپنے فوجی خطابات کے علاوہ اب سا ماؤنگ کے پاس وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ کے عہدے بھی تھے۔

سوموار ۱۹ ستمبر ۱۹۸۸ کو خوں ریزی کا آغاز ہوا۔ صبح سویرے، مظاہرے شروع ہونے کے وقت سے پہلے، فوجیوں نے امریکی سفارت خانے کی سڑک کے دوسری طرف واقع عمارت کی چھت پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ طالب علم مظاہرین نو بجے کے قریب جمع ہونے شروع ہوئے، اور تھوڑی سی دیر میں تین ہزار مظاہرین سفارت خانے کے سامنے جمع ہو گئے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے چھت پر متعین فوجیوں نے مجمعے پر فائرنگ شروع کر دی۔ سفارت خانے کا سامنے کا ہال خوف زدہ طالب علموں سے بھر گیا؛ سفیر لیوِن نے فوراً حکم دیا کہ مظاہرین کو گارڈ بوتھ سے آگے سفارت خانے کی عمارت میں پناہ لینے دی جائے۔ لیکن باقی مظاہرین اتنے خوش قسمت نہ تھے۔ اگرچہ سفارت خانے کے بیشتر ملازمین اندر کے ایک ہال میں جا چھپے تھے، ایک سفارت کار کھڑکی میں کھڑا خون میں لت پت سڑک پر پڑے طالب علموں کو دہشت زدہ ہو کر دیکھتا رہ گیا تھا؛ وہ مجھے بعد میں اس کھڑکی کے پاس لے گیا اور پورا منظر مجھ سے بیان کیا۔ کم از کم دو افراد سفارت خانے کے ٹھیک سامنے ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے تھے۔ جن مظاہرین نے فرار ہونے کی کوشش کی ان کا تعاقب کیا گیا۔ ''اسے گھات لگا کر مارنے کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا،'' سفارت کار نے مجھے بتایا۔ ''مجمعے کو منتشر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، بس انھیں فائرنگ سے ہلاک کرنا شروع کر دیا گیا۔ اور جب وہ بھاگنے لگے تو فوج نے ان کا پیچھا کیا۔ طالب علموں کا پیچھا کرتے ہوئے فوجی اردگرد کے مکانوں کے اندر بھی گولیاں چلاتے جا رہے تھے۔ ہمارے ایک ڈرائیور کا بیٹا اسی طرح ہلاک ہوا ــــ وہ اس وقت بستر میں لیٹا ہوا تھا۔''

Scanned with CamScanner

ایسی مثالیں بھی ہیں کہ فوجیوں نے ریڈ کراس کے کارکنوں کو ان لوگوں کے قریب نہیں پہنچنے دیا جنھیں گولیاں لگی تھیں؛ کم از کم ایک موقعے پر قریب جانے کی کوشش کرنے والے ریڈ کراس کے ایک ملازم کو بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ لاشوں کو ملٹری ٹرکوں میں ڈھیر کر کے ایک ساتھ ٹھکانے لگانے کے لیے لے جایا گیا۔ بینکاک میں تھانت منت یو کی ایک ایسے شخص سے بات چیت ہوئی جو اُس وقت رنگون میں اِنیا جھیل سے کوئی ڈیڑھ میل جنوب میں واقع رہائشی علاقے کیاندا کے قبرستان میں موجود تھا جب فوجی ٹرک وہاں پہنچے تھے۔ اس شخص کا کہنا تھا کہ اس نے زندہ طالب علموں کی چیخیں اور ان پر کی جانے والی فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں جنھیں لاشوں کے ساتھ ڈھیر کر کے جلایا جا رہا تھا۔ "ایسی کئی رپورٹیں اتنی ٹھوس ہیں کہ ان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے،" تھانت منت یو نے مجھے بتایا۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے مطابق امکان یہ تھا کہ تین دن کے عرصے میں صرف رنگون میں ایک ہزار سے زیادہ افراد مارے گئے ہوں گے۔

منڈالے میں فوج نے نظم و ضبط کی بہتر پابندی کی؛ وہاں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد بہت کم تھی کیوں کہ فوجیوں نے رکاوٹیں توڑ کر آہستہ آہستہ، چار دن میں، پورے شہر کا کنٹرول حاصل کیا۔ لیکن سفاکی کے آثار اس کے باوجود نمایاں تھے۔ "انھوں نے لوگوں کو پکڑنا شروع کیا، خصوصاً راہبوں کو،" مجھے اس امریکی طالب علم نے بتایا جو ان تمام واقعات کا عینی شاہد تھا۔ "انھوں نے راہبوں کی توہین کرنے کے لیے انھیں لاتیں ماریں اور ان سے رکاوٹیں تڑوائیں۔ وہ بوٹ پہنے اور ہتھیار اٹھائے دھرم شالاؤں اور پگوڈوں میں گھس آئے۔ ایک دھرم شالا کے نگراں نے دروازے پر فوجیوں کو روکا اور ان سے کہا: اگر تم اندر آنا چاہتے ہو تو تمھیں پہلے مجھے گولی مارنی ہوگی۔ آخر کار اس کا اور فوجیوں کا ایک سمجھوتا ہو گیا: وہ اپنے جوتے اتار کر اور ہتھیار باہر رکھ کر اندر داخل ہوں گے۔ اس دوران اندر چھپے ہوئے طالب علموں کو فرار کرایا جا چکا تھا۔"

ایسے حد درجہ مذہبی معاشرے میں، جہاں راہبوں کا انتہائی احترام کیا جاتا ہے، فوجیوں نے دھرم شالاؤں کی بے حرمتی کیوں کر کی؟

"فوجیوں کو لڑکپن ہی میں بھرتی کر لیا جاتا ہے،" طالب علم نے وضاحت کی۔ "فوج باقی معاشرے سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ فوجیوں کو بتایا گیا تھا کہ یہ راہب کمیونسٹ ہیں، لہٰذا راہب ہیں ہی نہیں۔"

فوجیوں کی سفاکی اور بربریت کی وضاحت دو اور باتوں سے ہوتی۔ پہلی یہ کہ فوجیوں کو، جیسا کہ مجھے رنگون میں لوگوں نے بتایا، حرکت میں لانے سے پہلے الکحل دی گئی تھی۔ "ہم نے افسروں کو دیکھا جو اپنے ماتحت فوجیوں کو صبح سویرے اور پھر رات کے وقت الکحل پینے کا حکم دے رہے تھے،" ایک طالب علم نے مجھ سے کہا۔ "الکحل بہت تیز تھی، ویسی جسے آپ لوگ امریکا میں مُون شائن کہتے ہیں۔ فوجیوں کی آنکھیں سُرخ تھیں، اور وہ ہر حکم بجا لانے کو تیار تھے۔ وہ اپنے طور پر یہ فیصلہ کرنے کی حالت میں نہیں تھے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔" دوسری بات یہ کہ برمی فوج کے اسلحہ خانے میں آنسو گیس موجود نہیں ہے؛ کسی ہجوم کو قابو کرنے کا واحد طریقہ اس پر فائرنگ کرنا ہے۔

اگست اور ستمبر کے واقعات کس حد تک نےون کی منصوبہ سازی کا نتیجہ تھے؟ غالباً اس دوران جو کچھ ہوا وہ کسی بے مہار حکومت کی بھیانک غلطی سے کہیں زیادہ تھا۔ حکومت کے انتشار کا شکار ہو کر بے اثر ہو جانے پر بھی خفیہ پولیس کا پہلے کی طرح مستعد اور سرگرم رہنا اسی بات کی نشان دہی کرتا ہے۔ طالب علموں کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے: پہلے سفاک سائن لوئن، پھر مفاہمت پسند ماؤنگ ماؤنگ۔ لیکن یہ مفاہمت پسندی فریب تھی: ماؤنگ ماؤنگ کا انتخابات کرانے کا منصوبہ، نگراں حکومت کے قیام کے بغیر، قبول کیے جانے کا ذرّہ بھر امکان نہ رکھتا تھا۔ اس دوران مجرموں کا جیلوں سے آزاد کیا جانا — اور مظاہرین کے پانی میں زہر کی ملاوٹ — واضح طور پر افراتفری پیدا کرنے کی کوشش تھی تاکہ فوج کی مداخلت کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ اور ۱۹ ستمبر کے دن جو فوجی کارروائی شروع ہوئی، وہ کسی بھی طرح بے ساختہ نہیں کہلائی جا سکتی۔ مشین گنیں پہلے سے چھتوں پر نصب کر دی گئی تھیں، اور فائرنگ ختم ہوتے ہی لاشیں جمع کرنے والے ٹرک اور فائر انجن سڑکوں پر آ گئے۔ فوجی افسروں نے تقریباً فوری طور پر تجارت اور حکومت دونوں، سویلین افراد کو ہٹا کر، اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔

اگر یہ سب پہلے سے تیار کیے گئے ایک منصوبے کا حصہ تھا تو پھر فوج نے پسپائی اختیار کر کے ہفتوں انتشار کو برداشت کرنے کے بجائے فوری کارروائی کیوں نہیں کی؟ میں نے یہ سوال یوزانہ کھِن سے کیا۔

"ہر شخص جانتا تھا کہ ماؤنگ ماؤنگ نےون کا ساتھی ہے،" اس نے کہا۔ "شروع ہی سے

کسی کو بھی اس کی باتوں پر اعتبار نہ تھا۔ ماؤنگ ماؤنگ کی حکومت کے تمام عرصے میں ہمیں یہ احساس تھا کہ فوج وقت حاصل کرنے کا کھیل کھیل رہی ہے۔ اس کھیل سے ان کا مقصد کارروائی شروع کرنے سے پہلے یہ جاننا تھا کہ طالب علموں کی طاقت کتنی ہے، وہ کون ہیں، حکومت کو درپیش خطرہ کتنا سنگین ہے۔"

دوسری جانب، بعض لوگ فوجی ایکشن سے فوراً پہلے ہونے والے دو واقعات کو اس کارروائی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ طالب علموں نے وزارتِ دفاع اور وزارتِ تجارت کا محاصرہ کر لیا تھا جس سے فوج کو سخت اندیشہ ہو گیا کہ اس کا بھی گھیراؤ کیا جا سکتا ہے۔ وزارتِ دفاع کے باہر طلبا فوجیوں سے باقاعدہ اپیل کر رہے تھے کہ وہ ان سے آملیں، اور چند ایک فوجی ان کی بات مان بھی رہے تھے۔ وزارتِ تجارت کی عمارت کی چھت پر سے فوجیوں نے فائرنگ کر کے ایک شخص کو ہلاک کر دیا۔ بعد میں عمارت کی حفاظت پر متعین فوجیوں کو احتجاج کرنے والوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق ان واقعات سے فوج کے اضطراب میں اضافہ ہوا اور انھوں نے کارروائی شروع کر دی۔ "فوج کے بڑے حصے کو یقین تھا کہ کمیونسٹ حکومت پر قبضہ کرنے والے ہیں،" ایک سفارت کار نے کہا۔

اگست میں فوج کے ہٹائے جانے، اور پھر وسط ستمبر میں مظاہرین کے قتل، کی کوئی بھی توضیح کی جائے، بڑے بڑے فیصلے بلاشبہ نےون ہی کے کیے ہوئے تھے۔ "ریٹائرمنٹ" کے بعد بھی اس کے کردار کے جاری رہنے کے بارے میں اگر کوئی شک تھا تو وہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۹ کو دور ہو گیا ـــــ یہ دن برما کے یومِ مسلح افواج ہونے کے علاوہ نو سے تقسیم ہو جانے والا عدد بھی ہے ـــــ جب اس نے بیرونی ملکوں کے سفیروں کے ایک ڈنر میں شرکت کی؛ یہ پچھلے سال جولائی میں برما سوشلسٹ پروگرام پارٹی کے سربراہ کے عہدے سے استعفیٰ دینے کے بعد سے کسی تقریب میں اس کی پہلی شرکت تھی۔ ۲۸ مارچ کو "ورکنگ پیپلز ڈیلی" نے اپنا نمایاں ترین مضمون اس تقریب کے احوال کے لیے وقف کیا، لیکن نےون کے اس مضمون میں کہیں ذکر نہ تھا۔ پھر شاید کسی نے ہدایات جاری کی ہوں گی کہ نےون کو دوبارہ ایک سرگرم سیاسی شخصیت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے: ۲۹ مارچ کے اخبار میں صفحۂ اول پر اس کی ایک بڑی سی تصویر جاری کی جس میں وہ ڈنر کی میز پر بیٹھا ہنس رہا تھا۔ ایک ہفتے بعد اخبار نے سُرخی لگائی:

Scanned with CamScanner

Patron of the War Veterans Organisation General Ne Win (Retired) Views The 44th Anniversary Armed Forces Day Exhibition.

ایک اور بڑی تصویر میں نے ون کو چاق و چوبند اور مسکراتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ برما میں اپنے قیام کے دوران میں نے "ورکنگ پیپلز ڈیلی" کے نو ماہ کے شماروں کا مطالعہ کیا، اور اس تمام عرصے میں یہ واحد موقع تھا کہ اخبار نے اپنا پورا صفحۂ اوّل کسی ایک موضوع کے لیے وقف کیا۔

***

ایک صبح بہت سویرے تین طالب علم میرے ہوٹل آئے۔ اس دن موسم خاصا گرم اور مرطوب تھا، لیکن وہ خوف کے مارے کپکپا رہے تھے، اور اگرچہ ہم کھانے کے کمرے میں بیٹھے تھے، انھوں نے ناشتہ کرنے یا انٹرویو دینے میں کوئی دل چسپی ظاہر نہ کی؛ وہ بار بار کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے جیسے انھیں خطرہ ہو کہ کسی بھی لمحے انھیں جھپٹ لیا جائے گا۔ انھوں نے یہ خطرہ مجھے یہ مشورہ دینے کے لیے مول لیا تھا کہ مجھے آؤں ساں سُوچی سے ملاقات کرنی چاہیے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میں اگلے روز اس کی پریس کانفرنس میں شرکت کرنے والا ہوں اور اس کے بعد اس سے انٹرویو کا وقت بھی طے کر چکا ہوں، تو انھیں اطمینان ہوا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ چلے گئے۔ "آؤں ساں سوچی ہماری واحد رہنما ہے،" ان میں سے ایک نے، جو بہتر انگریزی بولتا تھا، مجھ سے کہا۔ "وہی ایک باقی رہ گئی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

برما کی تحریکِ آزادی کے رہنما اور مقتول قومی ہیرو آؤں ساں کی بیٹی، سوچی، اپریل ۱۹۸۸ میں اپنے شوہر اور دو بیٹوں کے ساتھ اپنی ماں سے، جس پر فالج کا حملہ ہوا تھا، ملنے برما پہنچی تھی۔ (اس کا اپنا نام سُوچی ہے، جس میں اس نے اپنے باپ کا نام جوڑ لیا ہے۔) اپنے باپ کی موت کے وقت وہ بہت کم عمر تھی، اور اس نے اپنی ۴۳ سالہ زندگی کا بیشتر حصہ برما کے باہر گزارا ہے۔ اس نے آکسفورڈ سے ڈگری لی ہے اور آکسفورڈ ہی کے ایک اسکالر مائیکل آرِس (Michael Aris) سے شادی کی ہے جو تبت کا معروف ماہر ہے۔ جب وہ برما آئی، ان دنوں برمی قوم پرست ادب کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنے اور اپنے باپ کی ایک سوانح لکھنے میں

مصروف تھی۔

رنگون پہنچنے پر آؤں سان سُوچی کو حالات کے ریلے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حزبِ مخالف کو کسی رہنما کی شدید ضرورت تھی، اور صرف وہی تھی جس کی شخصیت نےون کے ساتھ کسی دوردراز کے تعلق سے بھی داغ دار نہ تھی۔ بے نظیر بھٹو اور کورازون آکینو کی طرح اس کی ذات بھی ایک طاقتور علامت کی حیثیت رکھتی تھی: برما کے عظیم مقتول ہیرو کی بیٹی، جو ملک کو ایک ڈکٹیٹر کے چنگل سے چھڑانے اور جمہوریت قائم کرنے کی تحریک کی قیادت کرنے کے لیے لوٹ آئی تھی۔ لیکن اس کی اہمیت محض ایک علامت سے کہیں زیادہ تھی: سیاسیات اور معاشیات کی طالبہ، اظہار پر پوری طرح قادر، برمی اور انگریزی دونوں زبانوں میں روانی سے تقریر کرنے والی سُوچی نے بہت جلد اپنی شخصیت کی انفرادیت کا اعتراف کرا لیا۔ اس کا شوہر اور دونوں بیٹے آخرکار یوروپ لوٹ گئے جبکہ وہ اس تن تنہا اور خطرناک لڑائی کو جاری رکھنے کے لیے برما ہی میں مقیم رہی۔

۱۹۸۸ میں اقتدار سنبھالنے والی جنرل ساماؤنگ کی حکومت نے اپنے تمام سفاکانہ اقدامات کے درمیان اس بات پر بھی متواتر اصرار کیا کہ انتخابات ضرور کرائے جائیں گے۔ اگر اسے بیرونی امداد کی بحالی مقصود تھی تو انتخابات کا تذکرہ کرنا ناگزیر تھا۔ برما کو قرض اور امداد دینے والے تین بڑے ملک ـــ ۲۷۸ ملین ڈالر سالانہ فراہم کرنے والا جاپان، ۸۰ ملین ڈالر مہیا کرنے والا جرمنی، اور ۱۴ ملین ڈالر دینے والا امریکا ـــ اپنی امداد منقطع کر چکے تھے، اور حکومت کے زرمبادلہ کے ذخائر صفر کے خطرناک حد تک قریب پہنچ چکے تھے۔ تقریباً فوری بعد حکومت نے سیاسی پارٹیوں کو رجسٹریشن کرانے کی اجازت دے دی، لیکن انتخابات کے کسی ٹائم ٹیبل کا اعلان نہ کیا۔ جب تک رجسٹریشن کا کام مکمل ہوا، یعنی فروری ۱۹۸۹ کے آخر تک، ۲۳۳ سیاسی پارٹیاں رجسٹریشن کرا چکی تھیں۔ ان میں سے بہت سی پارٹیاں دوستوں کے چھوٹے چھوٹے گروپوں سے زیادہ کچھ نہ تھیں جو سیاسی پارٹی کے طور پر رجسٹر ہونے کے بعد، گرفتاری یا فائرنگ کا خطرہ مول لیے بغیر، قانونی طور پر مل بیٹھ کر سیاست پر تبادلۂ خیال کر سکتے تھے۔ دو طاقت ور پارٹیاں سامنے آئیں: نیشنل یونٹی پارٹی، جو حکومت کی تھی (اور جسے ستمبر سے پہلے تک برما سوشلسٹ پروگرام پارٹی کہا جاتا تھا)، اور نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی، جس کی سربراہ آؤں سان سُوچی

تھی۔

اُبتدا میں لیگ کے تین رہنما تھے: سُوچی؛ یو تِن اُو (U Tin Oo)، ایک سابق وزیرِ دفاع (اس کا اپنے ہم نام، انٹیلیجنس کے سابق سربراہ سے، جو اب جیل میں ہے، کوئی تعلق نہیں)؛ اور یو آؤں جی (U Aung Gyi)۔ یو تن اُو، جسے نےوِن نے ۱۹۷۶ میں برطرف کر کے چار برس جیل میں رکھا تھا، فوج اور کسی نئی حکومت کے درمیان ایک اہم ممکنہ رابطے کی نمائندگی کرتا تھا۔ آؤں جی، جس کی عمر اُس وقت ستر برس کی تھی، برمی سیاست کے ایک پُراسرار کردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ برمی فوج میں نےوِن کا ساتھی رہا تھا، لیکن اس نے نےوِن کے اقتدار پر قبضہ کر لینے اور ملک کا رخ سوشلسٹ راستے کی طرف موڑنے کے بعد اس نے فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اسے تین سال قید کی سزا سنائی گئی جو ۱۹۶۵ میں شروع ہوئی، اور دوبارہ جولائی ۱۹۸۸ میں اسے پھر قید کیا گیا؛ اپنی ان دو سزاؤں کے درمیانی عرصے میں وہ رنگون میں چائے خانوں کی ایک چین (chain) چلاتا رہا۔ آؤں جی تقریباً ہمیشہ نےوِن پر نکتہ چینی کرتا رہا ہے؛ جون ۱۹۸۸ میں اس نے نےوِن کے نام اکتالیس صفحوں کا ایک کھلا خط لکھا تھا جس میں اس کی اقتصادی پالیسیوں پر تنقید کی گئی تھی۔ اس کے باوجود اکتوبر ۱۹۸۸ میں "ایشیاویک" نامی رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے نےوِن کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا: "میں پچھلے چالیس برس سے نےوِن کے ساتھ وابستہ رہا ہوں اور ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں... میں اسے اپنے گاڈفادر کا درجہ دیتا ہوں۔" اُس شخص کے لیے اس کی عقیدت جس نے اسے دو بار جیل میں ڈالا تھا، فطری طور پر اسے طالبِ علموں کی نگاہ میں مشتبہ بنا دیتی ہے، اور ان شبہات کو مزید تقویت جنوری ۱۹۸۹ میں حاصل ہوئی جب اس نے لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی اور سُوچی اور تِن اُو پر "کمیونسٹوں" سے روابط رکھنے کا الزام لگایا ـــــ اس الزام کو سرکاری اہلکاروں نے فوراً اپنا لیا۔ (ان کا کہنا تھا کہ وہ یہ الزام عائد نہیں کر رہے، محض اسے دُہرا رہے ہیں۔) مختصر یہ کہ اس موقف میں کسی قدر جان ضرور ہے کہ ممکن ہے آؤں جی کو نےوِن نے حزبِ مخالف کو بے اعتبار کرنے کے لیے پلانٹ کیا ہو۔

مارچ ۱۹۸۹ میں حکومت نے انتخابات کے قانون کا مسودہ جاری کیا جس میں پارلیمنٹ کے انتخاب میں حصہ لینے کے ضوابط بیان کیے گئے تھے۔ اگرچہ فوجی عہدے داروں نے اپنے فرار

کی بہت سی گنجائشیں رکھی تھیں، ان کے شائع کردہ ٹائم ٹیبل کے مطابق انتخابات مئی ۱۹۹۰ء میں منعقد ہونے تھے۔ لیکن جولائی ۱۹۸۹ میں سُوچی کی مہم کے کارکنوں کی گرفتاری کی لہر سے پہلے بھی انتخابی مہم ڈرامائی طور پر ناہموار سطحوں پر چلائی جا رہی تھی۔ حزبِ مخالف کو ریاستی ملکیت کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن تک کوئی رسائی حاصل نہیں تھی۔ وہ بدنام سرکاری حکم، جسے ۲/۸۸ کا نام دیا جاتا ہے (یعنی ۱۹۸۸ میں قائم ہونے والی حکومت کا جاری کیا ہوا حکم نمبر ۲)، جس کی رو سے چار سے زائد افراد کا ایک جگہ جمع ہونا ممنوع ہے، تکنیکی طور پر بیرونِ در ہونے والی کسی بھی سیاسی سرگرمی کو غیر قانونی بنا دیتا ہے۔ (۲ اور ۸۸ کا حاصل جمع ۱۸ ہے جو ۹ پر پورا تقسیم ہو جاتا ہے۔) آوں سان سُوچی کی جانب سے دیہات میں چلائی جانے والی مہم کو حکومت کی طرف سے ہر قسم کے مخالفانہ ہتھکنڈوں کا سامنا کرنا پڑا ہے: لاؤڈاسپیکروں پر لوگوں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اُسے دیکھنے کے لیے گھروں سے باہر نہ نکلیں؛ حکام نے انتخابی نشانوں کی نمائش کرنے پر پابندی لگا دی؛ فوجیوں نے بھدّے انداز میں بنائے گئے کارٹون تقسیم کیے جن میں اسے اور اس کے شوہر کو "غیر ملکی" جنسی افعال میں مشغول دکھایا گیا تھا؛ اور ۵ اپریل ۱۹۸۹ کو وہ ایک فوجی کپتان کے ہاتھوں قتل ہونے سے بال بال بچی۔

۱۹ اپریل کو اس کی پریس کانفرنس میں، جو شمالی رنگون میں اس کے آبائی مکان کے احاطے میں واقع، چھپر کی چھت اور کچے فرش والی ایک چھوٹی سی عمارت میں منعقد ہوئی، آنے والے خبر نگاروں کے ذہنوں میں سُوچی کی زندگی کو لاحق ہونے والا وہ خطرہ موجود تھا۔ اپریل برما میں سب سے زیادہ گرم مہینا ہوتا ہے، اور دوپہر کی دھوپ میں کمرہ بُری طرح تپ رہا تھا۔ لیکن سُوچی ــــ ایک نہایت متاثر کن اور خوش رُو عورت، جو جامنی لنگی اور اس سے ملتے جلتے رنگ کے لمبی آستینوں والے بلاوز میں ملبوس تھی ــــ مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ خود اعتماد اور پُرمزاح سُوچی نے پریس کانفرنس میں ایسی مہارت اور خوش اسلوبی کا مظاہرہ کیا کہ کانفرنس کے خاتمے پر بہت سے رپورٹروں نے تالیاں بجا کر اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ کئی سوالوں پر اس کے جواب انتہائی ڈرامائی تھے اور ضرب المثل بننے کی سی صلاحیت رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر، جب اس سے حکومت کی جانب سے اس کی انتخابی مہم میں رکاوٹیں ڈالنے کی بابت سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ "بعض موقعوں پر لوگوں کو مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلانے سے روکا گیا، یہاں تک کہا گیا

کہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا بھی نہیں سکتے۔" اتنا کہہ کر وہ رکی، خبر نگاروں کی طرف دیکھا، مسکرائی، اور اضافہ کیا، "مسکراہٹ کو برمی لوگوں کے انسانی حقوق میں سے آخری حق کہنا چاہیے۔"

سُوچی کو بظاہر یہ احساس تھا کہ انتخابات منعقد ہونے کے امکانات نہایت خفی ہیں، اور وہ اس بارے میں نہایت محتاط تھی کہ فوج کے لیے خطرہ بننے کا تاثر دینے سے کہیں یہ امکانات بھی معدوم نہ ہو جائیں۔ جیسا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی موقعوں پر کر چکی تھی، اس نے مفاہمت پسندی کے اظہار کی انتہائی کوشش کی۔ "اس ملک کا ایک المیہ یہ ہے کہ یہاں فوج اور سویلین آبادی کے درمیان پکی اینٹوں کی اونچی دیوار حائل رہی ہے، اور وہ ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے،" اس نے کہا۔ "جمہوریت کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ حکام اور سیاسی پارٹیوں کے درمیان تعاون موجود نہیں۔ اگر دونوں کے درمیان تعاون ہوتا تو متواتر رونما ہونے والے تنازعات کو روکا جا سکتا تھا۔ جمہوریت پسند قوتوں کا مقصد فوج کو تباہ کرنا ہرگز نہیں۔ ہم فوج میں انتشار پیدا کرنے سے بھی دل چسپی نہیں رکھتے؛ ہمیں معلوم ہے کہ فوج میں انتشار پیدا ہونے سے ہمارے ملک کے لیے زیادہ سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اگر وہ ہم سے مکالمہ کرنے سے انکار کرتے ہیں، تب بھی ہم مکالمے کی دعوت کو دہراتے رہیں گے، کیوں کہ یہی درست طریقہ ہے،" اس نے کہا۔ اس نے ان فوجیوں کے بارے میں ضرور کچھ کلبیت کے ساتھ تبصرہ کیا جو حفاظت کے بہانے رنگون بھر میں اس کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ انھیں میری حفاظت کے لیے خاردار تار لپیٹے ہوئے ڈنڈوں کی آخر کیا ضرورت ہے،" اس نے کہا۔ پھر بولی، "ہماری پارٹی کے بے شمار کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے؛ بہت سے کارکنوں کو گرفتاری کا خطرہ لاحق ہے۔ میں حکام سے صرف ایک بات کہتی ہوں: آپ کے لیے لوگوں سے اپنے خلاف باتیں سننا تکلیف دہ ضرور ہو گا، لیکن اتنا تکلیف دہ ہرگز نہیں ہو گا جتنی ایک گولی تکلیف دہ ہوتی ہے ـــــ اور لوگوں کو گولیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔"

سُوچی کو برما کے مستقبل کے منفی آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ایک بُری علامت یہ تھی کہ یومِ مسلح افواج پر جنرل نے ون دوبارہ ایک تقریب میں ظاہر ہو گیا تھا۔ "بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ پردے کے پیچھے سے ڈوریاں وہی ہلا رہا ہے،" اس نے کہا۔ "میں ان لوگوں سے متفق ہوں جو ایسا سمجھتے ہیں۔ اس کا دوبارہ ظاہر ہونا ایسی بات نہیں ہے جسے ہم دنیا کے سب سے

زیادہ حوصلہ افزا شگون کا نام دے سکیں۔" پھر جاپان کے اس فیصلے کی بات ہوئی جس کے تحت اس نے قرض اور امداد فراہم کرنے والے ملکوں کی طرف سے ہونے والے برما کے بائیکاٹ سے علیحدگی اختیار کر کے برما کے ان منصوبوں کے لیے امداد فراہم کرنے کا اعلان کیا جو ۱۹۸۸ کے جابرانہ اقدامات سے پہلے شروع ہو چکے تھے۔ "جاپان جیسے خوشحال ملک کی جانب سے منافعے کو انسانی حقوق پر ترجیح دینے کا فیصلہ واقعی بہت صدمہ پہنچانے والی بات ہے،" اس نے تبصرہ کیا۔ "ایسا بھی نہیں ہے کہ اگر وہ معاشی مفادات پر انسانی حقوق کو فوقیت دیں تو بھوکے مر جائیں گے۔"

عام سے انداز میں بات کرتے ہوئے، گویا اس کی حوصلہ مندی کوئی غیر معمولی بات نہ ہو، سوچی نے ۵ اپریل کو اِراوادی ڈیلٹا کے ایک قصبے دانو بیو میں ہونے والے واقعے کی تفصیل بیان کی۔ وہ مہم کے ایک دورے کے بعد اپنے چند کارکنوں کے ساتھ سڑک پر چلتی آ رہی تھی کہ ایک فوجی کیپٹن کے حکم پر چھ فوجی سپاہی ایک جیپ سے کود کر اترے، زمین پر ایک گھٹنا رکھ کر پوزیشنیں لیں اور بندوقوں سے اس کی طرف نشانہ باندھ لیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو فٹ پاتھ پر انتظار کرنے کا اشارہ کیا اور خود سڑک کے بیچ میں چلتی ہوئی فوجیوں کے نزدیک آئی۔ "انھیں نشانہ لینے کے لیے واحد ہدف فراہم کرنا سب لوگوں کو خطرے کی زد میں لانے کے مقابلے میں بہت سادہ سی بات تھی،" اس نے ہمیں بتایا۔ "تب ہی ایک میجر نے کیپٹن کو فائرنگ کا حکم واپس لینے کی ہدایت کی۔"

پریس کانفرنس کے بعد میں سُوچی کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چلا جو ایر کنڈیشننگ سے عاری ایک پرانا مکان تھا، آرام دہ ضرور تھا لیکن لگتا تھا عرصے سے اس کی مرمت نہیں ہوئی ہے۔ ہم نے صدر دروازے پر اپنے جوتے اتار دیے اور بات چیت کرنے کے لیے لِونگ روم میں چلے گئے۔ میرے سوالوں پر اُس کے جواب مختصر اور سیدھے تھے، بالکل پریس کانفرنس کی طرح، اور اس نے اپنے اضطراب کو، جو اسے یقیناً لاحق ہو گا، مجھ پر ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا؛ وہ اپنے گھر والوں سے جدا ہو کر ایک فوجی آمریت کا سامنا کر رہی تھی جو ایک سے زیادہ بار اسے قتل کرنے کے قریب تک جا پہنچی تھی۔ "مہم کے باعث میں کچھ دُبلی اور سانولی ہو گئی ہوں،" وہ بولی۔ "دیہی علاقوں میں اِدھر اُدھر آنا جانا بہت تھکا دینے والا کام ہے۔ یہ جوش و خروش کی بات نہیں بلکہ سخت

محنت اور مشقت کا معاملہ ہے۔ مجھے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔"

سُوچی نے اس خیال کو فورا رد کر دیا کہ دا نو بیو کے واقعے میں جرأت کا مظاہرہ کرنے پر وہ خراجِ تحسین کی مستحق ہے۔ "یہ بہادری نہیں ہے،" اس نے اعلان کیا۔ "یہ اس کام کو کرنے کا معاملہ ہے جو آپ کو کرنا ہی ہے۔ یا تو آدمی یہ کام کرتا ہے یا فرار اختیار کرتا ہے۔" اس کا تمام فخرو ناز ان طالب علموں کے لیے وقف تھا جو ملک بھر میں اس کی مہم کو منظم کرنے کا کام اس قدر تن دہی سے کر رہے تھے؛ صرف اُن کا ذکر کرتے ہوئے سُوچی نے اپنے چہرے پر جذبے کی ایک جھلک نمودار ہونے دی۔ "یہ نوجوان بے حد بہادر ہیں،" اس نے مجھے بتایا۔ "انھوں نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو لوگ چھبیس سال سے کہنا چاہتے تھے لیکن خوف کے مارے کہہ نہیں پاتے تھے۔ ہماری پارٹی میں پیشہ ور سیاست دانوں کا وجود نہیں ہے؛ ہم عمل کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ ہماری پارٹی بہت زیادہ تیزی سے پھیل گئی ہے؛ صرف چند مہینے گزرنے پر ہماری ممبر شپ بیس سے تیس لاکھ تک ہے۔ اس وجہ سے ہم تنظیم اور ڈسپلن پر اتنی توجہ نہیں دے پا رہے جتنی دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اب طالب علموں کو ایک تنظیمی ڈھانچا مل گیا ہے جس میں رہتے ہوئے وہ اپنا کام کر سکتے ہیں۔ اپنے سے زیادہ عمر والوں کے ساتھ کام کرنے سے وہ بہت کم وقت میں پختہ کار ہو جاتے ہیں۔ اگست میں وہ نوعمر لڑکیاں اور لڑکے تھے؛ آج جوان عورتیں اور مرد ہیں۔"

***

حزبِ مخالف کے سیاست دانوں اور بغاوت پر آمادہ طالب علموں کو تلاش کرنے کی نسبت برمی حکومت کے رہنماؤں کو ڈھونڈنا کہیں زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ حکومت نے جنوری ۱۹۸۹ میں نافذ کی ہوئی پریس کی بابت کھلے دروازوں والی پالیسی کی پہلی بڑی آزمائش کے سلسلے میں اپریل میں ہم آٹھ خبر نگاروں کو ملک میں آنے کی دعوت تو دے دی تھی لیکن اس کے بعد اسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ ہمارے ساتھ کرے کیا۔ ہم نے بعد میں پتا چلایا کہ ملٹری انٹیلیجنس متواتر اس کھوج میں لگی رہی تھی کہ ہم کس کس سے بات کرتے ہیں، لیکن اس کے سوا کچھ نہ کیا گیا۔ ہمیں کوئی ایرپورٹ پر نہ ملا، کسی نے ہمارے ہوٹل میں پروپیگنڈا کا مواد نہیں پہنچایا، کسی نے ہم سے رابطہ قائم کر کے یہ

Scanned with CamScanner

مشورہ دینے کی کوشش نہ کی کہ ہمیں کس سے ملنا چاہیے۔ میں نے یو کیا سان (U Kyaw Sann) کو، جس کا عہدہ فوج کے ترجمان کا تھا، فون کرنے کی کوششیں کی لیکن اس کا فون ہمیشہ مصروف ملا۔ آخرکار میں ایک برمی ترجمان کے ساتھ ـــ میرا دوست یومِنٹ تھیم نہیں، جسے میں اپنے ساتھ کسی فوجی عمارت میں لے جانا نہیں چاہتا تھا ـــ یو کیا سان کی تلاش میں نکلا۔ ہم اس کا پتا پوچھتے رنگون کے اُس علاقے میں گئے جہاں وزارتِ دفاع کی عمارتیں ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ ہر عمارت پر ہمارا سامنا فوجی سپاہیوں سے ہوا جنھوں نے سنگین لگی رائفلیں ہم پر تان لیں اور جب ہم نے سوال کیا تو ہمیں کسی اَور عمارت کی طرف بھیج دیا۔ آخرکار ہم درست جگہ پہنچ گئے، لیکن سپاہیوں نے ہمیں اندر داخل نہیں ہونے دیا؛ انھوں نے بتایا کہ دفتر دوپہر کے کھانے کے لیے بند ہے۔ اس وقت دس بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔

اسی روز سہ پہر، اس خیال سے کہ کہیں مجھے حکومت کے کسی فرد پر نگاہ تک ڈالے بغیر برما سے رخصت نہ ہونا پڑے، میں نے ایک فہرست نکالی جو مجھے دی گئی تھی، اور تمام سرکاری نمبروں پر ایک ایک کر کے فون کرنا شروع کیا۔ برما میں ٹیلی فون استعمال کرنا آسان کام نہیں ہوتا؛ اپنے ہوٹل سے میل بھر دور واقع دوسرے ہوٹل سے رابطہ قائم کرنے میں عموماً آدھ گھنٹا لگ جاتا تھا، اور اس کے بعد بھی لائن اس قدر خراب ہوتی کہ ہمیں ہر لفظ چیخ کر بولنا پڑتا۔ بہرحال، آخرکار وزارتِ خارجہ میں کسی نے فون اٹھایا، اور میں نے اس سے کہا کہ میں کسی ایسے شخص سے بات کرنا چاہتا ہوں جو روانی سے انگریزی بول سکے۔ ایک آدمی، جو برطانوی لہجے میں بہترین انگریزی بولتا تھا، فون پر آیا۔ جوں ہی میں نے اپنا نام لیا، وہ فوراً بولا، ''جی جی، سان فرانسسکو سے۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں آپ کے بارے میں اس سے زیادہ معلوم ہے جتنا آپ سمجھتے ہیں،'' اس نے جواب دیا۔

''اگر ایسی بات ہے تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں حکومت کے کسی نمائندے سے بات نہ کر پانے کی وجہ سے کس قدر جھنجھلاہٹ کا شکار ہوں،'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے سے لائن پر رہنے کی ہدایت کی، اور تیس سیکنڈ کے اندر اندر یہ خبر لے کر لوٹا

Scanned with CamScanner

کہ میں اگلی سہ پہر وزارتِ خارجہ کے سربراہ سے مل سکتا ہوں۔

یو اون گیا (U Ohn Gyaw) وزارتِ خارجہ کا ڈائرکٹر جنرل ہے؛ اسے وزیرِ خارجہ نہیں کہا جاتا کیوں کہ یہ ان القاب میں سے ایک ہے جنھیں سا ماؤنگ نے سربراہِ ریاست بنتے وقت اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اودی لنگی، سفید نہرو واسکٹ اور بغیر موزوں کے سینڈل پہنے اون گیا نے ضرورت سے زیادہ ٹھونس کر بھری اور پیلا کپڑا منڈھی کرسیوں اور کاؤچوں والے ایک کمرے میں اپنی نشست سنبھالی۔ بھوری کمانیوں والے موٹے چشمے، اونچی، بھاری آواز اور گفتگو کے دوران مستقل گردش میں رہنے والے ہاتھوں کے ساتھ وہ ایک متاثر کن شخصیت ہے۔ اس کے الفاظ ۱۹۸۹ کے حالات کے لحاظ سے خاصے ناوقت معلوم ہوئے جب اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ اس کے نزدیک ملک بھر میں ہونے والے ہنگامے دراصل کمیونسٹوں کی سازش کا حصہ ہیں۔ "رنگون کے اردگرد کئی سیٹلائٹ ٹاؤن آباد ہیں،" اس نے اگست اور ستمبر ۱۹۸۸ کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "برما کمیونسٹ پارٹی کے کارکن مضافات میں موجود تھے۔ شہر کی سڑکوں پر اتنے سارے لوگ کہاں سے آ گئے؟ دراصل یہ اردگرد کے قصبوں کے لوگ تھے جن کے ریلے شہر میں داخل ہوئے، اور ان میں سے بہت سوں کو زبردستی لایا گیا تھا۔ انھیں لانے والا ایک گروپ تھا جو حکومت کے تجزیے کے مطابق بی سی پی کے سیل پر مشتمل تھا۔ لوگوں کا بسوں میں بھر بھر کے لایا جانا، نعرے، اور تنظیم کا انداز ــــ ہر چیز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے یقیناً کوئی نہ کوئی ہے۔" پھر اس نے اضافہ کیا، "برما کمیونسٹ پارٹی چینی یا روسی کمیونسٹوں کی طرح نہیں ہے۔ اس کے ارکان نہایت جنونی ہیں اور فوراً انتہا پسندانہ اقدامات پر اتر آتے ہیں؛ ان کا خیال ہے کہ انقلاب کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔" درحقیقت برمی حکومت کے باہر تمام تجزیوں کی رو سے برما کمیونسٹ پارٹی کو بیجنگ کی حمایت عرصہ ہوا موقوف ہو چکی ہے، اور اب وہ محض افیون کی اسمگلنگ کرنے والے ایک گروپ کے طور پر باقی ہے۔

اگرچہ کمیونسٹ سازش کے بارے میں اون گیا کے خیالات ایسے نہیں ہیں کہ انھیں سنجیدگی سے لیا جائے، لیکن آؤں ساں سُوچی اور دا نو بیو میں ہونے والے واقعے کی بابت میرے سوال کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا اسے سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔

"اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ سڑکوں پر مہم چلانے پر پابندی کے سرکاری حکم کی خلاف

ورزی کر رہی تھی، تو کیا قتل کرنے کے سوا اس سے نمٹنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا؟" میں نے پوچھا۔ "بات چیت، آنسو گیس، گرفتاری، یا قتل کے سوا کوئی اَور اقدام؟"

اون گیا میری بات سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ "کیپٹن اس گروپ سے کہہ رہا تھا کہ مارچ کرتے ہوئے آگے آگے جھنڈا مت لہراؤ،" اس نے جواب دیا۔ "اصل بات یہ ہے کہ مظاہروں کی اجازت نہیں ہے۔ اور یہ ایک مظاہرہ تھا: جھنڈے لہرانا اور نعرے لگانا۔ کیپٹن نے ایک کھمبے کی طرف اشارہ کیا اور کہا: اگر تم لوگ اس سے آگے بڑھے تو ہم گولی چلانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اسی لمحے میبر وہاں آ گیا۔ یہ نظم و ضبط والا ملک ہے۔ چاہے آون سان سُوچی ہو یا کوئی راہ گیر، اگر لوگ حکام کی بات نہیں مانیں گے تو کیا انجام ہو گا؟ یہ مغرب نہیں ہے۔ یہاں وہ اپنے خیالات کا اظہار کسی ہال کے اندر کر سکتے ہیں۔"

اون گیا نے بڑے اعتماد سے پیش گوئی کی کہ انتخابات مئی ۱۹۹۰ سے پہلے پہلے لازماً منعقد ہوں گے۔ "مسلح افواج کی ذمے داری انتخابات کرانا ہے،" وہ بولا۔ "اس کے بعد وہ بیرکوں میں لوٹ جائیں گی۔ جوں ہی اگلی حکومت بنے گی، ہم اقتدار اس کے سپرد کر دیں گے۔"

میں نے کہا کہ اگر باہر نکل کر اپنی انتخابی مہم چلانے پر امیدواروں کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا رہا تو انتخابات کیوں کر منعقد ہوں گے۔

اس نے جواب دیا کہ انتخابات سے پہلے تین مہینوں کے لیے مہم چلانے کی اجازت دی جائے گی۔ "بلاشبہ اگر امن و امان کو خطرہ پیدا ہوا تو کوئی بھی سخت پابندی لگائی جا سکتی ہے،" اس نے کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں جنرل سا ماؤنگ کا انٹرویو نہیں کر سکوں گا — وہ بے حد مصروف ہے — اور نے ون یا ماؤنگ ماؤنگ سے بھی نہیں مل سکوں گا، کیوں کہ وہ دونوں ریٹائر ہو چکے ہیں۔ "ریٹائر ہونے کا مطلب ریٹائر ہونا ہے،" اس نے اعلان کیا۔ "ہم انھیں اپنا وقت اپنی مرضی سے گزارنے دیتے ہیں۔"

تاہم، اسی ہفتے کے آخر میں حکومت نے رنگون کے دورے پر آئے ہوئے امریکی خبر نگاروں کو اسلورک (SLORC) کی انفارمیشن کمیٹی کا انٹرویو کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ کمیٹی چار اعلیٰ فوجی عہدے داروں اور تین سویلین افراد پر مشتمل ہے جو برمی ذرائع ابلاغ کا انتظام چلاتے ہیں اور سرکاری پروپیگنڈا کے ذمے دار ہیں۔ ہمیں ایک لمبی میز پر بٹھایا گیا اور ویٹروں

نے فنگر سینڈوچ، ایگ رول اور چائے پیش کی۔ کمرے میں مائیکروفون، ٹیپ ریکارڈر اور فوٹو گرافر موجود تھے۔ اس ملاقات میں سرکاری طور پر منعقد کردہ پروپیگنڈا کی کسی زبردست تقریب کے سارے لوازمات مہیا تھے، اور اس ملاقات کا مکمل متن "ورکنگ پیپلز ڈیلی" کے ایک شمارے میں شائع ہونے والا تھا۔ یہ اخبار پریس کانفرنسوں میں کیے گئے تنقیدی سوالوں کو یا مغربی مطبوعات یا وائس آف امریکا کے چبھتے ہوئے تبصروں کو شائع کر کے ان کے نیچے زیر بحث موضوع کی "اصلیت" کے طور پر سرکاری موقف پیش کرنے کا عادی ہے۔ ظاہر ہے، کوئی برمی ان جوابات پر یقین نہیں کرتا لیکن تنقیدی سوالوں یا تبصروں کو نہایت شوق سے پڑھا جاتا ہے ــــ اور یہ تنقید ایسی ہوتی ہے کہ اگر کوئی اسے سیاسی پوسٹر میں لکھ دے تو اسے سزائے موت دے دی جائے۔

لیکن ہماری اس پریس کانفرنس کا ایک لفظ بھی کبھی شائع نہ ہوا۔ بعد میں سوچنے پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ انفارمیشن کمیٹی برمی ذرائع ابلاغ کو احکام جاری کرنے کی عادی تھی، مغربی رپورٹروں کے سوالوں کا سامنا کرنے کی نہیں۔ اور ہمارے بعض سوالات اس قدر پریشان کن تھے کہ کمیٹی کے ارکان چراغ پا ہو گئے۔ کئی موقعوں پر ایسا ہوا کہ وہ ہماری موجودگی کو فراموش کر کے آپس میں برمی زبان میں بحث کرنے لگے۔

ہمارا ایک سوال یہ تھا کہ اگر انتخابات کے بعد اقتدار میں آنے والی حکومت نے فوجی افسروں پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلانا شروع کیا تو فوج کا ردعمل کیا ہو گا۔

"جو کچھ کیا گیا قانون کے مطابق کیا گیا،" کمیٹی کے ایک رکن نے جواب دیا۔

دراصل یہ جواب اسی سوال کے اُس جواب کی بہ نسبت کہیں زیادہ گول مول تھا جو اون گیا نے دیا تھا۔ "برما میں ایسی کوئی بات نہیں ہو گی،" اس نے مجھے بتایا تھا۔ "آپ کے ذہن میں مغرب کا تصور ہے۔ یہ باتیں یہاں نہیں ہوتیں۔"

کمیٹی کے ارکان نے ہمیں بتایا کہ وہ برما کی بابت ہماری تمام غلط فہمیوں کو رفع کر دیں گے۔ (وہ انفرادی حیثیت میں بات کرنے کے بجائے ہمیشہ گروپ کے طور پر بولتے؛ کوئی سوال سن کر پہلے وہ باہم مشورہ کر کے طے کرتے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے، پھر ان میں سے کوئی ایک انگریزی میں جواب دیتا اور باقی سب تائید میں سر ہلاتے رہتے۔) "بعض غیر ملکی صحافی ہمارے حق میں نہیں لکھتے،" انھوں نے کہا۔ "اب ہم ان کو درست خبر مہیا کر رہے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

اور درست خبر کیا تھی؟

"نے ون کا اب کسی قسم کا کوئی کنٹرول باقی نہیں رہا۔" لوگ، خصوصاً دیہی علاقوں میں رہنے والے لوگ، فوج سے محبت کرتے ہیں۔ "برما کی اسّی فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ لوگوں کی رائے جاننے کے لیے آپ کو دیہات میں جانا ہوگا۔" اگرچہ قانون کی رو سے چار سے زائد لوگوں کا بیرونِ در اکٹھا ہونا ممنوع ہے، شادی یا تدفین کے اجتماعات پر فائرنگ نہیں کی جاتی۔ (یہ گویا حکومت کی دریادلی کا ثبوت تھا۔) استحکام کو جمہوریت پر فوقیت حاصل ہے، ورنہ "یہ ملک بھی ایک چھوٹا لبنان بن جائے گا۔" اور آخر میں یہ کہ کمیونسٹ خطرے کو کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ "ہمارا خیال ہے کہ برمی کمیونسٹوں کو ہم آپ سے بہتر جانتے ہیں۔"

اون گیا اور انفارمیشن کمیٹی کے ساتھ ہونے والی گفتگو نے برما کے مستقبل کی بابت سنگین شبہات پیدا کر دیے۔ دونوں سے ملنے والے جوابات مفاہمت کی کسی گنجائش کا پتا نہیں دیتے تھے، اور طالب علموں اور کمیونسٹوں کی بات ان کے خیالات حقیقت سے ذرا بھی مطابقت نہ رکھتے تھے۔ کیا ایسے لوگ آزاد انتخابات ہونے دیں گے اور سویلین حکومت کو اقتدار سونپ دیں گے؟ جولائی ۱۹۸۹ میں برمی حکومت نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا۔ ۱۹ جولائی کو یومِ شہدا کے طور پر منایا جاتا ہے، کیوں کہ اس دن آؤن سان کا قتل ہوا تھا، اور اس موقعے پر سُوچی کا ارادہ ایک ریلی کی قیادت کرنے کا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے حکومت نے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے تمام فوجی افسروں کو، خواہ وہ جونیئر رینک کے کیوں نہ ہوں، سیاسی مظاہرین کو گرفتار کرنے اور موقعے ہی پر ان تین میں سے کوئی بھی ایک سزا دینے کا اختیار دے دیا گیا: تین سال قید بامشقت، عمر قید یا سزائے موت۔ ہزاروں فوجی رنگون میں داخل ہو گئے؛ انھوں نے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور ٹرکوں پر سوار ہو کر مظاہروں سے باز رہنے کی ہدایات نشر کرنے لگے۔ خوں ریزی کے خوف سے سُوچی نے ریلی کو منسوخ کر دیا۔ ۲۰ جولائی کو (اس تاریخ کے اعداد، یعنی ۷ اور ۲۰، کا حاصل جمع نو پر پورا تقسیم ہو جاتا ہے) فوجیوں نے سُوچی کے گھر کے احاطے کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور سُوچی اور اس کی پارٹی کے دوسرے رہنما، سابق وزیرِ دفاع تِن اُو، کو گھر میں نظر بند کر دیا۔ پھر سوچی کے حامیوں کی گرفتاری کی مہم شروع ہوئی، اور گرفتار کیے جانے والوں میں، جیسا کہ مجھے اگست کے آخر میں معلوم ہوا، صبح سویرے میرے ہوٹل آ کر مجھ سے ملنے والے طالبِ علم

اور رنگون جنرل اسپتال کا سرجن، ڈاکٹر تن میوون، بھی شامل تھا جس سے میں نے انٹرویو لیا تھا۔ گرفتار ہونے والوں کی تعداد ہزاروں میں تھی، اور ان گرفتاریوں کے باعث سوچی کی انتخابی مہم کی تنظیم کی قیادت کا مکمل صفایا ہو گیا۔ "برمی حکومت نے گرفتاریوں کا کوئی جواز پیش کرنے کی کوشش تک نہ کی،" ایک سفارت کار نے مجھے بتایا۔ "انھوں نے رسمی طور پر سوچی کی پارٹی کو خلافِ قانون بھی قرار نہیں دیا، اور وہ آج تک قانونی طور پر تسلیم شدہ پارٹی ہے۔" جیلوں میں سیاسی قیدیوں کے لیے جگہ بنانے کی غرض سے حکومت نے اٹھارہ ہزار سے زائد عام مجرموں کو رہا کر دیا۔ ۲۱ اگست کو امریکی سفیر لیون نے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے نام ایک کیبل بھیجا کہ "اب ہمارے پاس قابلِ اعتبار اور عینی شہادتیں موجود ہیں کہ [سیاسی قیدیوں کے ساتھ] تشدد، مارپیٹ اور بدسلوکی کے واقعات عام ہیں، اور یہ کہ بعض موقعوں پر اموات بھی واقع ہوئی ہیں۔" وسط ستمبر میں کاچین انڈیپنڈنٹ آرگنائزیشن نامی ایک نسلی اقلیتی گروپ نے جو شمال مشرقی برما میں حکومت سے لڑ رہا ہے، رپورٹ دی کہ فوج کئی ہزار نئے قیدیوں کو کاچینوں کے خلاف لڑائی میں قلیوں کے طور پر استعمال کر رہی ہے؛ انھیں رسیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر اور بھوکا رکھ کر آگے آگے چلایا جاتا ہے، اور لڑکھڑانے یا گر پڑنے والوں کو مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ ۲۰ ستمبر تک ایسی اطلاعات مل رہی تھیں کہ رنگون میں ہر رات اوسطاً بیس افراد کو گرفتار کیا جاتا ہے، جن میں سے کچھ جیل میں ڈال دیے جاتے ہیں اور باقی مار دیے جاتے ہیں۔ گرفتاریوں کی اندھادھند نوعیت کے باعث نوجوان برمی بڑی تعداد میں تھائی لینڈ کی سرحد کی طرف فرار ہو رہے تھے، اور تھائی حکام انھیں برمی فوج کے حوالے کر دینے کی دھمکیاں دے رہی تھی۔

برمی حکومت نے انتخابات منعقد کرا کے اپنا اعتبار بحال کرنے کی اپنی ہی کوشش کو اس قدر سفاکی کے ساتھ کیوں سبوتاژ کیا؟ اس کی اغلب توضیح یہی ہے کہ آمریت نے ابتدا میں برما کے لیے گواتے مالا کی قسم کا حل سوچا ہو گا ــــ کہ فوج پردے کے پیچھے سے ڈوریاں ہلایا کرے اور ایک بے طاقت سویلین حکومت سامنے دکھائی دیتی رہے تاکہ بیرونی امداد اور سرمایہ کاری بحال ہو سکے۔ لیکن سُوچی ڈرامے کے اس اسکرپٹ کی پابندی نہیں کر رہی تھی: وہ قومی سطح کی ایک قد آور شخصیت بنتی چلی جا رہی تھی جس کی وسیع البنیاد حمایت فوجی قیادت کے لیے خطرے کا باعث تھی۔ ۱۹۸۹ کے موسمِ گرما میں اس کی سیاسی ریلیوں میں دس ہزار سے پندرہ ہزار تک لوگ

شریک ہوتے تھے، اور پہلی بار اُس نے نئے دِن پر باقاعدہ نام لے کر نکتہ چینی شروع کر دی تھی اور فوج سے اپیل کی تھی کہ وہ آمریت کے بجائے برمی عوام کا ساتھ دے۔ اس بات کے اشارے موجود تھے کہ کم از کم کچھ فوجی اس کی بات پر کان دھرنے لگے ہیں؛ حکومت نے سُوچی کی ریلیوں پر متعین سپاہیوں کو بار بار تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

حزبِ مخالف کی پوری قیادت کے جیل جانے کے بعد اب برما کا مستقبل فوج کے ہاتھ میں ہے۔ اگست ۱۹۸۹ میں مجھے، ایک شخص کی وساطت سے، ایک اعلیٰ فوجی عہدے دار کو، جو اب فوج کا مخالف ہے، چند سوال لکھ کر پیش کرنے کی اجازت ملی۔ "فوج کے اندر بہت بے اطمینانی موجود ہے،" اس نے کہا۔ "ان سپاہیوں اور افسروں کے لیے جو نسلی اقلیتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں، حالات نہایت دشوار ہیں، اور بے اطمینانی کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ مراعات سے حقیقی فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی یا تو رنگون میں تعینات ہو یا اس کے اونچی سطح پر تعلقات ہوں۔ فوج میں ہم جیسے بہت سے لوگوں کو احساس ہے کہ حالات ہمیشہ اسی طرح نہیں رہ سکتے۔" کیا فوج میں پڑنے والی پھوٹ یا خوراک کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور خراب ہوتی ہوئی معیشت سے پیدا ہونے والی بے اطمینانی ایک اَور عوامی تحریک کو جنم دے گی؟ یہ ایک امکان ہے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ فائرنگ اور جبر کا موجودہ سلسلہ جاری رہے۔

***

پس نوشت:

برما کے بارے میں صرف ایک پیش گوئی کی جا سکتی ہے، اور وہ یہ کہ کسی بات کی پیش گوئی کرنا ناممکن ہے۔ نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی کے امیدواروں کو خوف زدہ اور اس کی رہنما آون سان سُوچی کو گرفتار کیے جانے کے بعد برما کے باہر کم ہی لوگوں کو امید تھی کہ برمی فوجی جُنتا پارلیمانی انتخابات کے سلسلے کو آگے بڑھنے دے گی۔ لیکن کوئی غیر ملکی ان خودفریبیوں اور خوش فہمیوں سے بھی مانوس نہیں ہو سکتا جو برمی حکمرانوں کے ذہن پر مسلط رہتی ہیں۔ ۲۷ مئی ۱۹۹۰ کو (یعنی نوے تقسیم ہونے والی تاریخ کو) انتخابات منعقد ہوئے۔ علاوہ ازیں، یہ تین

عشروں کے عرصے میں کرائے جانے والے پہلے آزاد اور منصفانہ انتخابات تھے۔ فوجی حکمرانوں نے کسی نہ کسی طرح خود کو یقین دلالیا ہو گا کہ اس کے حمایت یافتہ امیدوار جیت جائیں گے، لیکن ہوا یہ کہ برمی جمہوریت کی قوتوں کو زبردست فتح حاصل ہوئی۔ نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی نے ۴۸۵ میں سے ۳۹۲ نشستیں جیت لیں، اور کئی فوجی اڈوں پر بھی کامیابی حاصل کی۔

برمی فوجی حکمراں اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اقتدار سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ اس کے بجائے انھوں نے انتخابات کے نتائج کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا، کسی قسم کی رعایت نہ کی اور جبر میں اَور اضافہ کر دیا۔ انتخابات کے ایک سال بعد تمام جمہوریت پسند رہنما اور چوتھائی کے قریب منتخب نمائندے جیل میں تھے۔ ۱۹۹۱ میں جب منڈالے کے بودھ راہبوں نے گرفتاریوں کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے تو فوجیوں نے، بعض بیانات کے مطابق، چھ سو کے قریب مظاہرین کو ہلاک کر دیا۔ برما کے سرحدی علاقوں میں نسلی اقلیتوں کے خلاف اپنی مہم جاری رکھتے ہوے، حکومت نے ۱۹۹۱ اور اوائل ۱۹۹۲ میں صوبہ اراکان سے دو لاکھ سے زائد برمی مسلمانوں کو ہمسایہ ملک بنگلادیش میں دھکیل دیا۔ اور فوجی حکمراں ملک کے بیش بہا قدرتی وسائل کو ہتھیاروں کی خریداری کے لیے درکار زرِ مبادلہ کے عوض فروخت کرتے رہے۔

اکتوبر ۱۹۹۱ میں، اپنی گھر میں نظربندی کے دوران، آؤن سان سُوچی کو، نوبیل کمیٹی کے الفاظ میں "ایشیا میں زمانۂ حال میں سامنے آنے والی جرأت کی ایک انتہائی غیر معمولی مثال" پیش کرنے پر، نوبیل امن انعام پیش کیا گیا۔ اس انعام کے باعث برمی حکمرانوں پر زبردست بین الاقوامی دباو پڑا، لیکن انھوں نے ایک چھوٹی سی رعایت دینے کے سوا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ ۱۹۹۲ کے موسمِ بہار میں فوجی جُنتا نے مائیکل آرِس کو برما آکر اپنی بیوی سے ملاقات کرنے کی اجازت دی، جس کے بعد اس نے بتایا کہ سُوچی کا عزم "غیر متزلزل" ہے اور وہ اُس وقت تک قید میں رہنے کو تیار ہے جب تک برما کو آزادی نہیں مل جاتی۔

۱۹۹۱ میں مائیکل آرِس نے سُوچی کے مضامین کو ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دیا۔ ان میں سے ایک مضمون میں ایک فقرہ موجود ہے جو ایک نہ ایک روز برما کے فوجی حکمرانوں کی قبر کے لیے موزوں کتبے کا کام دے گا۔

Scanned with CamScanner

It is not power that corrupts but fear. Fear of losing power corrupt those who weild it.

**

Scanned with CamScanner

ذی شان ساحل

کراچی

اور دوسری نظمیں

سرورق اور ڈرائنگز
نفیسہ شاہ

قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

نادین گورڈیمر (Nadine Gordimer)

نادین گورڈیمر جنوبی افریقا سے تعلق رکھنے والی ادیب ہیں۔ وہ ۱۹۲۳ میں جوہانسبرگ میں پیدا ہوئیں اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ انھوں نے اپنی تعلیم پوری کیے بغیر یونیورسٹی چھوڑ دی اور مختلف رسالوں کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ The Soft Voice of Serpent ۱۹۵۳ میں شائع ہوا۔

بہ قول نادین گورڈیمر، "کہانیاں افسانہ نگار کے احساس اور تخیل میں جنم لیتی ہیں۔ کہانی لکھنے کے لیے افسانہ نگار داخلی یا خارجی کسی بھی کیفیت میں اپنے پسینے، خونِ جگر، آنسوؤں کی ایک بوند کی مدد سے ایسی حدت اور شدت پیدا کر دیتا ہے کہ کاغذ بھی خاکستر ہو جاتا ہے۔"

نادین گورڈیمر اپنے پڑھنے والوں کو اپنی کہانیوں کے ذریعے مختلف تہذیبوں کا سفر کراتی ہیں ـــ کبھی موزمبیق کی جنگ کا منظر، کبھی جنوبی فرانس کے ساحل کا احوال، کبھی جوہانسبرگ کے متمول علاقے کی روداد اور کبھی لندن کی عقبی گلیوں کی داستانیں۔ ان کا مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ وہ انسانی بستیوں اور گھروں میں تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے رویّوں کو بڑی چابک دستی سے اپنی گرفت میں لے آتی ہیں۔

ان کی کہانی The Ultimate Safari جس کا ترجمہ یہاں "ہجرت" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے، انگریزی میں برطانوی سہ ماہی جریدے Granta کے شمارہ ۲۸ (خزاں ۱۹۸۹) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسے سفر کی کہانی ہے جس میں دادا دادی، دو پوتے اور ایک پوتی ایک قافلے کے ساتھ موزمبیق سے ہجرت کرتے ہیں، لیکن اپنی انسانی تفصیلات کے اعتبار سے یہ کہانی کسی بھی آشوب زدہ ملک سے ہجرت کی داستان ہو سکتی ہے۔

نادین گورڈیمر نے بے شمار افسانے اور ناول لکھے اور ان کی بہت پذیرائی بھی ہوئی۔ انھیں ۱۹۹۱ میں ادب کا نوبیل انعام ملا۔

نکہت حسن

Scanned with CamScanner

نادین گورڈیمر

انگریزی سے ترجمہ : نکہت حسن

ہجرت

'THE AFRICAN ADVENTURE LIVES ON... YOU CAN DO IT! THE ULTIMATE SAFARI OR EXPEDITION WITH LEADERS WHO KNOW AFRICA.'
(Travel advertisement, *Observer*, 27 November 1988.)

اُس رات ہماری ماں بازار گئی تو پھر واپس ہی نہیں آئی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ میرا باپ بھی ایک دن اسی طرح چلا گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ لیکن وہ تو جنگ لڑ رہا تھا۔ یوں تو ہم بھی جنگ ہی کی حالت میں تھے، لیکن خیر، ہم تو بچے تھے۔ ہم اپنے دادی دادا کی طرح تھے، جن کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے۔ جن لوگوں سے میرا باپ لڑ رہا تھا حکومت اُن کو ڈاکو سمجھتی تھی؛ وہ ہر جگہ اُدھم مچائے ہوئے تھے۔ ہم سب ان سے جان بچانے کے لیے اس طرح ڈر کر بھاگتے تھے جیسے مرغیاں کتّوں سے ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہاں جائیں۔ ہماری ماں اس لیے بازار گئی تھی کہ اسے کسی نے بتایا تھا کہ بازار میں کھانے کا تیل مل رہا ہے۔ ہم اس بات سے بہت ہی خوش تھے، کیوں کہ ہم نے بہت دن سے تیل چکھا تک نہیں تھا۔ ماں کو شاید تیل مل گیا تھا اسی لیے کسی نے اندھیرے میں اُسے قتل کر دیا اور اس سے تیل چھین لیا۔ یا

شاید اس کی ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی ہو گی۔ اگر آپ کا بھی کبھی ڈاکوؤں سے سامنا ہو تو وہ آپ کو بھی مار ڈالیں گے۔ وہ دو بار ہمارے گاؤں میں آئے؛ ہم بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ گئے اور جب وہ چلے گئے تب جھاڑیوں میں سے نکل کر اپنے گھروں میں واپس آئے، اور ہم نے دیکھا کہ وہ ہر چیز کا صفایا کر چکے تھے۔ لیکن تیسری دفعہ انھیں گھر میں کوئی چیز نہیں ملی ــــ نہ تیل، نہ کوئی اور کھانے کی چیز ــــ تب انھوں نے گھر کے چھپر اور پرال کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے ہمارے گھر کی چھتیں زمین پر آ پڑیں۔ میری ماں ٹین کی چادروں کے کچھ ٹکڑے لے آئی جن سے گھر کا کچھ حصہ ڈھک دیا گیا۔ اُس رات ہم اسی چھت کے نیچے بیٹھے اپنی ماں کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

ہم باہر نکلنے سے ڈرتے تھے، اپنے کام کاج کے سلسلے میں بھی، کیوں کہ ڈاکو واقعی پھر آ گئے تھے۔ ہمارے گھر میں تو خیر نہیں آئے ــــ بغیر چھت کا گھر ان کو انسانوں اور سامان سے خالی نظر آیا ــــ مگر پورے گاؤں میں وہ ڈھٹائی سے دندناتے پھرے۔ ہمیں لوگوں کی چیخ پکار اور بھگدڑ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ہم تو اپنی ماں کی ہدایت کے بغیر بھاگنے سے بھی ڈرتے تھے۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں منجھلی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی میرے پیٹ سے ایسے چمٹا ہوا تھا جیسے بندریا کا بچہ اس کے پیٹ سے چمٹا ہوتا ہے، اس طرح کہ اس کے دونوں بازو میری گردن کے گرد تھے اور ٹانگیں میری کمر کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ پوری رات میرا بڑا بھائی گھر کے جلے ہوئے شہتیروں میں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھوں میں تھامے رہا تا کہ اگر ڈاکو اس کو دیکھ لیں تو وہ خود کو ان سے بچا سکے۔

ہم وہاں پورے دن اپنی ماں کا انتظار کرتے رہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سا دن تھا۔ ہمارے گاؤں میں نہ تو کوئی اسکول باقی بچا تھا نہ کوئی گرجا گھر، اس لیے یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کب اتوار ہے اور کب سوموار۔

جس وقت سورج غروب ہو رہا تھا تو ہماری دادی اور دادا آ گئے۔ کسی نے اُن کو اطلاع دے دی تھی کہ ہم بچے گھر میں اکیلے ہیں، ہماری ماں واپس نہیں آئی۔ میں ہمیشہ دادا سے پہلے دادی کا ذکر کرتی ہوں کیوں کہ یہ اسی طرح ہے: ہماری دادی بڑی لحیم شحیم اور قد کاٹھ والی عورت ہے اور ابھی کچھ زیادہ بوڑھی بھی نہیں ہوئی۔ جبکہ ہمارا دادا اتنا چھوٹا ہے کہ آپ سوچ ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے پتلون کے کس کونے میں ہے۔ وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگتا ہے، بغیر سمجھے کہ

Scanned with CamScanner

آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بال ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے انہیں صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا چھوڑ دیا گیا ہو۔ ہماری دادی ہمیں ـــ یعنی مجھے، چھوٹے بھائی، بڑے بھائی اور دادا کو ـــ اپنے مکان میں لے آئی۔ ہم تمام وقت بہت ڈرے ہوئے رہے (سوائے چھوٹے بھائی کے جو دادی کی پیٹھ پر سورہا تھا) کہ کہیں راستے میں ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ ہم بہت دن تک اپنی دادی کے مکان میں انتظار کرتے رہے ـــ شاید ایک مہینے تک۔ ہم بہت بھوکے تھے اور ہماری ماں بھی نہیں آئی تھی۔ جب ہم اپنی ماں کے انتظار میں تھے، کہ وہ آکر ہمیں یہاں سے لے جائے، اس عرصے میں دادی کے پاس ہمارے لیے کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، نہ دادا کے لیے، نہ خود اپنے لیے۔ ایک عورت نے جس کی چھاتیوں میں دودھ تھا، اپنا تھوڑا سا دودھ میرے چھوٹے بھائی کو دیا، حالاں کہ اپنے گھر پر تو وہ ہماری طرح دلیہ ہی کھاتا تھا۔ دادی ہمیں اپنے ساتھ لے کر جنگلی ساگ کی تلاش میں نکلی، لیکن گاؤں کا ہر فرد ہی اس تلاش میں نکلا ہوا تھا، اس لیے ساگ کا ایک پتا بھی کہیں باقی نہ بچا تھا۔

ہمارا دادا چند نوجوانوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ہماری ماں کی تلاش میں نکلا، مگر اسے تلاش نہ کر سکا۔ دادی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر بَین کرنے لگی، اور میں بھی اس میں شامل ہو گئی۔ کچھ لوگ تھوڑی سی پھلیاں وغیرہ کھانے کے لیے لے آئے، مگر دو دن بعد پھر وہی فاقہ تھا۔ دادا کے پاس تین بھیڑیں، ایک گائے اور ترکاریوں کا ایک باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن بھیڑیں اور گائے تو بہت دن ہوئے ڈاکو لے گئے تھے ـــ وہ بھی تو آخر کو بھوکے تھے۔ اور جب بوائی کا وقت آیا تو دادا کے پاس بیج ہی نہ تھے۔

آخر ان دونوں نے طے کر ہی لیا ـــ بلکہ طے تو دادی نے کیا؛ دادا لاکھ چیخا چلّایا اور اِدھر اُدھر پیر پٹختا پھرا، لیکن دادی نے ذرا پروا نہ کی ـــ کہ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ ہم بچے بہت خوش تھے۔ ہم ایسی جگہ سے چلے ہی جانا چاہتے تھے جہاں نہ ماں تھی اور نہ کھانا تھا۔ ہم وہاں جانا چاہتے تھے جہاں ڈاکو نہ ہوں اور کھانا ہو۔ ہم یہ سوچ سوچ کر ہی خوش تھے کہ کہیں بہت دور کوئی ایسی جگہ بھی ہے۔

***

دادی نے اپنی گرجاگھر پہن کر جانے والی پوشاک دے کر بدلے میں کچھ خشک مکئی کے دانے لے لیے اور ان دانوں کو اُبال کر ایک پرانے کپڑے میں باندھ لیا، اور جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو وہ دانے ہمارے پاس تھے۔ دادی کا خیال تھا کہ ہمیں دریا کا پانی مل جائے گا، لیکن ہمیں کوئی دریا وریا نہ ملا۔ ہمیں اتنی سخت پیاس لگی کہ ہمیں واپس مڑنا پڑا۔ لیکن ہم واپس دادی کے گھر نہیں آئے بلکہ ایک ایسے گاؤں میں رک گئے جہاں پانی کا بمبا تھا۔ دادی نے اپنی ٹوکری کھولی جس میں اس نے کپڑے اور مکئی کے دانے ٹھونس رکھے تھے، اور اس بار اپنے جوتے بیچ کر پانی کے لیے ایک بڑا پلاسٹک کا ڈرم خرید لیا۔ میں نے کہا، "گوگو! اب تم بغیر جوتوں کے گرجاگھر کیسے جاؤ گی؟" لیکن اس نے کہا کہ سفر لمبا ہے اور ہم زیادہ سامان نہیں اٹھا سکتے۔ اس گاؤں میں ہمیں اَور لوگ بھی ملے جو اس جگہ کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ مل گئے کیوں کہ وہ سب ہمارے مقابلے میں اپنی منزل سے زیادہ واقف دکھائی دیتے تھے۔

وہاں پہنچنے کے لیے ہمیں کرُوگر پارک سے گزرنا تھا۔ ہم کروگر پارک کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے ـــــ ایک طرح کی پوری کی پوری حیوانوں کی مملکت: ہاتھی، شیر، گیدڑ، لکڑبگھے، تیندوے، مگرمچھ، غرض ہر قسم کے جانور۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے اپنے ملک میں بھی تھے، خاص طور پر لڑائی سے پہلے۔ (ہمارے دادا کو یاد ہے؛ ہم بچے تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔) لیکن ڈاکوؤں نے سارے ہاتھیوں کو مار ڈالا تھا اور ان کے دانت بیچ دیے تھے۔ اور ڈاکوؤں نے اور ہمارے سپاہیوں نے سارے ہرن بھی کھا لیے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ اس کی ٹانگیں ہمارے دریا میں رہنے والے ایک مگرمچھ نے کھا لی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا ملک انسانوں کا ملک ہے، جانوروں کا نہیں۔ ہمیں کروگر پارک کے متعلق معلوم تھا کیوں کہ ہمارے کچھ لوگ اپنا گھروں سے نکل کر ایسی جگہوں پر کام کرنے جاتے تھے جہاں گورے لوگ جانوروں کو دیکھنے کے لیے آکر ٹھہرتے تھے۔

***

Scanned with CamScanner

ہم نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ قافلے میں کچھ عورتیں تھیں اور کچھ میری طرح کے بچے۔ جب عورتیں تھک جاتیں تو چھوٹے بچے ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے تھے۔ ایک آدمی ہمیں کروگر پارک کی طرف لے کر چلا؛ "کیا پارک آ گیا؟ کیا پارک آ گیا؟" میں دادی سے بار بار پوچھ رہی تھی۔ دادی کے جواب نہ دینے پر اس آدمی نے بتایا کہ ابھی نہیں آیا۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ باڑھ کے گرد سے گھوم کر جانے میں بہت لمبا راستا طے کرنا ہو گا۔ باڑھ کے بارے میں اس نے یہ بھی کہا کہ اس کو ہاتھ لگاتے ہی تم مر جاؤ گے؛ اس کو چھوتے ہی تمھاری کھال جل بھن کر کباب ہو جائے گی، بالکل اس طرح جیسے شہروں میں بجلی کے کھمبوں کے اوپر تنے ہوئے تاروں کو چھونے سے ہوتا ہے۔ میں نے مِشن ہسپتال میں ایک لوہے کے ڈبے پر سر کا وہ نشان بنا دیکھا تھا جس پر نہ آنکھیں تھیں نہ کھال اور نہ بال۔ بعد میں یہ ہسپتال بھی دھماکے سے اُڑ گیا۔

جب میں نے اگلی بار وہی سوال کیا تو پتا چلا کہ ہم ایک گھنٹے سے کروگر پارک کے اندر ہی تو چل رہے ہیں۔ مگر وہ تو دیکھنے میں انھیں جھاڑیوں کی طرح لگتا تھا جن میں ہم پورے دن چلتے رہے تھے۔ اور ہمیں کوئی جانور بھی دکھائی نہیں دیا، بس بندر اور چڑیاں جو ہمارے گھر کے آس پاس بھی ہوتی تھیں، اور ایک کچھوا جو بھاگ کر ہم سے دور نہیں جا سکا۔ میرا بڑا بھائی اور دوسرے لڑکے کچھوے کو اُس آدمی کے پاس لے گئے تاکہ اسے مار کر پکایا اور کھایا جا سکے۔ اس نے کچھوے کو چھوڑ دیا کیوں کہ اس کا کہنا تھا کہ وہاں آگ نہیں جلائی جا سکتی۔ جب تک ہم پارک میں تھے، آگ نہیں جلا سکتے تھے، ورنہ دھوئیں سے ہمارا پتا چل جاتا اور پولیس اور پہرے دار آ کر ہمیں واپس وہیں بھیج دیتے جہاں سے ہم چلے تھے۔ اس آدمی نے کہا کہ ہمیں جانوروں کے درمیان جانوروں کی طرح چلنا ہو گا، یعنی سڑک اور گورے لوگوں کے خیموں سے دور دور۔ اسی لمحے مجھے ایک آواز سنائی دی — مجھے یقین ہے کہ یہ آواز سب سے پہلے میں نے ہی سنی — جیسے ٹہنیاں چرچرا رہی ہوں اور کوئی گھاس کو روندتا چلا آ رہا ہو۔ اور میری قریب قریب چیخ نکل گئی کیوں کہ میں نے سوچا کہ شاید پولیس اور پہرے دار ہوں — جن سے وہ آدمی ہمیں چوکنا رہنے کو کہہ رہا تھا — اور انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہو۔ مگر وہ تو ہاتھی نکلا۔ اس کے پیچھے دوسرا ہاتھی، اور اس کے پیچھے بہت سارے ہاتھی جیسے بڑے بڑے کالے دھبے پیڑوں کے درمیان ہر طرف چل پھر رہے ہوں۔ وہ اپنی سونڈوں میں موپین درخت کی لال پتّیوں کو لپیٹ کر اپنے منھ میں ٹھونس رہے تھے۔ ہاتھیوں کے بچے اپنی

ماؤں سے چمٹے ہوئے چل رہے تھے۔ کچھ بڑے بچے آپس میں اس طرح دھینگا مشتی کر رہے تھے جیسے میرا بڑا بھائی اور اس کا دوست ___ بس فرق یہ تھا کہ وہ ہاتھوں کے بجائے سونڈوں سے لڑ رہے تھے۔ مجھے اتنا مزہ آ رہا تھا کہ ڈرنا یاد تک نہ رہا۔ اس آدمی نے کہا کہ جب تک ہاتھی گزر نہیں جاتے ہم خاموش، دم سادھے کھڑے رہیں۔ مگر ہاتھی آہستہ آہستہ، مزے مزے سے گزر رہے تھے، کیوں کہ ہاتھی اتنے لحیم شحیم ہوتے ہیں کہ ان کو کسی سے ڈر کر بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ہرن ہم سے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگتے تھے۔ وہ ہوا میں اتنی اونچی قلانچیں بھرتے مانو اُڑ رہے ہوں۔ جنگلی سور ہماری آہٹ سنتے ہی بالکل ساکت ہو گئے، اور پھر یوں لہریے بناتے ہوئے بھاگے جیسے ہمارے گاؤں میں ایک لڑکا اپنی سائیکل چلاتا تھا جو اس کے باپ نے اسے لا کر دی تھی۔ ہم جانوروں کے پیچھے پیچھے ان کی پانی پینے کی جگہ تک جاتے، اور جانوروں کے جانے کے بعد قریب جا کر پانی پیتے۔ ہمیں کبھی پیاسا نہیں رہنا پڑا، لیکن جانور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ہی رہتے تھے۔ جب دیکھو کبھی گھاس پھوس، کبھی پیڑ پودے، کبھی پیڑوں کی جڑیں اور چھال کھا رہے ہوتے۔ اور اِدھر ہمارے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مکئی کے دانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ اگر ہمارے کھانے کو کچھ تھا تو وہ لنگوروں کی غذا تھی، یعنی چھوٹے چھوٹے، اور چیونٹیوں سے بھرے انجیر جو دریا کے کنارے پیڑوں کی شاخوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ سچ مچ جانوروں کی طرح ہونا بہت مشکل تھا۔

دن میں جب بہت زیادہ گرمی ہوتی تو شیر ہمیں سوتے ہوئے ملتے۔ ان کا رنگ گھاس کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ پہلے پہل ہمیں تو وہ دکھائی ہی نہ دیے، مگر لیکن اُس آدمی کو نظر آ گئے اور وہ ہمیں اس جگہ سے بہت دور جہاں شیر سو رہے تھے، الٹی طرف واپس لے گیا۔ میرا بھی شیروں کی طرح سونے کو بہت جی چاہتا تھا۔ میرا بھائی برابر دُبلا ہو رہا تھا لیکن بھاری ویسا ہی تھا، اور جب دادی میرے بھائی کو میری پیٹھ پر لادنے کے لیے میری طرف دیکھتی تو میں کوشش کرتی کہ اُس کی طرف نہ دیکھوں۔ میرے بڑے بھائی نے بھی بولنا بند کر دیا تھا اور جب ہم آرام کے لیے لیٹتے تو اسے بلا بلا کر جگانا پڑتا، جیسے دادا کی طرح اسے بھی کچھ سنائی نہ دیتا ہو۔ میں نے دادی کے منہ پر مکھیاں رینگتی ہوئی دیکھیں جنھیں وہ اُڑا نہیں رہی تھی۔ مجھے بہت ڈر لگا۔ میں نے پام کی ایک شاخ لے کر ان کو اُڑایا۔

***

ہم دن کے وقت بھی چلتے اور رات کو بھی۔ اب ہمیں گورے لوگوں کے خیمے دکھائی دینے لگے تھے جہاں آگ جل رہی تھی اور کھانا بھی پک رہا تھا، اور ہمیں دھویں اور گوشت دونوں کی خوشبو آرہی تھی۔ ہم نے لکڑبگھوں کو اس خوشبو کے پیچھے جھاڑیوں میں سے بھاگتے ہوئے دیکھا؛ ان کی کمریں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ کسی بات پر شرمندہ ہوں۔ جب کوئی لکڑبگھا اپنی گردن موڑتا تو اس کی آنکھیں ایسی ہی لگتیں جیسی ہماری آنکھیں رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی لگتی ہیں۔ ہوا کے ساتھ ساتھ باڑھ سے گھرے ہوئے احاطوں میں سے ہماری زبان میں بول چال کی آوازیں آرہی تھیں؛ وہاں کیمپوں میں کام کرنے والے رہتے تھے۔ رات کے وقت ہم میں سے ایک عورت مدد مانگنے ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیں کچرے کے ڈرم میں سے بھی کھانے کی کوئی چیز دے سکتے ہیں۔ آخر اس نے رونا شروع کر دیا اور دادی کو اسے سنبھالنا بھی پڑا اور اس کا منہ اپنے ہاتھ سے بند بھی کرنا پڑا۔ اُس آدمی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں کروگر پارک میں کام کرنے والے اپنے لوگوں سے دور دور رہنا ہوگا؛ اگر وہ ہماری مدد کرتے تو اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اگر ان کی نظر ہم پر پڑجاتی تو وہ بس اتنا کرسکتے تھے کہ ظاہر کریں کہ ہم وہاں ہیں ہی نہیں؛ انھوں نے خالی جانور دیکھے تھے۔

کبھی کبھی رات کو ہم سونے کے لیے تھوڑی دیر کو رک جاتے۔ ہم ایک دوسرے سے سٹ کر سوتے تھے۔ مجھے پتا نہیں وہ کون سی رات تھی — کیوں کہ ہم ہر وقت چلتے ہی چلے جا رہے تھے — جب ہم نے کہیں بہت قریب ہی شیروں کی آواز سنی۔ ایسی آواز نہیں جیسی شیر دور سے دہاڑ رہے ہوں، بلکہ کچھ اس طرح جیسے سانس پھولنے کی آواز ہوتی ہے۔ بالکل ویسی جیسی دوڑنے کے بعد ہماری نکلتی ہے۔ لیکن یہ ہانپنے کی آواز کچھ مختلف تھی کیوں کہ وہ دوڑ نہیں رہے تھے، کہیں نزدیک ہی کسی انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم کھسک کر ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے؛ جو کناروں پر تھے ان کی کوشش تھی کہ اندر گھس کر درمیان میں پہنچ جائیں۔ میں بالکل ایک عورت سے لگ کر کھڑی تھی جس کی بدن سے بدبو آرہی تھی کیوں کہ وہ ڈر رہی تھی، لیکن میں

Scanned with CamScanner

خوشی سے اس سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی- میں نے خدا سے دعا مانگی کہ شیر کنارے پر کھڑے کسی ایک کو لے لیں اور یہاں سے چلے جائیں- میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ اس درخت کو نہ دیکھوں جہاں سے کوئی شیر کود کر ہمارے درمیان آ سکتا تھا، بالکل بیچ میں جہاں میں کھڑی تھی- لیکن وہ آدمی اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور ایک سوکھی ٹہنی پیڑ پر زور زور سے مارنے لگا- ہم سے تو اس نے کوئی آواز نہ نکالنے کو کہا تھا اور خود چیخ رہا تھا- وہ شیروں پر ایسے چیخ رہا تھا جیسے ہمارے گاؤں میں ایک نشیارا یوں ہی ہوا میں منھ اٹھا کر چیختا رہتا تھا- شیر چلے گئے- ہم نے دور سے ان کے دہاڑنے اور چیخنے کی آوازیں سنیں-

***

ہم تھک گئے تھے، بہت زیادہ تھک گئے تھے- جب راستے میں ہم کوئی دریا پار کرتے تو میرے بڑے بھائی اور ایک اَور آدمی کو میرے دادا کو اٹھا کر ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک لے جانا پڑتا- میری دادی بہت طاقت ور ہے لیکن اس کے پیروں سے خون بہہ رہا تھا- ہم اتنے تھک گئے تھے کہ سر پر ٹوکری بھی اٹھا کر نہیں چل سکتے تھے، ہم کچھ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے، سوائے میرے چھوٹے بھائی کے- ہم نے اپنی ساری چیزیں ایک جھاڑی کے نیچے چھوڑ دیں- ہم خود ہی وہاں پہنچ جائیں تو بہت ہے، دادی نے کہا- پھر ہم نے بھوک کے مارے کچھ جنگلی پھل کھا لیے جو ہمارے گھر کے آس پاس نہیں ہوتے تھے، اور اس سے ہم سب کے پیٹ خراب ہو گئے اور دست آنے لگے- اُس وقت ہم ایسی گھاس میں سے گزر رہے تھے جو ہاتھی گھاس کہلاتی تھی اور تھی بھی ہاتھی جتنی اونچی- تب ہمارے پیٹوں میں مروڑ شروع ہوئی، اور ہمارا دادا تو میرے چھوٹے بھائی کی طرح سب کے سامنے بیٹھ کر فارغ بھی نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے وہ فارغ ہونے اکیلا ہی گھاس کے اندر چلا گیا- چلتے رہو، چلتے رہو، وہ آدمی ہم سے برابر کہتا رہتا تھا، لیکن ہم نے اس سے دادا کے لیے انتظار کرنے کو کہا-

اب ہر شخص دادا کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا، لیکن وہ اب آیا نہ جب- دوپہر کا وقت تھا؛ ہمارے کانوں میں کیڑے مکوڑوں کے بھنبھنانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ہم گھاس

کی سرسراہٹ نہیں سن سکتے تھے جس سے پتا چلتا کہ وہ واپس آرہا ہے۔ ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ گھاس بہت اونچی تھی اور دادا بہت چھوٹا۔ لیکن ہمیں یقین تھا کہ وہ اپنے ڈھیلے پتلون اور پھٹی ہوئی قمیص میں یہیں کہیں ہوگا؛ ہماری دادی اس کی قمیص سی نہیں سکی تھی کیوں کہ دھاگا نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا کیوں کہ وہ کمزور تھا اور آہستہ چلتا تھا۔ ہم اس کی تلاش میں نکلے، لیکن چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تاکہ گھاس میں کہیں ہم بھی ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ گھاس ہماری ناک اور آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ہم دبی دبی آواز میں دادا کو پکار رہے تھے، لیکن اس کے کانوں میں جو جگہ سماعت کے لیے بچی تھی وہ شاید کیڑے مکوڑوں کی بھنبھناہٹ نے پُر کر دی تھی۔ ہم اسے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک گئے لیکن وہ نہ ملا۔ ہم پوری رات اس اونچی گھاس میں پڑے رہے۔ نیند میں میں نے اسے ایک جگہ گڑمڑی مارے پڑا دیکھا جو اس نے خود کھودی تھی جیسے ہرنیاں اپنے بچوں کو چھپانے کے لیے کھودتی ہیں۔

جب میری آنکھ کھلی تب بھی اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہم نے پھر اس کی تلاش شروع کی۔ ہم نے گھاس پر چل چل کر ایسے راستے بنا دیے تھے کہ اگر ہم اسے نہیں ڈھونڈھ سکتے تھے تو وہ آسانی سے ہمیں تلاش کر سکتا تھا۔ اس پورے دن ہم بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے۔ جب سورج سر پر ہو تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس کی شعاعیں سر میں گھسی جاتی ہیں، چاہے تم جانوروں کی طرح پیڑ کے نیچے لیٹے ہوئے ہو۔ میں چت لیٹی مڑی ہوئی چونچوں اور پر بچی گردنوں والے ان بدصورت پرندوں کو دیکھ رہی تھی جو ہمارے اوپر چاروں طرف اُڑ رہے تھے۔ ہم انھیں اُس وقت بھی دیکھتے ہوئے گزرے تھے جب وہ مُردہ جانوروں کی ہڈیاں کرید رہے تھے، اور ان ہڈیوں میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ اوپر گول گول چکر لگا رہے تھے، کبھی نیچے آکر اُڑنے لگتے اور کبھی اوپر چلے جاتے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی گردنیں کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف مڑ جاتیں۔ وہ اڑتے ہوئے مسلسل چکر لگا رہے تھے۔ میں نے دادی کو دیکھا؛ وہ میرے چھوٹے بھائی کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور وہ بھی ان پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔

شام کے وقت وہ آدمی دادی کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا کہ باقی لوگوں کو اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ اس نے کہا کہ اگر ان کے بچوں کو کھانے کو کچھ نہ ملا تو وہ بہت جلد مر جائیں گے۔

دادی کچھ نہ بولی۔

"میں جانے سے پہلے تمھیں کچھ پانی لادوں گا،" وہ آدمی بولا۔

دادی نے میری طرف، میرے بڑے بھائی کی طرف اور اپنی گود میں لیٹے ہوئے میرے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ ہم دوسرے لوگوں کو جانے کے لیے کھڑے ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ہمارے اردگرد کی وہ گھاس جہاں سب لوگ تھے، خالی ہو جائے گی۔ ہم اس جگہ یعنی کروگر پارک میں اکیلے رہ جائیں گے اور پھر پولیس یا درندے ہمارا کھوج لگا لیں گے۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر ناک سے میرے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے لیکن دادی نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اٹھی اور اپنی ٹانگیں یوں پھیلا لیں جیسے جلانے والی لکڑیاں اٹھاتے وقت پھیلاتی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ میرے بھائی کو اپنی پیٹھ پر لادا اور ایک کپڑے سے اسے اپنے اوپر کس کر باندھ لیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور اس کی بڑی بڑی چھاتیاں، جن میں میرے بھائی کے لیے کچھ بھی نہ تھا، نظر آ رہی تھیں۔ اس نے کہا، "چلو۔"

تب ہم اونچی گھاس والی جگہ کو چھوڑ کر آگے چل دیے۔ وہ جگہ پیچھے رہ گئی۔ ہم اُس آدمی اور باقی سب لوگوں کے ساتھ چل پڑے۔ ہم دوبارہ چلنے لگے۔

***

ایک بڑا سا خیمہ ہے — کسی گرجا گھر یا اسکول سے بھی بڑا — جو زمین میں گڑا ہوا ہے۔ جب ہم بہت چلنے کے بعد یہاں پہنچے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ وہ جگہ ہو گی۔ اس قسم کی جگہ ہم نے اُس وقت بھی دیکھی تھی جب ہماری ماں ہمیں ساتھ لے کر شہر گئی تھی کیوں کہ اس نے سنا تھا کہ ہمارے فوجی وہاں آئے ہوئے ہیں، اور وہ ان سے ہمارے باپ کا اتا پتا پوچھنا چاہتی تھی۔ اُس خیمے میں لوگ دعا مانگ رہے تھے اور گا رہے تھے۔ یہ خیمہ بھی اُسی خیمے کی طرح نیلا اور سفید ہے لیکن یہ دعا مانگنے یا گانے کے لیے نہیں ہے۔ ہم یہاں ان دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں جو ہمارے ملک سے آئے ہیں۔ مطب کی نرس کہتی ہے کہ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر ہم کل دو سو افراد ہیں۔ کچھ نئے پیدا ہونے والے بچے بھی ہیں جو اُس وقت پیدا ہوئے جب ہم کروگر پارک میں سے گزر رہے تھے۔

دن کے وقت بھی جب سورج چمک رہا ہوتا ہے، خیمے کے اندر اندھیرا رہتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پورا گاؤں یہیں آ بسا ہو۔ اندر مکانوں کے بجائے ہر خاندان نے اپنے رہنے کی جگہ کو بوریوں یا گتّے کے بکسوں سے ــــ جو کچھ بھی ہاتھ لگے ــــ گھیر لیا ہے تاکہ دوسرے خاندان کو جتا سکیں کہ یہ ان کی جگہ ہے اور اس جگہ میں کوئی اَور داخل نہ ہو۔ حالاں کہ یہاں نہ کوئی دروازہ ہے نہ کھڑکی، اور نہ کوئی چھپر، اور کوئی بڑا اگر کھڑا ہو کر دیکھے تو ہر ایک کے گھر کے اندر جھانک سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے تو پتھروں کو پیس کر رنگ بھی گھول لیا اور بوریوں پر تصویریں بنا لیں۔

ویسے چھت تو یہاں ضرور ہے ــــ اوپر، بہت دور، خیمے کا سائبان۔ بالکل آسمان کی طرح۔ کسی بڑے سے پہاڑ کی طرح جس کے اندر ہم رہ رہے ہوں۔ خیمے کی درازوں میں سے گرد کے راستے سے نیچے کی طرف آتے دکھائی دیتے ہیں، جو اتنے چوڑے ہیں کہ لگتا ہے ہم ان پر چڑھ سکتے ہیں۔ خیمے کی چھت اوپر سے بارش کے پانی کو اوپر سے آنے سے تو روک لیتی ہے لیکن پانی نیچے سے بہہ بہہ کر اندر آ جاتا ہے اور ہمارے اپنے بنائے ہوئے مکانوں کی گلیوں میں پھیل جاتا ہے ــــ یہ گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ان میں ایک وقت میں ایک ہی آدمی چل کر جا سکتا ہے ــــ اور چھوٹے بچے، جیسے میرا چھوٹا بھائی ہے، کیچڑ میں کھیلنے لگتے ہیں۔ تب ان بچوں پر سے پھلانگ کر ہی گزرا جا سکتا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی نہیں کھیلتا۔ دادی اسے ہر سوموار کو، جب ڈاکٹر آتا ہے، مطب لے جاتی ہے۔ نرس بتاتی ہے کہ اس کے سر میں کچھ خرابی ہے؛ اس کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جہاں سے آئے ہیں وہاں ہمیں کم خوراک ملتی تھی۔ جنگ کی وجہ سے۔ یا شاید اس وجہ سے کہ ہمارا باپ وہاں نہیں تھا۔ یا پھر شاید اس وجہ سے کہ وہ کروگر پارک سے گزرنے کے پورے وقت بھوکا رہا تھا۔ اسے تو بس دن بھر دادی کے پیٹ پر یا گود میں پڑے رہنا، یا اس سے ٹیک لگائے بیٹھے رہنا ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ وہاں سے ہمیں تکتا رہتا ہے۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر اس سے بولا نہیں جاتا۔ جب میں اس کے گدگدی کرتی ہوں تو وہ صرف مسکرا دیتا ہے۔ مطب سے اسے کھلانے کے لیے ایک سفوف ملا جسے گھول کر اس کے لیے دلیہ بنایا جاتا ہے، اور شاید ایک دن وہ ٹھیک ہو جائے۔

جب ہم یہاں پہنچے تب ہماری ــــ میری اور میرے بڑے بھائی کی ــــ حالت بھی بالکل اسی کی طرح تھی۔ مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں آتا۔ خیمے کے پاس گاؤں میں رہنے والے لوگ ہمیں مطب

میں لے گئے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہیں جا کر اپنا نام لکھوانا پڑتا ہے ___ کہ ہم وہاں سے نکل آئے ہیں، کروگر پارک کے راستے۔ ہم گھاس پر بیٹھ گئے اور ہر چیز گڈمڈ ہوتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایک نرس جو اپنی سیدھے بنے ہوئے بالوں اور اونچی ایڑی کے خوب صورت سینڈلوں کی وجہ سے بہت پیاری لگ رہی تھی، ہمارے لیے یہی خاص سفوف لے کر آئی اور بتایا کہ ہم یہ سفوف پانی میں گھول کر آہستہ آہستہ پییں۔ ہم نے پیکٹ کو دانتوں سے پھاڑا اور سفوف کو منہ میں ڈال لیا۔ سفوف منہ کے اندر چپک گیا۔ میں نے ہونٹوں اور انگلیوں پر لگے ہوئے سفوف کو چوس لیا۔ کچھ دوسرے بچے جو ہمارے ساتھ ہی آئے تھے، اُلٹیاں کرنے لگے۔ مجھے بھی اپنے پیٹ اندر کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ سفوف سانپ کی طرح رینگتا ہوا اندر جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہچکیاں آنا شروع ہوئیں جن سے میرا برا حال ہو گیا۔ دوسری نرس نے ہمیں مطب کے برآمدے میں قطار بنا کر کھڑے ہونے کو کہا مگر ہم کھڑے نہ ہو سکے۔ ہم وہاں اِدھر اُدھر ایک دوسرے پر گرے ہوئے بیٹھے تھے۔ نرسوں نے ہر ایک کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور بازو میں سوئیاں لگائیں۔ دوسری سوئیوں سے ہمارا خون لے کر چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں ڈالا۔ یہ سب بیماری کی روک تھام کے لیے کیا جا رہا تھا، مگر میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب بھی میری آنکھ لگتی مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میں لمبی گھاس میں بس چلے ہی جا رہی ہوں۔ مجھے ہاتھی بھی دکھائی دیتے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔

لیکن دادی اب بھی طاقت ور تھی، وہ کھڑی بھی ہو سکتی تھی اور اسے لکھنا بھی آتا تھا، اس لیے اس نے ہمارے لیے بھی دستخط کیے۔ ہماری دادی نے خیمے کی ایک دیوار کے بالکل ساتھ یہ جگہ لی؛ یہ خیمے میں بہترین جگہ ہے۔ یہاں بارش کا پانی تو بے شک اندر آتا ہے مگر جب موسم اچھا ہو تو ہم پردہ اٹھا سکتے ہیں اور سورج ہمارے سامنے ہوتا ہے اور سیلن کی بد بو جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ دادی یہاں ایک عورت کو جانتی ہے جس نے اسے بتایا کہ سونے کی چٹائی بنانے کے لیے عمدہ گھاس کہاں سے لی جائے، اور دادی نے ہمارے لیے چٹائیاں بنا دیں۔ مہینے میں ایک بار کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا ٹرک مطب میں آتا ہے۔ دادی اپنا دستخط کیا ہوا کارڈ لے کر وہاں جاتی ہے، اور اس کے کارڈ میں چھید ہونے کے بعد ہمیں مکئی کے دانوں کی ایک بوری مل جاتی ہے۔ بوریوں کو خیمے تک لانے کے لیے وہاں ایک پہیے والی ریڑھیاں ہیں؛ میرا بڑا بھائی بوری اس پر رکھ کر لے آتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ واپسی میں وہ اور دوسرے لڑکے خالی ریڑھیوں کو دھکیلتے ہوئے مطب کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اسے کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جس نے گاؤں سے بیئر کی بوتلیں خریدی ہوں، اور اسے ان بوتلوں کو پہنچانے کے کچھ پیسے مل جاتے ہیں ــــ ویسے اس کی اجازت نہیں ہے، ریڑھیوں کو سیدھا نرسوں کے پاس واپس پہنچانا ہوتا ہے۔ میرا بھائی ان پیسوں سے شربت خریدتا ہے اور میرے مانگنے پر تھوڑا سا شربت مجھے بھی دے دیتا ہے۔ مہینے میں ایک اَور دن گرجاگھر سے کپڑوں کا ایک گٹھر مطب کے صحن میں آتا ہے۔ دادی کے پاس ایک اَور کارڈ ہے جس میں چھید کروانے کے بعد ہم وہاں سے اپنی پسند کا کوئی لباس لے سکتے ہیں: میرے پاس دو جوڑے، دو پتلون اور ایک جرسی ہو گئی ہے، اور اب میں اسکول جا سکتی ہوں۔

گاؤں والوں نے ہمیں اپنے اسکول میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ہماری ہی زبان بولتے ہیں۔ دادی کہتی ہیں شاید اسی وجہ سے انھوں نے ہمیں اپنے علاقے میں رہنے دیا ہے۔ بہت دن پہلے، ہمارے آباواجداد کے وقتوں میں، ایسی کوئی باڑھ نہیں تھی جس کو چھونے سے لوگ مر جاتے ہیں، نہ اُن کے اور ہمارے درمیان کوئی کروگر پارک تھا۔ ہم سب ایک تھے، اپنے گاؤں سے لے کر یہاں تک، جہاں ہم اب آ گئے ہیں، اور ہمارا ایک ہی بادشاہ تھا۔

***

ہمیں اس خیمے میں رہتے رہتے بہت دن ہو گئے ہیں ــــ اب میں گیارہ سال کی ہوں اور میرا چھوٹا بھائی لگ بھگ تین سال کا، حالاں کہ وہ بہت چھوٹا سا ہے، صرف اس کا سر بہت بڑا ہے۔ وہ ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اب کچھ لوگوں نے خیمے کے ارد گرد کی خالی زمین کو کھود کر وہاں مکئی اور کرم کلّا بو دیا ہے۔ بوڑھے لوگوں نے شاخیں جوڑ جوڑ کر اپنی کیاریوں کے گرد باڑھیں لگالی ہیں۔ کسی کو شہر میں جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن کچھ عورتوں نے گاؤں ہی میں کام تلاش کر لیا ہے اور اب وہ کچھ خریداری بھی کر سکتی ہیں۔ دادی اب بھی طاقت ور ہے، اس لیے وہ بھی ایسی جگہ جہاں لوگ مکان بنا رہے ہوں، کام ڈھونڈھ لیتی ہے ــــ اس گاؤں میں لوگ اینٹوں

اور سیمنٹ سے بہت خوب صورت مکان بناتے ہیں، ہمارے گاؤں کی طرح مٹی اور گارے سے نہیں۔ دادی لوگوں کے لیے اینٹیں اور پتھروں کی ٹوکریاں سر پر ڈھو کر لے جاتی ہے۔ اب اس کے پاس شکر، چائے، دودھ اور صابن تک خریدنے کے پیسے ہوتے ہیں۔ اسٹور والوں نے اسے ایک کیلنڈر بھی دیا جو اس نے خیمے میں ہمارے پاس کے پردے پر ٹانگ دیا ہے۔ میں اسکول میں بہت تیز ہوں اور اس نے لوگوں کے پھینکے ہوئے اشتہاروں کے صفحے جمع کر کے میری کتابوں پر چڑھا دیے ہیں۔ وہ ہر سہ پہر کو مجھے اور بڑے بھائی کو اسکول کا کام پورا کرنے کے لیے بٹھا دیتی ہے، اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے، کیوں کہ یہاں خیمے میں صرف سٹ کر لیٹنے بھر کی جگہ ہے، جیسے ہم کروگر پارک سے گزرتے ہوئے لیٹا کرتے تھے، اور موم بتیاں بہت مہنگی ہیں۔ دادی ابھی تک اپنے لیے جوتے نہیں خرید سکی جنھیں پہن کر گرجا گھر جا سکے لیکن اس نے میرے اور بڑے بھائی کے لیے اسکول کے کالے جوتے اور ان پر کرنے کے لیے پالش خرید لی ہے۔ ہر صبح جب خیمے میں لوگ بیدار ہو رہے ہوتے ہیں، بچے روتے چلاتے ہیں، لوگ باہر نکلنے پر ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں اور کچھ بچے پتیلیوں میں سے رات کا بچا ہوا دلیہ کھرچ کھرچ کر کھا رہے ہوتے ہیں، میں اور میرا بڑا بھائی اپنے جوتے پالش کرتے ہیں۔ دادی ہمیں ٹانگیں سیدھی کر کے چٹائی پر بٹھا دیتی ہے اور ہمارے جوتوں کا غور سے معائنہ کرتی ہے کہ ہم نے ٹھیک پالش کیے ہیں یا نہیں۔ خیمے میں اور کسی بھی بچے کے پاس اسکول کے سچ مچ کے جوتے نہیں ہیں۔ جب ہم تینوں ان جوتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے ہم اپنے گھر میں ہیں، کہیں بھی جنگ نہیں ہو رہی ہے اور نہ ہم کہیں اور گئے ہیں۔

کچھ گورے لوگ خیمے میں رہنے والے ہمارے لوگوں کی تصویریں اتارنے آئے ___ وہ کہتے تھے کہ وہ فلم بنا رہے ہیں۔ میں نے کبھی فلم نہیں دیکھی حالاں کہ میں اس کے بارے میں جانتی ہوں۔ ایک گوری عورت ہماری جگہ میں گھس آئی اور دادی سے سوال کرنے لگی جو ایک آدمی، جو اس عورت کی زبان سمجھتا تھا، ہماری زبان میں دُہراتا۔

"تم یہاں کب سے اس طرح رہ رہی ہو؟"

"کیا مطلب؟ یہاں؟" دادی نے کہا۔ "اس خیمے میں؟ دو سال اور ایک ماہ سے۔"

"اور مستقبل کے بارے میں تمھاری کیا امیدیں ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں بس یہیں ہوں۔"

"لیکن تمھارے بچے؟"

"میں چاہتی ہوں وہ پڑھ لکھ جائیں تاکہ انھیں اچھی نوکری اور اچھے پیسے مل سکیں۔"

"کیا تمھیں امید ہے کہ تم اپنے ملک واپس جاسکو گی؟"

"میں واپس نہیں جاؤں گی۔"

"لیکن آخر جب جنگ ختم ہو جائے گی تب تو تمھیں یہاں رہنے کی اجازت نہ ہو گی۔ کیا تم اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتیں؟"

میرا خیال تھا اب دادی کچھ اور نہیں بولنا چاہتی۔ میرا خیال تھا وہ گوری عورت کے سوال کا جواب نہیں دے گی۔ گوری عورت نے اپنی گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مسکرائی۔

دادی نے اس کی طرف سے منھ پھیر لیا اور بولی، "اب کچھ نہیں ہے۔ کوئی گھر نہیں۔"

دادی نے ایسا کیوں کہا؟ آخر کیوں؟ میں تو واپس جاؤں گی۔ میں اسی کروگر پارک سے گزر کر واپس جاؤں گی۔ جنگ کے بعد، اگر سب ڈاکوؤں کا صفایا ہو گیا، تو شاید ہماری ماں وہاں ہمارا انتظار کر رہی ہو۔ اور شاید ہمارے دادا نے، جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے، راستا ڈھونڈھ لیا ہو، اور شاید وہ آہستہ آہستہ کروگر پارک سے ہوتا ہوا گھر واپس پہنچ گیا ہو! وہ سب گھر میں ہوں گے، اور میں انھیں یاد رکھوں گی۔

**

عامر حسین (Aamer Hussein)

انگریزی کے افسانہ نگار عامر حسین ۱۹۵۵ میں کراچی میں پیدا ہوے اور ان کی پرورش پاکستان اور ہندوستان میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی تعلیم لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز سے تاریخ میں ایم اے کی ڈگری لے کر مکمل کی۔ وہ اب لندن میں مقیم ہیں اور اسی تعلیمی ادارے سے جزوقتی طور پر وابستہ ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۸۷ میں ہوا اور تب سے وہ متعدد جریدوں اور حوالے کی کتابوں کے لیے تنقیدی مضامین اور تبصرے تحریر کر چکے ہیں۔ ان کی کہانیاں مختلف انتخابات میں شامل ہو چکی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ *Mirror to the Sun* کے عنوان سے ۱۹۹۳ میں شائع ہوا۔

ان کی جس کہانی کا ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، وہ اسی مجموعے میں Little Tales کے عنوان سے شامل ہے۔

عامر حسین

انگریزی سے ترجمہ : فہمیدہ ریاض

چھوٹی چھوٹی کہانیاں

دیواریں چنبیلی کی بیلوں سے ڈھکی پڑی تھیں اور باغیچے میں فرنجی پانی کے جھاڑ اُگے تھے۔ صحن میں ایک بادام کا پیڑ تھا اور ہماری گلی میں امرودوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ کبھی کبھی ہم دیوار پھلانگ کر پڑوس کے گھر میں پھل چُرانے یہ سوچ کر پہنچ جاتے کہ بڑی بی تو سو رہی ہوں گی۔ ہفتوں تک ہمیں یہی خیال رہا کہ ہمارے ڈاکے کا کسی کو بھی پتا نہیں چل سکا — اور پھر ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ وہ تنکوں کی ٹوکری لیے چلی آ رہی ہیں اچار ڈالنے کے لیے کیریوں کی فرمائش کرتی۔ پھر ہماری مہمات کا مزہ جاتا رہا۔

چنبیلی میں گرگٹ رینگتے، مگر ان کو گل مُہر اور بادام کے درخت پسند نہیں تھے۔ ہم ان کے پیچھے غلیل لیے پھرتے؛ بولتے وقت منہ کھولنے پر ہاتھوں سے دانت چھپاتے۔ بوڑھے ابراہیم نے ہمیں بتا دیا تھا کہ اگر گرگٹوں نے ہمارے دانت گن لیے تو ایکو ایک دانت جھڑ جائے گا۔ گرگٹوں کے بارے میں ایک اَور کہانی بھی تھی — انھوں ہی نے دشمنوں کو رسول اللہ کے چھپنے کی جگہ بتائی تھی، اور اب ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ میاں کا عذاب نازل ہو چکا تھا، اور ہم انھیں ماریں تو کوئی حرج نہ تھا۔

Scanned with CamScanner

مارنا تو ہم تُرکن کے بلّے کو چاہتے تھے مگر ان ہزاروں بلّوں اور بلّیوں میں جنھیں ابراہیم پال رہا تھا، پنکی اُسے سب سے پیارا تھا۔ ابراہیم کو سڑکوں پر آوارہ گھومنے والوں کی سرپرستی کا خبط تھا۔ اس کے باورچی خانے سے فقیروں کو ٹکڑے میسّر آجاتے، اُسے گھونسلوں سے گرے ہوئے پرندوں کے ننھے منے بچے اور گھروں سے بھاگے ہوئے چوزے مل جاتے۔ ایک بار تو اُسے ایک مور تک مل گیا تھا۔ اور بلّیاں! اُن کا تو وہ شہنشاہ تھا۔ وہ مچھلیوں کے سروں سے ان کی تواضع کیا کرتا اور بلّیاں اس کے لیے تین مختلف قسم کے راگ الاپتیں: ایک بھوک کا، ایک دعوت کا اور ایک جشن منانے کا راگ۔ یہ جنگلی بلّے ہم سے دور ہی رہتے اور صرف باورچی خانے کی سیڑھیوں تک آتے۔ مگر پنکی کی تو بات ہی کچھ اَور تھی۔ وہ ایک بڑا وحشی نَر تھا، بالکل جنگلی بلّا۔ وہ دوسرے جنگلی بلّوں سے دُور رہتا، بجز اس وقت کے جب اُن سے بھِڑ رہا ہوتا۔ تُرکن کو وہ جب ملا تو اُون کا ایک گولا تھا۔ ترکن نے اسے پالا پوسا اور صرف وہی اسے قابو بھی کر سکتی تھی۔ لیکن چاروں طرف تباہی مچاتے اور ہراس پھیلاتے ہوئے حملہ کرنے کا شوق اُسے ہمارے اور پڑوس کے فلیٹ پر ہی تھا۔ جب ابراہیم پہلے پہل ـــــ خود بھی نیم وحشی اور نیم پاگل ـــــ سر چھپانے کی جگہ اور ملازمت کی تلاش میں ہماری گلی میں آیا تھا اور ہم نے اسے باورچی رکھ لیا تھا، تو چند ہی ہفتوں میں وہ پنکی کا دوسرا مالک بن بیٹھا تھا، چوں کہ شاید دونوں ہی بے سدھائی مخلوق تھے۔

جہاں تک میری یادداشت کا گزر ہے، ہم اسی فلیٹ میں رہتے آئے تھے، حالاں کہ ابّا ہمیں اُن دنوں کی باتیں سنایا کرتے تھے جب وہ اور امّی کراچی میں پناہ گیر بن کر وارد ہوئے تھے۔ تب وہ مضافات کی گندی بستیوں میں رہتے تھے۔ وہ ٹین کی چھت والی ایسی جھگیوں میں بھی رہے تھے جو ہمارے بچپن کے زمانے میں ابھی گرائی جا رہی تھیں۔ ابّا کی ملازمت میں ترقی ہوتی گئی، اور انھوں نے تھوڑی سی بچت بھی کر لی تھی، تو امی اور ابا نے بہتر علاقے میں رہائش اختیار کرنے کی ٹھانی تاکہ ہماری پرورش کچھ بہتر طریقے سے ہو سکے۔ امی جس اسکول میں پڑھاتی تھیں اس میں ان کے ساتھ کام کرنے والی ایک خاتون نے انھیں بتایا تھا کہ جس عمارت میں وہ رہتی ہیں وہاں ایک فلیٹ خالی ہے۔ یہ عمارت ترکن کا مکان تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ تُرکن کہاں سے آئی تھی، یہ مکان اسے کیسے مل گیا تھا اور یہ کہ وہ واقعی تُرک تھی بھی یا نہیں۔ وہ بمبیّا اردو بولتی تھی، اس کے سُرخ بال کھردرے اور بکھرے بکھرے تھے

اور وہ لمبی لمبی سہ پہروں میں، جب سارا پڑوس سوتا تھا، گراموفون پر ایسے گیت سنتی رہتی جنھیں ہم "جنگی نغمے" کہتے تھے۔ اس کا یہ لق و دق مکان تھا اور ایک شوہر جو کبھی کبھار ہی امریکا سے آیا کرتا تھا اور اس کا بیٹا زیادہ لگتا تھا۔ ترکن نے دُہراہت کے خیال سے مکان کی دوسری منزل پر فلیٹ کرائے پر اٹھا دیے تھے اور آپا کا، جنھوں نے ہمارے لیے مکان ڈھونڈا تھا، کہنا تھا کہ بے دھیانی کے کسی لمحے میں ترکن نے ان سے اعتراف کیا تھا کہ جب وہ بالکل تنہا ہوتی ہے تو دیواریں اژدہوں اور بھیڑیوں کا روپ لے کر اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس کا کرایہ حیران کن طور پر کم تھا اور اس کے یہاں کوئی نوکر زیادہ دن نہیں ٹکتا تھا کیوں کہ اس میں دو بڑے عیبوں ــــ یعنی واگنر اور پنکی ــــ کے علاوہ یہ عیب بھی تھا کہ مہینے میں ایک بار وہ غصے میں بھوت بن جاتی تھی اور اُس وقت جو بد نصیب بھی اس کی ملازمت میں ہوتا اُس پر برس پڑتی تھی۔ اس موقعے پر وہ اس قدر زور سے چلاتی تھی اور ایسی فحش کلامی کرتی تھی کہ سارا پڑوس سنتا تھا۔ جن کے گھروں کی کھڑکیاں کھلی ہوتیں وہ فوراً انھیں اس فحش کلامی کے احتجاج میں بند کر لیتے، اور جن کی کھڑکیاں بند ہوتیں وہ یہ معلوم کرنے کے لیے انھیں بھڑاق سے کھول لیتے کہ آخر پڑوس کا سکون کون غارت کر رہا ہے۔

اکثر دوسرے دن نوکر ملازمت چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا اور وہ قدیم دمے کے آزار سے بستر میں پڑ جاتی تھی۔ ترکن کی آواز پر یوں تو ہمیشہ دمے کا اثر رہتا تھا مگر چیخنے چلانے سے اس پر خاص طرح کے دورے پڑتے تھے۔ چند مہینوں کے وقفے سے محلے کا ڈاکٹر اپنی کھٹارا اوپل میں اس کا علاج کرنے آیا کرتا۔ آپا کی اماں کے مطابق، علاج وِلاج تو وہ خاک کرتا ہو گا؛ بس بُڑھیا کا دل بہلانے آتا تھا اور جاتے ہوئے اکثر اس میں سے اُس برانڈی کی مہک آتی تھی جو وہ بڑی بی کے سینے کے لیے تجویز کرتا تھا۔

ان عیبوں سے ہٹ کر ترکن ایک خوش گوار، خاموش مزاج عورت تھی جو عام طور پر ایسے موقعوں پر بھی بس خاموشی سے مسکراتی اور سر ہلاتی رہتی جب وہ کبھی کبھار ریشمی گاؤن اور مہین اسکارف پہن کر رکشا میں بیٹھ کر کہیں جایا کرتی تھی اور سارے محلے والے اندازہ لگاتے رہ جاتے کہ وہ کہاں گئی ہو گی۔

چند ہفتوں کے وقفے سے وہ ہمیں بھی بُلا بھیجتی۔ پھر وہ ہمیں طویل مسحور کن کہانیاں سناتی

جن میں اُڑنے والی مچھلیاں ہوتیں اور لکڑی کے گھوڑے ـــــ حالاں کہ اس میں یہ پاگل کر دینے والی عادت تھی کہ کہانی ختم ہونے سے ذرا پہلے گہری نیند سو جاتی تھی۔ اس پر جب ہم کِھس کِھس کر کے ہنستے تو وہ جاگ پڑتی اور کہتی: کہانی سنانے کا فن ہی یہ ہے کہ اسے ادھورا چھوڑ دیا جائے۔ اگلی قسط سننے کے لیے کل آنا۔" پھر ہم بھاگ جاتے اور کتنے ہی دن اس کے بلاوے کا انتظار کرتے رہتے، جو کئی ہفتوں کے بعد آتا۔ تب وہ کہتی: "ہاں، تو ہم کہاں تک پہنچے تھے؟" اور عین وہیں سے کہانی سنانا شروع کرتی جہاں پچھلی بار چھوڑا ہوتا، جیسے اس نے کسی دکھائی نہ دینے والی کتاب میں ریشمی ڈوری سے نشانی لگا رکھی ہو۔

۱۹۶۴ میں جب بھیّا اور اَمّاں ہندوستان سے آئے تو اس نے ایک مرتبہ عجیب سے انداز میں تبصرہ کیا تھا: "چلو اچھا ہوا، دو سے بھلے چار!" اور ہوا بھی یہی، کہ شروع میں تو وہ بس گرمیاں گزارنے آئے تھے مگر پھر یہیں کے ہو رہے۔ اَمّاں میرے ابّا کی بیوہ بہن تھیں اور بھیّا ان کے بیٹے، جو مجھ سے کچھ بڑے تھے؛ اُن کی عمر سولہ سال رہی ہو گی جب میں دس برس کا ہوں گا۔ وہ ہمارے کچھ کھیلوں میں شریک ہوتے، کچھ نئے کھیل ایجاد کرتے، اور پھر اچانک بڑوں کی طرح پرے ہو جاتے اور اپنی جنگی کامک کتابوں، ریڈیو پروگراموں اور تنہا گھومنے پھرنے میں لگ جاتے۔ نہ جانے کس طرح انھوں نے کسی سے ایک کھٹارا سی موٹر سائیکل بھی خرید لی تھی۔ آپا کی اَمّاں نے اس پر کہا تھا: "بہن کھنے کی بات تو نہیں، اور اللہ معاف کرے جو میں کسی مصیبت کے مارے پر انگلی اٹھاؤں، مگر یہ ماں بیٹے مہینوں سے تو تمھارے یہاں مہمان ہیں۔ جوان لڑکا ماشاءاللہ جی کھول کر کھاتا پیتا ہے مگر کام ٹکے کا نہیں کرتا۔ ایک تم ہو کہ دن بھر محنت کر کے سب کا پیٹ پال رہی ہو، اور یہاں صاحبزادے اپنے لیے موٹر سیکل خرید رہے ہیں۔"

"اَمّاں، میں ملازمت اپنے شوق سے کرتی ہوں،" امّی نے کہا تھا، جو اُس وقت سے کام پر جا رہی تھیں جب ہماری عمریں تین چار برس کی تھیں۔ پھر امّی نے کہا تھا: "یوں بھی یہ ہم پر بوجھ کہاں ہیں! بچوں کے ساتھ میری نند میرا بڑا ہاتھ بٹاتی ہیں۔" جبکہ اس بات میں بہت سچ نہ تھا، کیوں کہ ہمارا اسکول امّی کے اسکول کے بعد بند ہوتا تھا اور امّی بیشتر اوقات دوپہر کی سخت گرمی میں ہمیں اپنے ساتھ لانے کے لیے پینتالیس منٹ انتظار کرتی تھیں۔

کبھی کبھی بھیّا ہمیں اسکول سے اپنے ساتھ لاتے۔ نہ جانے کن کرتبوں سے وہ ہم دونوں کو

اپنی موٹر سائیکل پر جمانے میں کامیاب ہو جاتے، یہاں تک کہ ایک دن ابّا نے ہمیں پکڑ لیا اور بھیّا کو ٹریفک کے خطرات پر ایسی ڈانٹ پلائی کہ زندگی بھر نہ بھولیں۔ ظاہر ہے ہم نے ابّا کو یہ نہیں بتایا کہ خطرے ہی میں تو سارا مزہ تھا۔ ابا اخبار میں کام کرتے تھے اور کچھ زمانے تک ان کے پاس ایک کار بھی تھی۔ صبح کے وقت وہ امّی اور آپا کو ان کے اسکول چھوڑتے، اس کے بعد ہمیں ہمارے اسکول پہنچاتے اور پھر پولو گراونڈ کے پاس اپنے دفتر چلے جاتے تھے۔ اپنی کلاسیں لے کر آپا رکشا میں ویمنز کالج چلی جاتی تھیں جہاں وہ ہسٹری اور پولیٹیکل سائنس کی کلاسوں میں بیٹھتی تھیں۔ ان کی تمنّا تھی کہ وہ وکیل بنیں، مگر ان کی عمر تیئیس برس کی ہو چکی تھی اور شادی اب تک نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہتیں کہ اب تو وکالت پاس کرنے کا وقت نکل چکا ہے۔ امّی دوسری رکشا لے کر گھر آتی تھیں اور اماں دونوں پر اعتراض کرتی رہتی تھیں ــــ ان کے نئے خیالات پر، شہروں کے طور طریقوں پر جن کے مطابق اکیلی عورتوں کے غیر مردوں کے ساتھ سواریوں میں مارے مارے پھرنے میں کوئی حرج ہی نہ تھا۔ امی ہمیشہ کی طرح خاموش رہتیں؛ اگر کبھی اماں کی جارحیت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی تو چپکے چپکے رونے لگتیں۔ اماں کہتیں: "توبہ! میری بھی کیا مت ماری گئی ہے! بِٹیو، میری باتوں کا برا مت مناوَ۔ تمہارا ہی نمک کھا کر تمھیں پر اعتراض کر رہی ہوں۔ بُوا، میں ٹھہری گنوارن، تم شہر والوں کے طور طریقے کیا سمجھوں!"

اماں عمر بھر اجمیر میں رہی تھیں۔ اماں بھی کہانیاں سنانے میں طاق تھیں، مگر اُن کی کہانیاں رُکن کی کہانیوں سے مختلف ہوتی تھیں۔ اماں کی داستانیں تو سچ مچ کے لوگوں کے بارے میں ہوتی تھیں، کنبے بھر کے ان ایک ہزار افراد کے بارے میں جنھیں ہم نہیں جانتے تھے؛ ان کی شادیوں اور بیاہوں اور منگنیاں ٹوٹنے اور بیویوں پر سَوتیں لا بٹھانے کی کہانیاں۔ ہم گھنٹوں ان کی کہانیاں سن سکتے تھے، مگر کبھی کبھی سب رشتوں ناتوں کی ڈوریاں آپس میں ایسی اُلجھتیں اور مسئلے اتنے پیچیدہ ہو جاتے کہ ہماری سمجھ میں خاک نہ آتا۔ پھر کبھی وہ اپنی رو میں بہہ جاتیں اور "پارٹیشن" کے قصّے سنانے لگتیں، جس کے بارے میں ہمیں بھی کچھ کچھ پتا تھا کیوں کہ امّی ابّا بھی اس سے گزرے تھے، اور مذہبی دشمنیوں کے قصّے، جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتے تھے کیوں کہ جس کراچی کو ہم جانتے تھے وہاں تو سب مسلمان رہتے تھے (سوائے چند پارسی ٹیچروں کے، یا عیسائی ٹیچروں کے، یا بھنگیوں کے، جنھیں "کنورٹ" کہا جاتا تھا اور جو عیسائیوں سے مختلف تھے، جبکہ عیسائی

یورو پینوں سے مختلف تھے۔) لگتا تھا کہ ہندوستان ایک نہیں بلکہ دو ہیں؛ ایک ہندوستان میں تو عجیب و غریب دیوی دیوتا ہیں جن کے چہرے ہاتھیوں کے ہیں اور لمبی لمبی دو مُونہی زبانیں ہیں اور سیکڑوں بازو ہیں، اور دوسرا ہندوستان مسلمان نوابوں کا ہے جو لمبی، بل کھاتی ہوئی قبائیں پہنتے ہیں اور جہاں ہندو بڑی چبھوں والی بولیاں بولتے ہیں، رس میں ڈوبے گیت گاتے ہیں، رنگ برنگے کپڑے پہنتے ہیں اور موسمِ بہار کے پہلے دن ایک دوسرے پر اور مسلمانوں پر رنگین پانی اُچھالتے ہیں۔

تو پھر مسئلہ کیا تھا؟ اور اگر تھا، تو سارے مسلمان پاکستان کیوں نہیں آ گئے؟

اس پر اماں کہتیں: "ارے آ جائیں گے، آ جائیں گے۔ تم ان کے لیے جگہ تو بناؤ۔"

بھیا نے لڑکوں کے ایک گروہ سے دوستی گانٹھ لی تھی جن کو ابا "لوفر" اور اماں "ٹیڈی" کہتی تھیں، اور وہ بھیا کو "تلیَر" کہتے تھے جس کا مطلب ظاہر ہے کہ ایک چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے جو ہر وقت چوں چوں کرتا رہتا ہے۔ ایک دن اماں نے ابا اور امی کے لیے پان بناتے بناتے تلیر کا مطلب سمجھایا تھا۔ ابا نے اپنے مخصوص خشک، مختصر انداز میں کہا تھا: "ہاں۔ وہ مجھے بھی یہی کہتے ہیں، جب اُن کے خیال میں مَیں سن نہیں رہا ہوتا۔ خیر، مہاجر سے اچھا القاب ہے جو قطعی ناموزوں ہے۔"

امی نے خاموشی سے کہا تھا: "مگر آپ تو اتنے خاموش رہتے ہیں۔"

"مہاجر کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا تھا، اور اماں نے مہاجروں کے بارے میں شیطان کی آنت جتنی طویل کہانی شروع کر دی تھی کہ کیسے لوگ بھاگے، اور کیسے اُن کی طرح کے لوگ بے سہارا، بے یار و مددگار رہ گئے اور اس وجہ سے سرحد پار کرنے پر مجبور ہوئے۔ امّی کے چہرے پر اسکول ٹیچر کا "بچوں کے سامنے نہیں کہتے" والا تاثر آ گیا، اور انھوں نے ایک دوسری کہانی شروع کر دی۔

"جب ہمارے رسول اللہ کو کافروں نے ان کے اپنے وطن مکہ میں پریشان کرنا شروع کیا تو وہ اور ان کے وفادار ساتھی مدینہ چلے آئے تاکہ وہاں ظلم و ستم سے دور، مومنوں کی ایک بستی بسائیں۔ اسی کو ہجرت کہتے ہیں، اور مسلمانوں کا برسوں کا حساب اسی سے شروع ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس طرح ہجرت کی انھیں مہاجر کہا گیا۔ اور ہم لوگ بھی مہاجر ہیں کیوں کہ ہم پاکستان میں

مسلمانوں کا ملک قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔"

"مگر ہم تو بھاگ کر نہیں آئے تھے،" ابا نے کہا۔ "ہم تو اپنی مرضی سے آئے تھے۔" ابا ذرا بھی مذہبی نہیں تھے۔ اخبار کے اس ہفتہ وار کالم میں جو ابا ایک قلمی نام سے لکھتے تھے، انھوں نے ایک مرتبہ اپنے آپ کو "تہذیبی لحاظ سے مسلمان" اور "اگناسٹک" لکھا تھا، اور اپنی اس تعریف پر انھیں بہت فخر تھا۔ (ہم بھی مذہبی نہیں تھے، مگر میں جمعے کے روز ابراہیم کے ساتھ مسجد جاتا تھا کیوں کہ مجھے وہاں لوگوں کی خوشبو اچھی لگتی تھی اور قوی ہیکل پٹھان جو پگڑی باندھتے تھے اور جن کی لال لال داڑھیاں ہوتی تھیں، اور پنجابی، اور بنگالی — اور رشوت۔ ابراہیم ہمیں برفی کھلاتا اور اماں پان کھلاتیں اور امی کچھ روپے دیتیں۔ ندا بہت پاکیزہ بن کر نیلا دوپٹا سر پر منڈھے اماں کے ساتھ رکوع اور سجدے ادا کیا کرتی؛ نماز تو اسے اُس وقت آتی نہیں تھی۔ اماں دن میں پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھیں اور امی ہفتے میں تین چار بار، اور ایک کانونٹ اسکول میں ہفتے میں دو بار شدید گرمی میں اسلامیات پڑھاتیں۔ رمضان کے مہینے میں ہم سب روزے رکھتے کیوں کہ افطار میں، اور سحری کے وقت اُجالا ہونے سے پہلے اُٹھنے میں، اور چاند دیکھنے میں، بے حد مزہ آتا تھا۔)

جس دن امی کی اسلامیات کی کلاس ہوتی، اُس دن بھیا ہمیں اسکول سے لینے آتے۔ بھیا ہمیشہ کسی نہ کسی مشکل میں گرفتار رہتے — دوستوں کے خود کو "تلیر" کہنے پر گھونسا بازی، یا ابا کے ساتھ گھُٹی گھُٹی تکرار جب ابا ان سے کہتے کہ کوئی ہنر سیکھ لیں یا پڑھیں۔ ہندوستان کو بُرا بھلا کہنا انھیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ (ابا، امی اور آپا کے علاوہ لفظ "مہاجر" سے سارا خاندان چڑتا تھا۔ آپا کی اماں مستقل لکھنؤ کا رونا روتی رہتی تھیں، اور ایک مرتبہ اماں نے پلٹ کر کہا تھا: "تو پھر وہیں کیوں نہ رہیں؟ میں تو شکر ادا کرتی ہوں کہ خدا کی بستی میں پہنچ گئی۔" جو ان کی عام طور پر سنائی جانے والی بیواؤں اور بے گھر بے در ہونے اور نسلی جنگوں سے ایک مختلف بات تھی۔)

ارے ہاں، بھیا کو محبت ہو گئی تھی — ایک لڑکی سے (انھوں نے ہمیں بتایا تھا) جسے انھوں نے ایک بار "زسری" میں دیکھا تھا، جو کہ زسری تھی ہی نہیں؛ شاید کبھی رہی ہو گی مگر اب تو دکانوں، حلوائیوں، کیمسٹوں اور کاغذ فروشوں کی ایک بھول بھلیاں تھی۔ لڑکی نے بے حد چُست قمیص پر لال دوپٹا اوڑھ رکھا تھا، اور، حالاں کہ وہ اس کا چہرہ بھول چکے تھے، ان کا کہنا تھا کہ لال دوپٹے کو تو وہ کہیں بھی پہچان لیں گے۔ اس زمانے میں وہ گھر بھر میں لڑکھڑاتے پھرتے اور ریڈیو

Scanned with CamScanner

کے ساتھ فلمی گانے گاتے رہتے۔ اپنی محبوبہ کی تلاش میں وہ تنہا موٹر سائیکل پر گھومتے پھرتے۔ آپا اور امّی انھیں مجنوں اور فرہاد کہہ کہہ کر خوب ہنستیں۔ ایک دن بھیا نے قسم کھا کر کہا کہ انھوں نے اس لڑکی کو دوبارہ دیکھا ہے حالاں کہ انھیں اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ وہ ماڈرن اسٹورز سے اسکول کی کتابیں خرید رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک موٹی سی بُرقع پوش عورت بھی تھی۔ بھیا چوری چوری اُسے دیکھتے رہے اور پھر چپکے سے نکل گئے۔ اب میری اور ندا کی عمر نو اور دس برس کی تھی اور آرچی کامک پڑھ پڑھ کر ہم استاد ہو گئے تھے۔ ہم نے اُن کا خوب ہی مذاق اڑایا اور بھیا شرم اور غصّے سے لال بھبوکا ہو ہو گئے۔ انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ اب کی بار وہ ضرور اس لڑکی سے بات کریں گے۔ اور جب ہم نے اُنھیں چِڑایا کہ اب وہ پتا نہیں انھیں کبھی ملے گی بھی یا نہیں، تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں، جس پر غصّہ بھی آتا تھا اور پیار بھی، کہا:

"وہ وہیں ملے گی، اُسی وقت اور اُسی جگہ!"

ایک جمعے کی سہ پہر کو وہ ہمیں ماڈرن اسٹورز گھسیٹ لے گئے۔ انھوں نے ہمیں آئس کریم اور نہ جانے کیا کیا کچھ کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ انھیں کسی سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ اور واقعی! پورے چھ بجے ایک بڑی حسین لڑکی چست قمیص پر لال دوپٹا اوڑھے بیچ مچ نمودار ہو گئی۔ بھیا نے آگے بڑھ کر اُسے مخاطب کیا اور وہ پلٹی ___ تو وہ تو آپا نکلیں!

ندا کو اور مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ یہ کہانی خاندان کی جھوٹی سچی داستانوں کے ذخیروں میں شامل ہے یا نہیں، مگر سچ معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو آپا ضرور اُس وقت اپنی شخصیت کا وہ پہلو عیاں کر رہی تھیں جسے ابّا ان کی "پوشیدہ شرارت" کہتے تھے؛ وہ اتنی سنجیدہ تھیں، لوگوں کے سامنے اس طرح خوب صورتی سے پیش آتی تھیں۔ آہ ___ آپا ___ جنگ کے پہلے کے وہ زمانے! مجھے ساحلِ سمندر کا ایک دن یاد ہے۔ امّی اور آپا نے سینڈزپٹ پر کسی سے دن بھر کے لیے ایک ہٹ لی تھی۔ ایک ابر آلود دن ہم نے سفید ریت پر اپنے کھانے پینے کے سامان سمیت پکنک منائی تھی۔ ہم جیلی فش اور کیکڑوں کے پیچھے بھٹکتے پھرے تھے اور ہم نے اونٹ کی سواری کی تھی۔ ندا کا ایک جوتا کھو گیا تھا اور آپا نے اُسے سنڈریلا کہا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی سالگرہ پر اسے سنڈریلا کا سا خوب صورت لباس سلوا دیں گی۔ امّاں اور آپا کی امّاں ہٹ کے اندر بیٹھی پان کھاتی اور بتیاتی رہی تھیں۔ ان دونوں کی اب خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ دونوں آپس

میں بیٹھی اگر ہندوستان کو یاد نہ کرتی ہوں تو ترکن کے پرخچے اڑاتی تھیں۔ پنکی نے اماں کا اجمیر سے لایا ہوا ایک قیمتی چینی کا پیالہ توڑ دیا تھا اور آپا کی اماں کے کشن کا بروکیڈ کا غلاف چیتھڑے کر دیا تھا۔ بھیا اور آپا نے ریت پر کیکلی کھیلی تھی اور تیزی سے درویشوں کی طرح گھومے تھے۔ ابا کا فیصلہ تھا کہ ہم ساحلِ سمندر پر غروبِ آفتاب کا نظارہ کرنے کے بعد واپس چلیں گے۔ ابا کو کراچی کے آتشیں آسمانوں سے، پام کے درختوں سے اور انوکھے پھلوں اور پھولوں سے عشق تھا۔ وہ اردو اور انگریزی کے اشعار پڑھتے رہے تھے اور امی بیٹھی مسکراتی رہی تھیں۔ پھر امی اور آپا نے کجری گائی تھی اور دونوں بیوائیں تک اپنی بوڑھی، عمر رسیدہ آوازوں کے ساتھ گیت میں شامل ہو گئی تھیں۔

یہ امی کے اسکول سے کچھ مہینے کی چھٹی لینے سے پہلے کا واقعہ ہوگا، بلکہ امی تو پھر واپس کبھی اسکول گئی ہی نہیں تھیں۔ ابا ہمیشہ کی طرح ہمیں اسکول لے جاتے رہے تھے اور آپا کو بھی چھوڑتے رہے تھے۔ ایک صبح انھوں نے باغ سے ایک لالہ کا پھول توڑا تھا اور جب ہم کار میں بیٹھے تو جھجکتے ہوئے آپا کے چمکیلے سیاہ بالوں میں لگا دیا تھا۔ اس کے بعد دو دن تک امی ابا سے نہیں بولی تھیں۔ ابا ان کے پیچھے پیچھے یہ کہتے پھرتے رہے تھے: "ناراض ہو گیا؟ مجھ سے کیا خطا ہو گئی؟" اور پھر پہلی بار امی پھٹ پڑی تھیں اور ان کی زندگی کی سختیوں کی، جدوجہد کی اور دکھ بھرے برسوں کی کہانیاں سامنے آ گئی تھیں اور ہم بھونچکا رہ گئے تھے ــــ ہم نے تو ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ امی تو بہت خوش ہیں۔

دوسرے دن انھوں نے ہمیں آپا سے بات کرنے، بلکہ ان کے منھ پڑنے ہی سے منع کر دیا تھا۔ آپا اب بھی کبھی کبھی آتیں، تھوڑی سی شکر مانگنے، یا کوئی مزے دار چیز دینے جو اُن کی اماں نے خاص طور پر امی کے لیے پکائی ہوتی (جو اب زیادہ تر وقت بستر میں پڑی رہتی تھیں)؛ مگر ان کی دوستی میں ایسی دراڑ پڑ گئی جسے وہ دوبارہ بھر نہ پائی تھیں۔

۱۹۶۵ کی جنگ نے یہ سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا، حالاں کہ اب سوچیں تو وہ چھوٹی موٹی لڑائی سے زیادہ نہ تھی۔ آسمانی جنگجوؤں کی، بھٹکے ہوئے فوجی جوانوں کے لیے سیاروں اور اولیاؤں کے نزول کی حکایتیں اُس وقت کے واقعات کا اتنا ہی اہم حصہ تھیں جتنا کہ بمباری یا بلیک آؤٹ ... کیا کراچی میں بم گرے تھے؟ کیا ہم نے شیلنگ کی آواز سنی تھی؟ مجھے تو اس زمانے کے صرف

Scanned with CamScanner

بچوں کے جنگی کھیل یاد ہیں جو ہم کھیلا کرتے تھے، یا ریڈیو کے طویل براڈکاسٹ، اور اپنی فوج کی شان میں قصیدے۔ ہم بچے اب "جنگ جنگ" کھیلتے تھے، اور بھیّا اسے کچھ زیادہ سنجیدگی سے لے کر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر فوج میں بھرتی ہونے جا پہنچے تھے ـــــ اور جب اُنھیں لینے سے انکار کر دیا گیا تھا تو اور بھی رنجیدہ اور چڑچڑے رہنے لگے تھے۔ ابا ہنسے تھے، اور اماں نے کہا تھا: "ہم ہندوستانی جو ہیں!" اور بھیّا بھی ان کے احتجاجی واویلے میں شامل ہو گئے تھے۔ ان دونوں نے ابھی حال ہی میں شہریت حاصل کرنے کی درخواست داخل کی تھی اور پاکستانی پاسپورٹوں کے منتظر تھے۔ فی الحال قانوناً ان کا کوئی ملک نہ تھا۔ آپا کی اماں انھیں ہوشیار کرنے آئی تھیں کہ کچھ علاقوں میں ہندوستانی پاسپورٹ رکھنے والوں سے جاسوسی اور مخبری کے شبہے میں پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ یہ افواہیں تُرکن نے بھی سنی تھیں اور اپنی دقیانوسی انگریزی میں ابا کو خط لکھ بھیجا تھا کہ گو وہ حالات کو سمجھتی ہے مگر پھر بھی وہ اپنی عمارت میں دشمن ملک کے باشندوں کی موجودگی کو پسند نہیں کرے گی۔ "یہ آپ ہی کو مبارک رہیں۔ والسلام۔"

جواباً اماں اور آپا کی اماں نے پولیس کو فون کر دیا تھا کہ ترکن بلیک آؤٹ کی ٹھیک سے پابندی نہیں کرتی۔ یہ سچ بھی تھا۔ ترکن کو ہَول کا عارضہ تھا اور پنکی کو اندھیرے میں اس کے بیش قیمت کرسٹلوں میں گشت لگانے کی زچ کر دینے والی عادت تھی، اور بوکھلاہٹ میں اسے یوں بھی لگتا تھا کہ اس کے مکان میں پیراٹروپر رینگتے پھر رہے ہیں، جس پر اس کی حرکت قلب بے حد بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت وہ کھٹاک سے کوئی نہ کوئی لیمپ روشن کر دیتی اور اس کے نیم وا پردوں سے روشنی چھنکنے لگتی تھی۔ ایک دفعہ بھیّا اسے متنبہ کرنے نیچے گئے تھے کہ پردوں کی دراڑ سے روشنی نظر آ رہی ہے، اور ترکن پر تقریباً دل کا دورہ پڑ گیا تھا کیوں کہ وہ بھیّا کو پیراٹروپر سمجھی تھی۔ وہ بدمزاجی کا خط شاید اس نے اسی وجہ سے لکھا تھا۔

ترکن کا بلا جنگ کے ساتویں دن غائب ہو گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ اس کی لاکھ کوششوں اور انتظار کے باوجود وہ پھر کبھی نہ ملا تھا۔ چند دن تک وہ روتی رہی تھی اور پھر اپنے جنگی نغموں اور چینخم دہاڑ کے دوروں میں غرق ہو گئی تھی۔ ہاں کسی کسی رات کو اُس کے چپکے چپکے چلنے پھرنے کی آہٹیں اور اس کی سرگوشیاں سنائی دیتیں: "پنکی، پنکی، تیرا کھانا تیار ہے۔" ابراہیم سب سے زیادہ بھوں بھوں کر کے رویا تھا، یہ کہہ کہہ کر کہ پنکی اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور ایسے لوگوں کی

دُہائی دے دے کر جو بلیوں کو قتل کرتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ دوسرے نوکروں کو ملزم ٹھہرا رہا ہے، اور چوں کہ اس عمارت میں کئی ملازم تھے اس لیے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس پر الزام لگا رہا ہے۔ اور پھر ایک دوسری سر بستہ داستان کا انکشاف ہوا۔ بھنگی کے بیٹے پیٹرک نے بتایا کہ بھیّا لڑکوں کے اُس گروہ کے سرغنہ تھے جنھوں نے پنکی کو پکڑ کر ایک پتھروں بھری بوری میں بند کر دیا تھا اور پاس والے سبز آبی پودوں سے بھرے تالاب پر لے گئے تھے۔ انھوں نے پنکی کو ڈُبا دیا تھا، مگر اس سے پہلے انھوں نے بوری پر چھڑیاں برسائی تھیں اور "بھارتی ظالم مردہ باد" کے نعرے لگائے تھے۔ پیٹرک کا کہنا تھا کہ بھیّا بالکل کسی فلم کے فوجی کی طرح قومی نغمے گا رہے تھے اور "پاکستان زندہ باد" اور "ایوب خاں زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔

ہماری عمریں ابھی دو تین سال کی ہوں گی کہ ایوب خاں اس کے بعد آنے والے آٹھ برسوں تک کے لیے ہماری زندگیوں کا اہم حصہ بن گیا تھا۔ ہمیں پوسٹروں اور تصویروں میں اس کا مسکراتا ہوا وجیہہ چہرہ یاد تھا اور جنگ کے زمانے میں تو ہم اُس کے اور بھی گرویدہ ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے ایک پریڈ میں مارچ پاسٹ کر کے اُسے سلیوٹ بھی کیا تھا اور فخر سے پھولے نہ سمائے تھے۔ مگر ابا اور امی اُسے پسند نہیں کرتے تھے اور انھوں نے پچھلے الیکشن میں فاطمہ جناح کو ووٹ دیا تھا جو مادرِ ملت تھیں۔ "محترمہ فاطمہ جناح کی حکومت ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا،" ابا کہتے۔ گھر میں بڑوں کی ان باتوں کے (جو بچوں کے آتے ہی بند کر دی جاتیں) ہم نے "ہونہہ! بھارتی جارحیت!" اور "احمقانہ جنگ" جیسے ٹکڑے سنے تھے۔

جنگ کے اختتام پر ابا کے ادارتی مواعظ اَور بھی حکومت مخالف، فوج مخالف اور سوشلزم حامی ہوتے گئے تھے۔ انھوں نے ایک بین شدہ کمیونسٹ شاعر کا کلام شائع کر دیا اور اخبار کے اس کے بعد والے دونوں کے پرچے ضبط کر لیے گئے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان چھوڑ کر دوبئی چلے گئے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ ہی نکل آئے تھے۔ اماں اور آپا کی اماں نے اپنی بچت اور توانائیاں ملا کر ایک دکان کھول لی تھی جہاں وہ بچوں کے کپڑے فروخت کرتیں جن کے ڈزائن وہ خود تیار کرتیں اور محلے بھر کی غریب عورتوں اور بیواؤں سے کم سے کم اُجرتوں پر سلواتی تھیں۔ (امی کا یہی کہنا تھا۔) جنگ کے کچھ ہی عرصے بعد آپا نے ایک بار امی کے پاس بیٹھ کر کہا تھا: "میں قریشی صاحب سے شادی کر لوں؟" قریشی صاحب ایک بہت موٹے پنجابی تھے۔ ان کی

آنکھیں بھینگی تھیں اور ان کے پاس بہت پیسا تھا۔ ہم بھونچکے اور کراہت زدہ ہو کر رہ گئے تھے، اور امی تک نے کہا تھا: "نازلی، تم اتنی پیاری شکل کی لڑکی ہو۔ ذرا صبر کرو، تمھیں اپنے قابل لڑکا ضرور مل جائے گا۔" مگر آپا نے نفی میں سر ہلا کر کہا تھا: "میری عمر نکلی جارہی ہے۔ یہ پیسے والا ہے اور جہیز نہیں مانگتا۔" شادی سے چند ہفتے پہلے انھوں نے اسکول میں پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ سنہری گھونگھٹ میں آپا بڑی حسین دُلھن بنی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا دولھا بھڑکیلی پگڑی باندھے اور پھولوں اور پنیوں کے ہار پہنے کوئی درباری مسخرہ لگ رہا تھا۔ امی بھی اُس دن بڑی خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ان کی گود میں ہمارا ننھا سا بھائی تھا۔ (ہمیں ذرا شرمندگی ہوئی تھی کیوں کہ میں گیارہ برس کا ہونے والا تھا اور ندا نو سال کی تھی؛ ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ ہمارا اب کوئی نیا بہن بھائی پیدا ہوگا۔ جب جنگ کے دنوں میں امی کو اُلٹیاں ہوتی رہیں، اور آخر کار انھوں نے بتایا کہ کیوں، تو ندا نے بے حد خوش ہونے کا سوانگ رچایا تھا اور شاید بس مجھے جلانے کے لیے کہا تھا: "اب کی بار ایک منّی سی بہن آئے گی۔" کچھ دنوں تک اس نے اُون اور سلائیوں سے کچھ بے ہیئت سی چیزیں بُننے کا بھی ناٹک کیا تھا اور پھر چھوڑ چھاڑ دیا تھا۔ جب ہمارا ننھا بھائی آیا تو اُس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی اور اپنی مشغولیتوں میں لگی رہی تھی۔ یوں بھی اب ہمارے کھیلوں کا اختتام ہو چکا تھا — جانے کیسے، جنگ، منّے کی پیدائش اور پنکی کے غائب ہو جانے کے بعد ہمیں کسی بھی چھوٹے جاندار کو مارنا ظالمانہ بات لگنے لگی تھی، اور ہم نے پھر گرگٹوں پر کبھی غلیل نہیں چلائی۔)

بھیّا ۱۹۶۹ میں فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اور ۱۹۷۱ میں بنگلادیش والی جنگ میں اپنا ایک بازو اُڑوا بیٹھے تھے۔ "احمق کہیں کا! اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا،" ابا نے کہا تھا، اور امی، دو بئی میں رہ کر جن کے مزاج میں نرمی آگئی تھی، بولی تھیں: "کیا بات کرتے ہیں! کسی کے ساتھ بھی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنا راست بازو گنوا بیٹھے۔" اس پر ابا نے کہا تھا: "دیکھنا اب اسے کتنے تمغے ملیں گے، اور اپنے بھائیوں پر بندوق اٹھانے سے یہی سب کچھ ملتا ہے۔"

بوڑھے ابراہیم کو ہم اپنے ساتھ امی کے چاہنے کے باوجود دو بئی نہیں لے جا سکے تھے۔ پنکی کے جانے کے بعد وہ بالکل پاگل سا ہو گیا تھا اور اس کی عمر بھی اسّی برس کی ہو گئی تھی۔ اماں نے اسے اپنے پاس رکھنے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے بھیّا کو کبھی معاف نہیں کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اماں کے خاندان کی آمد ہمارے لیے نیک فال نہیں تھی۔ تعجب اس پر تھا کہ وہ تُرکن کے ساتھ

رہتا رہا۔ برسوں بعد جب امّی ایک بار کچھ چیزیں لانے پاکستان گئی تھیں تو انھوں نے ابراہیم کو تلاش کیا تھا، اور ترکن نے بتایا تھا کہ وہ پاس والی مسجد میں رہتا ہے۔ شاید اُس نے ابراہیم کو بھی اپنے جنگی نغموں اور چیخ پکار کے ماہانہ ڈرامائی راگ کا نشانہ بنایا ہو گا۔ امّی نے بتایا کہ ترکن نے ایک بار اُس پر جھاڑو سے حملہ کیا تھا، مگر وہ پاگل کر دینے کی حد تک احمق تو تھا۔ جب امّی مسجد میں اس سے ملنے گئیں تو، اُنھوں نے بتایا تھا، ابراہیم نے انھیں بالکل نہیں پہچانا اور گندی گندی گالیاں بکتا رہا۔ بھیا کا کہنا تھا کہ وہ ساری دنیا کو گالیاں دیتے ہوئے مرا تھا۔ اس کی عمر تب نوّے برس کی ہو گی۔ اور امّی نے کہا تھا کہ کراچی اتنا بدل گیا ہے کہ اب وہ شہر ہی نہیں لگتا جسے ہم چھوڑ کر آئے تھے۔ کراچی اب وہ نہیں رہا تھا، اور پاکستان میں ہنوز فوج کی حکومت تھی۔

**

رضا علی عابدی

چوہدری عبدالہادی کا آختہ

میں بتاتا ہوں کہ اسرار کہاں گیا، لیکن پہلے آپ کو اسرار کا پورا قصہ سننا ہو گا۔

اُس کے باپ سرکار احمد کی تنہائی کو جب بہت عرصہ گزر گیا تو دوست اس کے پیچھے پڑے اور وہ دوسری شادی کرنے پر رضامند ہو گیا۔

لڑکی والوں کا اصرار تھا کہ اُسے خود آ کر سسرال میں رہنا ہو گا؛ ہاں، اسرار کو وہ ساتھ لا سکے گا۔

یہ بھی طے پایا کہ سسرال والے اسرار کو گھر کا لڑکا تصوّر کریں گے اور اسی طرح اس کی نئی بیوی کے پہلے شوہر سے جو دو لڑکے ہیں، سرکار احمد انھیں اپنے بیٹے تصوّر کرے گا۔

بعد میں کچھ لوگوں نے بہت کہا کہ سرکار احمد نے اس طرح کی شرائط مان کر حماقت کی اور اسے یہ کرنا چاہیے تھا، وہ کرنا چاہیے تھا، مگر سرکار احمد نے معاملات پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ اس کے سامنے فلاح کی یہی ایک راہ تھی۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ اسرار کو رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا جہاں وہ جی لگا کر پڑھے لکھے گا اور بڑا آدمی بنے گا۔

Scanned with CamScanner

دوسری بیوی کا نہ صرف گھرانا بلکہ اس کی پوری بستی قبائلی رسم و رواج پر قائم تھی۔ ان کے دستور جتنے پرانے تھے اُتنے ہی نرالے بھی تھے۔ سرکار احمد کو یقین تھا کہ ہونہار بیٹا کچھ تو خود کو اُس رنگ میں ڈھال لے گا، کچھ اپنی ذہانت سے اُن لوگوں کی طینت بدل دے گا۔

آخر شادی ہوئی۔ سرکار احمد اور اسرار اپنا تھوڑا بہت مال اسباب لے کر رحمتی منتقل ہو گئے۔ اسرار کہا کرتا تھا کہ اَور کچھ ہو نہ ہو، بستی کا نام اچھا ہے۔

بستی بھی کچھ ایسی بُری نہ تھی۔ شروع شروع میں دونوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ محدود وسائل میں زندگی کی جتنی آسائشیں ممکن تھیں، مہیا کر دی گئیں۔ اسرار نے اپنی تعلیم جاری رکھی، البتہ اسے یہ دُکھ ستانے لگا کہ یہ جو اسے دو بھائی ملے ہیں، یہ دو تین جماعتیں پڑھ کر گھر بیٹھ رہے ہیں۔ ہر وقت یا تو چائے پیتے رہتے ہیں یا پان کھاتے رہتے ہیں۔ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام میں خط لکھتے رہتے ہیں۔ فلمی گانے گاتے رہتے ہیں اور خود بھی تک بندی کرتے کرتے شاعر بن بیٹھے ہیں۔ ایک نے اپنا نام زخمی رکھ لیا ہے اور دوسرے نے بے بس۔ صرف یہی نہیں، زخمی کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے، کوئی پڑھی لکھی لڑکی بیاہ کر گھر میں آنے والی ہے۔

پھر ایک اَور دُکھ نے اسے آن دبوچا۔ باپ ایک روز بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ اُسے بھی اُس ٹیلے کے اوپر دفن کر دیا گیا جہاں ہَری سنگھ نلوا سے جنگ کرنے والے شہید دفن تھے۔ بستی میں سوگ بھی منایا گیا اور سرکار احمد کا مزار تعمیر کرنے کے لیے ہاتھ کے ہاتھ چندا بھی جمع ہونے لگا۔

اوپر سے غضب یہ ہوا کہ اسرار کے ساتھ گھر والوں کے سلوک میں فرق آنے لگا۔ وہ ذہین بھی بہت تھا۔ محنتی بھی تھا۔ اب تو ملازمت کر کے اچھی بھلی رقم بھی گھر میں لانے لگا تھا، مگر وہ سب سے جدا تھا، اَوروں سے مختلف تھا۔ کچھ تو وہ خودداری کہیں سے لے آیا تھا۔ کچھ یہ کہ غلط بات کو غلط کہہ دیتا تھا۔

بستی کے طور طریقوں کے کھانچے میں اس کے یہ انداز ٹھیک طرح سے نہ بیٹھ سکے۔ کبھی اُس نے کہہ دیا کہ چھت کے اوپر گھاس بہت اُگ آئی ہے۔ زخمی اور بے بس بے کار بیٹھے رہتے ہیں، ان سے کہا جائے کہ چھت پر چڑھیں اور گھاس اتاریں۔ اس پر بھائی روٹھے سو روٹھے، ماں بھی برہم ہو گئی اور لگی طرح طرح کے طعنے دینے۔

وہ جب مہینے بھر کی تنخواہ لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھتا تو فوراً لے لی جاتی، لیکن جب کہتا کہ دیے

Scanned with CamScanner

کی روشنی میں اُس سے پڑھا نہیں جاتا، اسے لالٹین دلوا دی جائے تو بستی کے چوہدری سے شکایت کی جاتی کہ ماں کو سوتیلی سمجھنے لگا ہے۔

ایک روز اُس نے کہا کہ تکیے کا غلاف بہت میلا ہو چکا ہے اسے دُھلوا دیا جائے تو اگلے روز دفتر سے واپسی پر جب چوہدری عبدالہادی ملے تو کہنے لگے کہ سنا ہے تم آمادۂ بغاوت ہو۔

اسرار نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ سمجھا کہ شاید اس کی پُشت پر کوئی اَور کھڑا ہے اور چوہدری صاحب اس سے مخاطب ہیں۔

چوہدری صاحب کبھی فوج میں رہ چکے تھے اور محاذ پر بھی جا چکے تھے۔ بم کا ایک ٹکڑا اُڑ کر ان کے گال کو کاٹ گیا تھا۔ کسی اناڑی ڈاکٹر نے کٹے ہوئے گال کو چٹکی میں پکڑ کر یوں ٹانکے لگا دیے تھے جیسے موچی جوتا گانٹھتا ہے۔ اب اس کا بدہیئت نشان باقی تھا۔ چوہدری صاحب کسی کے سامنے آتے تو نگاہ پہلے ان کے گال پر پڑتی، پھر خود اُن پر۔

چوہدری صاحب بایاں ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتے تھے۔ دایاں ہاتھ ان کے پتلون کی جیب میں اتنا زیادہ پڑا رہتا تھا کہ زین کے پتلون کی ایک جیب بُری طرح میلی ہو چکی تھی اور دوسری بالکل اُجلی تھی۔

اسرار سے بولے کہ سنا ہے تم باغی ہو گئے ہو اور آمادۂ فساد ہو۔ سنا ہے بڑے بڑے مطالبے کرنے لگے ہو اور چاہتے ہو کہ ماں تمہارے لیے بھی وہی سب کرے جو اپنے اصل فرزندوں کے لیے کرتی ہے۔ ٹھیک ہے، بہت قابل ہو، لیکن اگر ساری مراعات تم لے لو گے تو بچارے اُن لڑکوں کو کیا ملے گا؟

غضب یہ ہوا کہ اسرار اُنھیں اپنی بات سمجھانے لگا۔ بات ابھی جاری تھی کہ چوہدری عبدالہادی کے اندر کا ریٹائرڈ فوجی ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے مچلنے لگا۔

اسرار رخصت ہونے لگا تو بڑے ادب سے بولا، "خدا حافظ۔"

وہ اُتنے ہی کڑک کر بولے، "اللہ حافظ۔"

اس کے بعد یوں لگا کہ پہلی تاریخ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اِدھر اسرار نے تنخواہ لا کر ماں کی اُس ہتھیلی پر رکھی جس کی لکیریں اندر سے اس طرح کالی تھیں جیسے اُن میں مَیل بھرا ہو، اُدھر چوہدری عبدالہادی نے بگل بجا دیا۔ اعلان ہوا کہ اسرار سرکش ہو گیا ہے۔ اُس کا فیصلہ کرنے کے

لیے قبیلے کی پنچایت بیٹھ رہی ہے۔

پنچایت بیٹھی۔ اسرار یہ سوچ کر گیا کہ پہلے اُس کا بیان سنا جائے گا۔ وہ بے شمار باتیں طے کر کے گیا۔ یہ پوچھا جائے گا تو یہ کہوں گا۔ یہ سوال ہو گا تو یوں جواب دوں گا۔

وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ پنچایت اس کا بیان سننے کے لیے نہیں، اپنا فیصلہ سنانے کے لیے بیٹھی ہے۔ اُس روز اس نے دیکھا کہ چوہدری عبدالہادی کا دایاں ہاتھ کلائی تک کٹا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ میدانِ جنگ میں بارودی سُرنگ کو ناکارہ بنانے جا رہے تھے مگر پہلے بارودی سرنگ کا داؤ لگ گیا۔

فیصلہ سنا دیا گیا۔ چوہدری صاحب نے کہا کہ اسرار شادی شدہ ہوتا تو اس کا نکاح فسخ کر دیا جاتا۔ ایسے موٹے موٹے الفاظ اسرار نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ اب چوں کہ وہ کنوارا تھا اس لیے قبیلے کی پرانی رسم کے مطابق اسے سرکشی، فساد اور بغاوت کی یہ سزا دی جائے گی کہ پورے ایک مہینے تمام قبیلہ یوں تصور کرے گا جیسے اسرار کسی کو نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ وہ بستی میں رہے گا، گھر ہی میں رہے گا، لیکن بستی والے اور گھر والے اوّل تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے نہیں اور اگر دیکھیں گے تو یوں جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔

چوہدری عبدالہادی نے جوں ہی اپنا کٹا ہوا ہاتھ دوبارہ جیب میں ڈالا، یوں لگا کہ کسی بڑے سیشن جج نے سزائے موت کے حکم پر دستخط کر کے اپنا قلم توڑ ڈالا ہو۔ فوراً ہی فیصلے پر عمل در آمد شروع ہو گیا۔ اسرار ابھی وہاں تھا، ابھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

راستے میں فتو فقیرنی ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی، وہی ہاتھ جس میں لے دے کر ایک اسرار ہی چونی ڈالا کرتا تھا۔ اسرار کو دیکھتے ہی فتو نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ پٹواری ملا جس کا نام شاید فضل یا افضل تھا، اُس نے اسرار پر یوں نگاہ ڈالی جیسے اُسے نہیں بلکہ اس کے اندر سے دور تک دیکھ رہا ہو۔ رحمت حلوائی کی نگاہ دودھ کے کڑھاؤ سے اٹھنے والی سفید بھاپ پر تو ٹھہر گئی، اسرار پر نہ ٹھہر سکی۔ غلام محمد ہومیو پیتھ چھڑی ٹیکے ہوئے جا رہے تھے۔ زمین سے اُبھری ہوئی ایک جڑ سے اُلجھ کر گر پڑے لیکن اٹھنے کے لیے اسرار کا سہارا قبول نہیں کیا بلکہ بے بسی سے قریب کھڑی ہوئی بکری کو یوں دیکھنے لگے جیسے وہ جا کر کسی شخص کو بلا لائے گی، کسی تابعدار، فرماں بردار، کسی نظر آنے والے شخص کو۔

اسرار گھر میں داخل ہوا تو ماں دیواروں کو دیکھنے لگی۔ زخمی زور زور سے کوئی گانا گانے لگا۔ بے بس فلمی رسالہ کھول کر تصویریں دیکھنے لگا۔ ملازمہ سر جھکا کر جلدی جلدی جھاڑو دینے لگی۔ صرف زخمی کی بیوی قریب سے گزری تو اسرار کو محسوس ہوا کہ وہ کن انکھیوں سے اُسے دیکھ رہی ہے۔ وہ گزرتی چلی گئی اور سوندھی مٹی سے ملتے جلتے اُس کے عطر کی خوشبو وہاں رہ گئی۔

سامنے والے مکان سے نوکر کو بلایا گیا جس نے آ کر اسرار کے سامنے کھانا رکھا مگر وہ بھی اسرار کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے خلا کو دیکھ رہا ہو۔ کھانا سامنے رکھ کر اور پانی دیے بغیر وہ تو چلتا بنا، اسرار نے جوں توں کر کے کچھ لقمے نگلے اور منہ ہاتھ دھونے انگنائی میں چلا گیا۔ واپس آیا تو تپائی پر پانی سے بھرا ہوا گلاس رکھا تھا اور ہوا میں سوندھی مٹی کی خوشبو تھی۔

صبح وہ کام پر جانے لگا تو کسی نے اُسے رخصت نہیں کیا۔ راہ میں جو بھی ملا اُس پر اُچٹتی سی نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ کنویں کے قریب جو چتکبرا کتا اس پر بھونکتا تھا وہ بھی آنکھیں میچے بیٹھا رہا۔

شام کو وہ تھکا ہوا گھر آیا اور چارپائی پر بیٹھ کر حساب لگانے لگا۔ اُس کی سزا تنخواہ والے روز ختم ہو گی۔ جب وہ ذرا موٹا سا بٹوا جیب میں ڈالے گھر لوٹے گا تو فتو بھی اس سے چونی مانگے گی، چتکبرا کتا بھی اُس پر بھونکے گا۔ خود اسے ماں کی پھیلی ہوئی ہتھیلی بھی نظر آئے گی جو خود کو اچھی خاصی چٹی ہو گی مگر جس کی لکیریں اندر سے سانولی ہوں گی۔ یہ سوچ کر اسرار پہلے تو مسکرایا کرتا تھا لیکن اس شام اس نے چاہا کہ مسکرائے تو مسکرایا نہ گیا۔

کسی نوکر نے لا کر تپائی پر کھانا رکھا۔ سارے وہی پرانے تام چینی کے برتن تھے، البتہ کھانے کے ساتھ پانی سے بھرا ہوا گلاس بھی تھا جسے کسی نے اچھی طرح دھویا تھا اور اس میں سوندھی مٹی کی خوشبو بھی تھی۔

ایک رات تو اسرار حیرت سے اُچھل پڑا۔ سونے کے لیے اس نے تکیے پر سر رکھا تو اُسے یقین نہ آیا۔ تکیے کا غلاف دُھلا ہوا تھا اور اس میں ہلکی ہلکی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، بالکل برسات کے پہلے چھینٹے والی۔ وہ خوش ہوا اور اس نے چاہا کہ اُسے ہنسی آ جائے ــــ وہ آ گئی۔

اب وہ مہینے کی تاریخیں گننے لگا۔ اب اُسے پہلی تاریخ کا انتظار رہنے لگا۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس کے دفتر کے کلرکوں کو پہلی تاریخ کا اتنی بے چینی سے انتظار کیوں رہتا ہے۔ وہ سب نظر آنا چاہتے ہیں۔

ایک روز حساب لگاتے لگاتے اس نے کہیں راہ میں چوہدری عبدالہادی کے بیٹے سے تاریخ پوچھ لی۔ اُس وقت تو بیٹا دوسری طرف دیکھتا ہوا گزر گیا۔ شام کو جب اسرار کام سے واپس آیا تو اسے اپنے سرہانے رکھا ہوا ایک پرچا ملا۔ اس نے پڑھا۔ بالکل یوں لگا کہ لکھوایا ہے کسی ریٹائرڈ فوجی نے اور لکھا ہے زخموں کو چٹکی میں پکڑ کر ٹانکے لگانے والے کسی ڈاکٹر نے۔

اُس میں لکھا تھا کہ آئندہ اگر تم نے بستی میں کسی سے بات کرنے کی تو تمھیں آختہ کر دیا جائے گا کہ اس قبیلے کی رسم یہی ہے۔

نہ وہ نکاح فسخ ہونے والی بات اس کی سمجھ میں آئی تھی نہ یہ آختہ جیسا لفظ اس کی سمجھ میں آیا۔ اس نے ذہن پر بہت زور ڈالا۔ شاید حواس آختہ ہو جاتے ہیں، یا شاید سبق دُہرانے کو آختہ کہتے ہیں۔ پھر اُسے خیال آیا کہ ذخیرے کو آختہ کہتے ہیں۔ مگر اس کا کیا مطلب ہوا؟ وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ذہن پر زور ڈالتے ڈالتے سو گیا۔

رات کو جب کبھی اسرار کی آنکھ کھلتی، ذہن میں یہ نیا لفظ بے کل ہوتا۔ ایک بار اُس کی آنکھ کھلی تو اسے یوں لگا جیسے ابھی کوئی سرہانے کھڑا تھا۔ اُس نے گردن اٹھا کر ادھر اُدھر بہت دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ پھر باہر برآمدے سے چوڑیاں کھنکنے کی اور کاغذ کا پُرزہ پھاڑنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اسرار نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بہت دیکھا۔ ہوا میں سوندھی مٹی کی خوشبو تو سُنگھائی دی لیکن نظر کچھ نہ آیا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، پہلی تاریخ دور سرکتی گئی۔ بستی والوں نے اسے نظروں سے اس طرح اوجھل کر دیا کہ ایک روز ایک سائیکل والا اس سے ٹکرایا تو یوں حیران ہوا جیسے ہوا کے کسی جھونکے سے ٹکرایا ہو۔

ڈاکیا اس کا خط لایا تو ہاتھ میں دینے کے بجائے دور سے یوں پھینکا جیسے خط اس کے قدموں میں نہیں، دریا میں پھینک رہا ہو۔

پھر ایک رات نڈھال ہو کر اس نے خود کو بستر پر یوں گرایا جیسے بستر پر نہیں دریا میں گرا رہا ہو۔ وہ کراہنے لگا اور اپنے کراہنے پر خود حیران ہونے لگا۔ یہ کیسا کراہنا تھا؟ وہ تو اچھا بھلا تندرست اور توانا تھا۔ مگر اس کراہنے میں ایک عجیب طرح کی راحت بھی تھی۔ وہ اس عجیب طرح

Scanned with CamScanner

کی راحت کو محسوس کرتے کرتے سو گیا۔ وہ سو تو گیا لیکن محسوس اسے یوں ہوا جیسے اس سے سویا نہیں جا رہا ہے۔

کسی نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور اسے صاف محسوس ہوا کہ دروازہ کھولنے والا اندر آ گیا ہے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا کسی کے یوں دبے پاؤں آنے سے آختہ کیے جانے کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ اُس نے سوچنا چاہا مگر اس سے سوچا نہ گیا۔ وہ یوں بنا پڑا رہا جیسے سو رہا ہو۔

اندر آنے والے نے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور اُسے صاف محسوس ہوا کہ کوئی پنجوں پر چلتا ہوا اس کے قریب آ رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ قریب آتا گیا بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ اٹھنے والی سوندھی خوشبو بھی قریب آتی گئی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ خوشبو اُس رات چوڑیاں اُتار کر آئے گی۔

اگلی صبح اسرار دفتر نہیں گیا۔

میں بتاتا ہوں اسرار کہاں گیا۔

نالے کے دوسری طرف، پہاڑیوں کے دامن میں قبائلیوں کا جو ڈیرا ہے، وہ وہاں گیا۔ وہاں شادی بیاہ میں چلانے کے لیے اصلی بندوقیں کرائے پر ملتی تھیں۔ وہ بندوق کرائے پر لینے گیا تھا۔ اُس نے سنا تھا کہ بندوق کرائے پر دینے والے کبھی پوچھتے نہیں کہ بندوق کا کیا کرو گے، لیکن اُس روز اُس قبائلی نے اس سے پوچھا کہ بندوق کا کیا کرو گے؟

اُس نے کہا، اور ہر لفظ کے معنی اچھی طرح سمجھتے ہوئے کہا، "چوہدری عبدالہادی کا آختہ۔"

**

قیصر تمکین

ایک کہانی، گنگا جمنی

"شکریہ اس مظہرِ کمالاتِ خداوندی کا جس کے وجودِ سراپا محمود نے بزمِ تاریک امکاں میں نورِ وحدت و شریعت کی تابنا کی کو..."

"پر۔ستم آن ملو..."

"لاحول ولا قوۃ! ابے کم بخت کون ہے؟ پر۔ستم پر۔ستم لگائے ہے۔"

"یا... آن... ملو..."

"ابے چپ الو کے پٹھے! ابھی آن ملتا ہوں تیری اماں سے۔" مرزا بیدار بخت اب واقعی زور سے غصے میں چلائے۔ مگر جواب میں بالکل گھر کے دروازے پر ہی کسی نے ان کو چڑھانے کے لیے تان لگائی، "یان آن ملو۔" اب مرزا بیدار بخت سے بالکل ضبط نہ ہو سکا۔ چاندی کی موٹھ والی ڈیڑھ گز لمبی لاٹھی اٹھائی، پیروں میں گرگابیاں ڈالیں اور باہر کی طرف چلے۔ بیوی نے راستا روکا اور بیٹی نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے کی کوشش کی۔ مگر مرزا کا غصہ اپنے شباب پر تھا۔ دونوں کو ایک طرف ڈھکیل کر لاٹھی ٹھونکتے یہ جا وہ جا۔

Scanned with CamScanner

باہر نکل کر انھوں نے دیکھا اور بڑی بانگی سے لاٹھی ٹھونکی۔

چاندی والی گلی میں حسبِ معمول صبح کا شور شرابا دوپہر سے گلے مل رہا تھا۔ قلعی گر برتنوں پر رانگے کے چمکتے چھلّوں سے قلعی کرنے میں مصروف تھے۔ نیچی نیچی چھتوں والی اندھیری دوکانوں میں پتنگ بنانے والے اپنے فن کو آخری سنبھالا دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گلی کے برابر محلسرا کی لکھوری اینٹوں کی دیوار پر کھونٹیاں اور چرخیاں لگا کر کنکوّوں کے لیے ڈور اور مانجھا بنایا جا رہا تھا۔ میونسپلٹی کے موٹی دھار کے بمبے پر حافظ بشیر کی بیوہ ترکاریوں کا ڈھیر لگائے شلجم دھو رہی تھی۔ بانکے لال کے "کریانہ اسٹور" پر اُدھار آٹا دال مانگنے والی سیدانیاں برقعے اوڑھے، نقاب اُلٹے، بھاری بھاری کولھوں پر ریں ریں کرتے اور ناک بہاتے بچے لگائے طرح طرح کے بہانے بنا رہی تھیں۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں مہین تار جیسے چاندی کے چھلّے، ایک آدھ سونے کی بالی، ناک کی کیل یا کسی ننھی بچی کی چھوٹی سی چوڑی بھی تھی جس کو رہن رکھ کر وہ جو ملا آٹا یا دھان سلے کا گن جیسے چاول لے جانے کی فکر میں تھیں۔ یہ چاندی سونے کے چھلّے محض نام کے لیے رہن رکھے جاتے کیوں کہ ایک بار اگر کوئی چیز بانکے لال کے "کریانہ" اسٹور پر رہن ہو جاتی تو پھر اس کو واپس چھڑانے کا کبھی کوئی سوال ہی نہ اُٹھتا۔ برقعے والیاں خوشامد کر کے آٹا دال گھر لے جاتیں جہاں گیلی لکڑیاں پھونک کر اُن کی آنکھیں سوج جاتیں، محض اس ڈر سے وہ اس عذاب میں مبتلا رہتیں کہ چراغ جلے جب روزی کمانے والا گھر پہنچے تو بھوکا نہ سو سکے۔

گلی کی چاؤں چاؤں میں نبی بخش زر کوب چاندی کا ورق کوٗٹے جا رہا تھا، جس سے ہمیشہ ایک مخصوص زندگی بخش آہنگ برپا رہتا۔ افتخار کسگر، عارف قلعی گر، اور عبداللہ شیرینی فروش کی دکانوں کے آگے پہنچ کر اس گلی کا روپ بدلنے لگتا۔ بڑی بڑی کھُلی اور دو تین دروں والی دکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا، جن میں چکن کامدانی بنانے والوں، بزازوں اور انگریزی دوائیں بیچنے والوں اور پھر تانبے پیتل کے برتنوں کا کاروبار کرنے والوں کی دکانیں آتیں، اور ان کے بعد گلی کا ایک سرا کچھ اس طرح شہر کی بڑی سڑک کے چوراہے پر مل جاتا کہ منظر بدلنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔

چوراہے پر موٹروں، یکوں، تانگوں، رکشوں اور سائیکل سواروں کے ہجوم میں پتا بھی نہ چلتا کہ اسی سڑک کے متوازی ایک نیم روشن، سیلی ہوئی، ٹھنڈی ٹھنڈی چاندی والی گلی بھی ہے جس کے وسط میں عالمِ دوراں اور فاضلِ اجل مرزا بیدار بخت کا غریب خانہ بھی ہے جہاں وہ عصرِ حاضر کا

تاریخ ساز صحیفہ رقم فرمانے میں مصروف ہیں اور اندر گھر میں ان کی بیگم اور بیٹی پرانے دنوں کے کامدانی کے دوپٹوں سے چاندی کے تار کھینچ کھینچ کر چولہا گرم کرنے کی کسی نئی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

مرزا بیدار بخت نے شرربار نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ان کو "پریتم آن ملو" کی دعوت دینے والا تو کوئی نہ دکھائی دیا، ہاں افتخار کسگر اور نبی بخش زر کوب کی دکانوں سے پرے وہ بڑا لنگوری بندر خوخیاتا نظر آیا جس کے بارے میں آج کل گلی میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ بندر کا منہ خاکی رنگ کا تھا۔ اس کی دُم بے تحاشا لمبی تھی۔ یہ بندر گلی کے سُناروں کے لڑکوں نے پالا تھا اور اس کا خاص کام میاں لوگوں کی پگڑی اُچھالنا تھا۔ ابھی کوئی ہفتہ دس دن پہلے اس نے مولوی حقّی کی بڑی بُری گت بنائی تھی۔

مولوی حقّی اپنی گھنی داڑھی مونچھوں کے بیچ میں ایک پائپ کھونسے رہتے تھے۔ وہ محکمۂ اطلاعات میں اخبارات پڑھنے، ان کے تراشے نکال کر اپنے تبصروں کے ساتھ متعلقہ شعبوں اور افسروں کو بھیجنے کی خدمت پر مامور تھے۔ ان کی حیثیت اَپر ڈویژن کلرک کی تھی، مگر وہ اپنے کو ادبِ اسلامی کا دانشور بھی کہلاتے، چناں چہ ہر وقت منہ میں پائپ دبائے رہتے۔ یہ پائپ عام طور پر بجھا ہی رہتا، کیوں کہ کثیر العیالی کی بنا پر وہ مہینے میں صرف ایک ہی ڈبّا اپنی جماعت کے رفیق ٹیڈی ملّا کی دکان سے حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ اس ڈبّے کو وہ بہت کفایت سے استعمال کرتے۔ وہ سائیکل ہاتھ میں پکڑے پکڑے گلی طے کرتے اور سُناروں کے علاقے میں داخل ہوتے ہی اس پر بیٹھتے، اور ریاستی سکرٹیریٹ کی طرف روانہ ہوتے۔ لنگوری بندر نے کئی بار دور ہی دور سے مولوی حقّی کو دھمکایا اور چڑھایا بھی، مگر وہ اپنی آبرو بچا کر نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ حال ہی میں بندر نے مولوی حقّی کی نقل میں ایک لال گاجر منہ میں لگالی۔ سُناروں کے لڑکے خوب ہنسے، اور طرح طرح کے آوازے کسے، جن کا مطلب تو مولوی حقّی خوب سمجھتے تھے، مگر بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی بنا پر وہ کوئی اعتراض کر سکتے۔

مولوی حقّی نے پائپ منہ میں لگایا اور سائیکل پر سوار ہونے ہی کو تھے کہ لنگوری بندر نے اُچھل کر ان پر حملہ کیا اور معلوم نہیں کس مہارت سے ان کا پائپ چھین کر الگ کھڑا ہو گیا، اور مولوی حقّی ہی کی طرح پائپ منہ میں لگا کر انھیں کے حلقے کا چھوٹا موٹا دانشور نظر آنے لگا۔ مولوی

حقّی نے کچھ کہنا چاہا تو بندر نے اپنی دُم اس طرح گھمائی کہ مولوی حقّی کے ہاتھ سے سائیکل چھٹ گئی اور وہ گھبرا کر ایک طرف ہو گئے۔ سائیکل کی کئی تیلیاں ٹوٹ گئیں۔

دو ایک قلعی گر، کنکوے بنانے والے اور کسگر جلدی سے آئے اور مولوی حقّی کو دلاسا دینے لگے: "اجی چھوڑیے مولوی صاب۔ یہ لیجیے، سائیکل سنبھالیے۔ اجی اپنی راہ نکلیے۔ بے فائدہ بے فضول میں اپنی بے عزّتی خراب کرنے سے کیا فائدہ۔"

مولوی حقّی اپنا بایاں گھٹنا جھاڑتے غم وغصّے کے احساس کے ساتھ سائیکل پکڑے پکڑے پیدل ہی دفتر چل دیے۔

یہ واقعہ مرزا بیدار بخت کے گھر میں کئی عورتوں کا موضوعِ گفتگو رہا تھا۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ اس لنگوری بندر کی وجہ سے شریفوں کا اس گلی سے گزرنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔ یہ بندر روز ہی کسی نہ کسی میاں بھائی کی گت بنا ڈالتا۔ خاص طور پر برقعے والیوں اور پردے دار عورتوں پر اس طرح جھپٹتا کہ اچھے اچھے گھرانوں کی سیدزادیاں بے پردہ ہو کر بھاگنے اور گڑگڑانے کے سوا کچھ نہ کر پاتیں۔

اس دن جب کسی نے بے فکری میں "پر-تم آن ملو" کی راگنی الاپی تو مرزا خفا ہو کر باہر نکل آئے۔ ان کو "پر-تم آن ملو" کی دعوت دینے والا نظر نہ آیا، ہاں لنگوری بندر ان کو دیکھ کر ضرور خوخیانے لگا۔ مرزا کا حُلیہ بھی کچھ ایسا تھا کہ ہر شخص کی نظر ان پر پڑ رہی تھی۔ بندر نے ان کو دھمکانے کے لیے جو خوخیانا شروع کیا تو مرزا اکڑ کر آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ بندر نے ان کا چیلنج قبول کر لیا اور گھما کر اپنی دُم سونٹے کی طرح ماری۔ مرزا بیدار بخت اُچھل کر ایک طرف ہو گئے اور اپنی جوانی کے زمانے کا ہاتھ دکھاتے ہوئے گھما کر جو لاٹھی ماری تو بندر کا دماغ شل ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور اس کی ناک سے خون کی دھاریں نکلنے لگیں۔

"ہائے رام غجب ہوئی گوا!" کئی لوگوں نے سنسنی خیز لہجوں میں آوازیں لگائیں۔ لالہ دھونی چند دھوتی سنبھالتے آگے بڑھے، مگر تب تک مرزا بیدار بخت نے دو ہاتھ اور جڑ دیے۔ بندر کا بھیجا پھٹ گیا اور وہ وہیں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

"ہائے رے! دیّارے! کا کر ڈالیو مرجاجی..." گلی کی کھٹنک عورتیں سناٹے میں آ گئیں۔

"رام رام رام... ہتیا ہوئے گئی... ہنومان ہتیا ہوئے گئی!" صرّافوں کے شیطان لڑکے وحشت زدہ لہجوں میں چلّانے چیخنے لگے۔ پوری گلی میں سنسنی پھیل گئی۔ "ارے مرزا صاحب، کیا

غضب کر دیا!" افتخار کنگر، عارف قلعی گر اور رام لال کُمہار مرزا کو ایک طرف کھینچنے لگے۔ مگر تب تک مرزا بیدار بخت غصّے میں بے قابو ہو چکے تھے، اور فحش گالیاں بکنے لگے تھے۔ "اب کے اگر کوئی مادر چود حرامی پَن کرے گا تو سالے کے چوتڑوں میں یہی لاٹھی نہ گھسیڑ دوں تو میں بھی اصل مغل بچّہ نہیں...."

یہ مغلیہ آن بان دیکھ کر مانی لال کے لڑکے نے "ہر ہر مہادیو" کا نعرہ لگا دیا۔ جواب میں برابر بڑھتے ہوئے مجمعے نے "جے ہنومان کی" اور "بھارت ماتا کی جے" کے نعرے لگائے۔

سُناروں کے لڑکوں نے داڑھی والوں، چو گوشیہ ٹوپی والوں، اور تہمد و پاجامہ پوش لوگوں کی گھونسوں، لاتوں، اور مکّوں سے تواضع شروع کر دی۔ بعض وِیر جوانوں نے پلنگ کے پایوں اور پٹّیوں سے بھی میاں لوگوں کی مرمّت میں دلچسپی لی۔ تب تک پوری گلی میں دھڑادھڑ دکانیں بند ہونے لگیں۔

علی جانی کربلائی کے تعزیے، ضریح اور علم باہر رکھے تھے۔ اس نے ڈر کے مارے گھبرا کر ان کو دکان کے اندر رکھنا شروع کیا تو سیتارام کھَرے اور مانی لال کے لڑکے ان پر گوبر اور جوتے پھینکنے لگے۔ علی جانی کربلائی کا جوشِ ایمان جلال پر آ گیا، اور اس نے "یا علی" کہہ کر دُرگا تنبولی کے نوجوان بیٹے کے سینے میں قرولی بھونک دی۔ سولہ سترہ برس کے خوب رُو جوان کا خون دیکھ کر سیوا دَل کے نَویُوَوکوں کو جوش آ گیا، اور بالکل جادوئی طریقے پر ہر طرف سے چاقو چُھریاں نکل آئیں جو حال ہی میں پردیش کانگرس کے پردھان، شری اَمرت لال گنتھے، نے نوجوانوں کو پاکستانی جاسوسوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بانٹی تھیں۔

چُھری چاقو کے استعمال سے فساد پورے رنگ پر آ گیا۔ پنّالال کے پُل پر بنی ہوئی پولیس چوکی پر تعینات پی اے سی کے بہادر جوان ایک ہی ریلے میں گُھس آئے، اور اُنھوں نے میاں جی لوگوں کے پاجامے اور تہمدیں اُتار اُتار کر اچھی طرح دُھنائی شروع کر دی۔ میاں جی لوگوں کے حُلیے اس طرح بگڑ گئے کہ ان کی مائیں بھی ان کو نہ پہچان سکتیں۔ پی اے سی کے بہادر جوانوں کو دیکھ کر رام لال کے لڑکوں، کھرے بابو کے چیلوں، اور نارنگ جی کے نویُووکوں کو اطمینان ہوا۔ انھوں نے مٹّی کے تیل کے ڈبّے لا لا کر میاں لوگوں کی دکانوں پر چھڑکنا شروع کیا۔ تین بجتے بجتے چاندی والی گلی کا ایک حصّہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ تب تک آکاش وانی نے اپنی قومی خبروں میں اعلان کر

دیا کہ "خانپور شہر میں پاکستانی گھس بیٹھیوں نے گڑبڑ کی جس سے دو گھس بیٹھیے مارے گئے۔"

دوسرے دن اسی جلی اور جھلسی ہوئی چاندی والی گلی میں ایک بڑا سا لال کپڑا بچھا تھا جس پر لنگور کی لاش پڑی تھی۔ اس کے آس پاس کھرے کھوٹے سکوں کا ڈھیر تھا۔ لاش کے سرہانے دھوپ جل رہی تھی۔ ہنومان جی کے پجاری دور دور سے آ کر کپڑے پر پیسے ڈال رہے تھے۔ ظہور تمباکو والے نے پورا سو کا نوٹ احتیاط سے بندر کی لاش کے سرہانے رکھا اور آدب سے دونوں ہاتھ جوڑ کر وہاں سے منہ ہی منہ میں دعائیں پڑھتا ہوا ہٹ گیا۔

افتخار کنگر اور عارف قلعی گر کی جلی ہوئی دکانوں کے سامنے چارپائیاں پڑی تھیں، جن پر پی اے سی کے بہادر جوان بیٹھے تھے۔ ان کی پگڑیاں اور لوہے کے ٹوپ چارپائیوں کے سرہانے دھرے تھے، اور وہ خود اس طرح بیٹھے تھے کہ ٹانگوں کے بیچ میں سنگین لگی بندوقیں اور لاٹھیاں کھڑی تھیں۔ پی اے سی کے بہادر جوان مونچھیں مروڑ کر پیتل کے چمکتے گلاسوں میں دودھ اور بادام میں گھٹی ہوئی بھانگ پی رہے تھے جو پردیش کانگرس کے پردھان، شری امرت لال گنتھے، کے گھر سے برابر بھیجی جا رہی تھی۔

۲

"دو گھس بیٹھیے مارے گئے؟"

تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز نے، جو اردو ادب میں گنگا جمنی قدروں کی علم بردار تھیں، متعجب ہو کر خود سے سوال کیا۔

تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز کو نہ فساد کا ڈر تھا اور نہ آگ لگنے کا خوف۔ جس دن ہنومان ہتیا ہوئی، وہ اطمینان سے بی بی کے حجرے میں حالات کا مشاہدہ کر رہی تھیں، اور ان کے شوہر مزے سے ہندی ساہتیہ گوشٹھی کے کاریالیہ میں بیٹھے اردو "بولی" کی لپی بدلے جانے کے بارے میں کسی نوین وچار دھارا کی چرچا میں مصروف تھے۔

تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز، بی بی کے حجرے میں محفوظ تھیں۔ یہ حجرہ موکھم چندر کھیم جی

کی کوٹھی کا حصہ تھا جس کی کھڑکیاں سڑک اور گلی دونوں طرف کھلتی تھیں۔ اس کے باوجود موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی تھی۔ یکّا تانگا یونین کے پریشان حال اور تلخ نیتا شرمالی جی کا کہنا تھا کہ "یدی بھگوان سویم اپنے ہاتھ سے سنسار کو ناش کرنا چاہیں تو وہ بھی موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی کے بارے میں وچار جرور کریں گے۔"

موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی کا بالائی حصہ ہوائی جہاز کی شکل کا تھا۔ اگر دو تین میل کی دوری سے دیکھا جاتا تو یہی لگتا جیسے چھت پر کوئی جمبو جٹ کھڑا ہے۔ اس کے نیچے کئی حصے تھے۔ ایک حصہ بی بی کا حجرہ کہلاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موکھم چندر کھیم جی جب چار باغ اسٹیشن کی ریلوے ورک شاپ میں کام کرتے تھے تو ایک بار انجنوں اور مشینوں کے بیچ میں اس طرح پھنس گئے کہ زندہ بچنا ناممکن تھا۔ معلوم نہیں کیوں ان کے منھ سے نکلا "یا بی بی سیدہ مدد!" خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بجلی فیل ہو گئی، جس سے ساری مشینیں ٹھپ ہو گئیں، اور موکھم چندر کھیم جی بچ نکلے۔ ذرا سی خراش بھی تو نہ آئی۔ اس کے بعد موکھم چندر کھیم جی کے گھر والوں کو ایسا اعتقاد ہو گیا کہ ان کے دیہانت کے بعد ان کی اولاد نے بھی کوٹھی میں علم اور تعزیے رکھنے کی روایت برقرار رکھی۔ کوٹھی کا ایک حصہ اس کے لیے وقف رہتا، اور اس حصے کو جسے بی بی کے حجرے کا نام دیا گیا، ایک کھرے سید گھرانے کے لیے وقف کر دیا گیا۔ آج کل اس امام باڑہ نما حجرے میں تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز مقیم تھیں، جن کو نان نفقہ چھوڑ کر پاندان اور میوہ خوری کے لیے دو سو روپے نقد سیٹھ جی کے ذاتی اخراجات کی مد سے ملتے۔

تو جب آکاش وانی نے راشٹریہ سماچار میں گھوشنا کی کہ دو پاکستانی گھس بیٹھیے مارے گئے تو تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز اپنی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کی اونچی لے کے باوجود ذرا سوچ میں پڑ گئیں۔ فساد کا تماشا دیکھتے ہوئے اُنھوں نے خود گنا تھا ـــــ گیارہ مُردے تو صرف ایک ٹرک میں ڈالے گئے تھے۔ وہ سب پاکستانی گھس بیٹھیے تھے کیوں کہ سب کے نچلے بدن ننگے تھے اور ایک مُردے کی ننگی ٹانگوں پر کالے پڑتے ہوئے بھورے خون کے ساتھ پتلا پتلا گُو بھی جما ہوا تھا۔ شاید اس گھس بیٹھیے پر جامِ شہادت پیتے وقت اللہ کا خوف بھی طاری ہو گیا تھا۔

فساد کی لبڑ دھوں دھوں، کالے کالے دھویں کے مرغولوں، اور مارا ماری کے ہنگامے میں کسی کا بھی دھیان بی بی کے حجرے کی طرف نہیں گیا جہاں تحسین باجی عرف ثریا شہلا نازِ گن رہی

تھیں: ایک... دو... تین...

گیارہ تک کی گنتی تو ان کو یاد تھی۔ کتنے لوگ زخمی ہوئے تھے اور ان کا کیا حشر ہوا، اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز سوچ رہی تھیں تو یہ کہ وہ جب اس فساد کے بارے میں کہانی لکھیں گی تو کیسے؟ گیارہ پاکستانی گھس بیٹھیوں کی لاشیں تو انھوں نے خود گنی تھیں۔ اس کے مقابلے میں دیش سیوکوں کی ایک بھی ارتھی نہیں اُٹھی تھی۔ صرف ایک دُرگا تنبولی کا بیٹا شاردا ہی بُری طرح گھائل ہوا تھا۔ جب تک گھس بیٹھیوں کے ہاتھوں دیش سیوکوں کی بپتا کا حال اچھی طرح نہ بیان کیا جائے، کہانی میں "بیلینس" نہیں پیدا ہوگا۔ ہندی ساہتیہ کاروں اور اُپنیاس لکھنے والوں کو اگر اس توازن، معاف کیجیے، "بیلینس" کا خیال نہ ہو تو نہ سہی، پر اردو کہانی میں جب تک یہ "بیلینس" نہ ہو، اس کو نہ تو گنگا جمنی تہذیب مانا جائے گا اور نہ ترقی پسندی کی سند مل سکے گی۔

سوچتے سوچتے تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز اس نتیجے پر پہنچیں کہ اتنے بڑے فساد کے بارے میں ایک کہانی لکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے بارے میں تو پورا ناول لکھنا چاہیے؛ اس میں پھر اچھی طرح توازن، معاف کیجیے گا، "بیلینس" کر دیا جائے گا۔

"سوتنتر دیش" کے سمپادک شری کملیش مِشر نے فساد پر تبصرہ کرتے ہوئے سُناروں کے لڑکوں کی کڑی آلوچنا کی کہ اُنھوں نے بیچ گلی میں لنگوری بندر پال کر شریفوں کی آمدورفت دشوار کر دی تھی۔ شری کملیش مشر نے لکھا کہ ہنومان جی تو سچائی کا پالن کرنے اور سچوں کی مدد کرنے کے لیے آئے تھے؛ اس طرح کی گنڈا گردی تو ان کا اپمان کرنا ہے۔

شری کملیش مشر کے تبصرے کو پڑھ کر شمشیر سلبوقی، ڈی لِٹ، بہت خوش ہوئے۔ اُنھوں نے شری کملیش مشر کے سپوت شری اَکھلیش مِشر کو عربی زبان و ادب میں سو میں سے ایک سو دس اعزازی نمبر دیے۔ اس کے علاوہ ان کو ایک طلائی تمغا بھی عطا ہوا جس کے بعد قاہرہ کے ہندوستانی سفارت خانے میں شری اکھلیش مشر کی تقرری پکّی ہو گئی۔

Scanned with CamScanner

۳

چاندی والی گلی میں میاں لوگوں کے اندھیرے، پرانے، سیلے، اور بُھر بھری مٹی کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر مائلِ انہدام مکانات جب جل چکے اور ملبہ صاف کیا جا چکا، اور وہاں نئی بستی بسانے کا ٹھیکا حکم چند مولی چند بنتھیا کو مل چکا، تو پنڈت کیلاش ناتھ خزاں اور منشی پیارے لال غمزدہ نے تحسین باجی عرف ثریّا شہلا ناز کے تعاون سے ایک قومی یکجہتی مشاعرے کا انتظام کیا جس میں پاکستان سے سیاسی پناہ کی تلاش میں آئے ہوئے ادیبوں اور شاعروں نے بھرپور حصّہ لیا۔ صدارت مولوی گنگا پرشاد مدنی، فاضلِ دیوبند، نے کی۔ حضرت بے پایاں سمندری نے مرحوم لنگور کی موت پر ایک حسرت ناک و اندوہ ناک مرثیہ پڑھا۔ مفتی صبغت اللہ حجازی نے کہا کہ چوں کہ سائنس اور انتھروپولوجی کی رو سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ہنومان جی انسانوں کے مورثِ اعلیٰ تھے، اس لیے میں نے آج تک جو بھی قرآنِ کریم پڑھا ہے اس کا ثواب مرحوم لنگور کی روح کو بخشتا ہوں۔

پوری محفل جذبۂ اتّحاد، قومی یکجہتی، اور رواداری کے جذبے سے سرشار ہو گئی۔ پاکستانی ادیبوں اور شاعروں نے حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "افسوس، ہمارے ملک میں یہ وسیع النظری پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔"

"وہاں تو اسلام بیٹھا ہوا ہے،" سنجیدہ نیازی نے حقارت اور طنز سے آواز بڑھاتے ہوئے کہا، پھر رتن سنگھ ڈھینگرہ کی گود میں بیٹھ کر ڈائر میکن کی "سولن" منہ سے لگا لی۔

**

(بہ شکریہ Annual of Urdu Studies، میڈیسن، وسکانسن، یو ایس اے۔)

وِبھوتی نراین رائے

وِبھوتی نراین رائے ہندی کے منفرد ادیب ہیں۔ وہ ۲۸ نومبر ۱۹۵۰ کو پیدا ہوئے اور بنارس اور الہ آباد میں تعلیم پائی۔ انھوں نے ۱۹۷۱ میں الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور ۱۹۷۵ میں انڈین پولیس سروس میں منتخب ہوئے۔ ان کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ الہ آباد سے شائع ہونے والے ہندی ادبی ماہ نامہ "ورتمان" کے مدیر بھی ہیں۔ ان کا مختصر ناول "شہر میں کرفیو"، جس کا ترجمہ اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر لکھی گئی بے باک اور عمدہ تحریروں میں سے ایک ہے اور خاصا موضوعِ بحث رہا ہے۔ اس ترجمے کے لیے ہم سہ ماہی "ارتقا"، کراچی، کے ممنون ہیں۔

وِبھوتی نراین رائے

ہندی سے ترجمہ: وقار ناصری

شہر میں کرفیو

۱

شہر میں کرفیو اچانک نہیں لگا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے شہر کا وہ حصہ جہاں ہر دوسرے تیسرے برس کرفیو لگ جایا کرتا ہے، اس کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر اپنے کو تیار کر رہا تھا۔ پوری فضا میں ایک خاص طرح کی سنسنی تھی اور سنسنی کو سونگھ کر پہچاننے والے تجربہ کار لوگ جانتے تھے کہ جلد ہی شہر میں کرفیو لگ جائے گا۔ انھیں صرف اس بات پر حیرت تھی کہ آخر پچھلے ایک ہفتے سے کرفیو ٹلتا کیسے جا رہا تھا۔ بلوا قریب ڈیڑھ بجے شروع ہوا۔ پونے دو بجتے بجتے پولیس کی گاڑیاں لاؤڈاسپیکروں پر کرفیو لگنے کا اعلان کرتی گھومنے لگی تھیں، حالاں کہ کرفیو کا اعلان محض رسمی سا تھا کیوں کہ پندرہ منٹ میں خلد آباد کی سبزی منڈی سے لے کر بہادر گنج تک، جی ٹی روڈ پوری طرح سے خالی ہو گئی تھی۔ اکادکا دکان دار اور افراتفری میں اپنے مردوں سے بچھڑی عورتیں ہی بدحواس سی جی ٹی روڈ پر بھاگ رہی تھیں۔ اگست کے آخری ہفتے میں ہوئے اس فساد کا ریہرسل جون میں ہو چکا تھا، لہٰذا لوگوں کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ ایسے موقعوں پر کیا کِیا جانا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

انھیں پتا تھا ایسے موقع پر سب سے پہلا کام دکانوں کے شٹر گراتے ہوئے اپنی سائیکلیں، چپّل، جھولے سڑکوں پر چھوڑتے ہوئے گلی گلی اپنے گھروں کو بھاگنے کی کوشش کرنا تھا۔ انھوں نے یہی کیا اور تھوڑی ہی دیر میں جی ٹی روڈ، کاٹھو روڈ، مرزا غالب روڈ اور نور اللہ روڈ جیسی سڑکیں ویران ہو گئیں۔ صرف گلیوں کے دہانوں پر لوگوں کے جُھنڈ کھڑے تھے جو پولیس کے آنے پر اندر بھاگ جاتے اور پولیس کے ہٹتے ہی پھر واپس اپنی جگہ پر آجاتے۔ شاہ گنج پولیس چوکی کے پیچھے منہاج پور اور منصور پارک کے پیچھے گلاب باڑی کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں کافی تیزی سے آرہی تھیں۔ ان کے علاوہ چھُٹ پُٹ آوازیں گلیوں سے یا اکبر پور، نہال پور اور مرزا غالب روڈ سے آ رہی تھیں۔ دو بجتے بجتے فوج بھی شہر میں آگئی اور اس نے شاہ گنج، نور اللہ روڈ اور شوکت علی مارگ پر پوزیشن لے لی۔ ڈھائی بجے تک ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی جس نے جلد ہی موسلادھار بارش کا رنگ اختیار کر لیا اور اس بارش نے سب کچھ شانت کر دیا۔ تین بجے تک کھیل ختم ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے۔

باہر سڑک پر صرف خوف تھا، پولیس تھی، اور اگست کی سڑی گرمی سے نجات دلانے والی موسلادھار بارش تھی۔

کل ملا کر ڈیڑھ گھنٹے میں جو کچھ ہوا، اس میں چھ لوگ مارے گئے، تیس چالیس لوگ زخمی ہوئے اور تقریباً تین سو لوگ گرفتار کیے گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے چیل کی طرح آسمان میں منڈلانے والے ایک طوفان نے یکایک نیچے جھپٹا مار کر، شہر کو اپنے نوکیلے پنجوں میں دبوچ کر نوچ کھسوٹ ڈالا ہو اور پھر اسے پنجوں میں پھنسا کر کافی اوپر اٹھ گیا ہو، اور اوپر لے جا کر اسے ایک دم سے نیچے پٹک دیا ہو۔ شہر بُری طرح سے لہولہان پڑا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے کے حادثے نے اس کے جسم کا جو حال کیا تھا اسے ٹھیک ہونے میں کئی مہینے لگنے تھے۔

ہوا کچھ ایسا کہ قریب ڈیڑھ بجے دن میں تین چار لڑکے مرزا غالب روڈ، جی ٹی روڈ کراسنگ پر بینک آف بڑودا کے پاس ایک گلی سے نکلے اور گاڑی بان ٹولے کے پاس ایک مندر کی دیوار پر بم پھینک کر واپس اسی گلی میں بھاگ گئے۔ جو چیز دیوار پر پھینکی گئی وہ بم کم پٹاخا زیادہ تھی۔ اس سے صرف تیز آواز ہوئی، کوئی زخمی نہیں ہوا۔ بم چوں کہ مندر کی دیوار پر پھینکا گیا تھا اس لیے اس وقت وہاں موجود ہندوؤں نے مان لیا کہ بم پھینکنے والے مسلمان رہے ہوں گے، اس لیے انھوں

نے ایک دم وہاں سے گزرنے والے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ سب سے پہلے ایک موٹر سائیکل پر جانے والے تین لوگوں پر حملہ کیا گیا۔ ان میں سے ایک، موٹر سائیکل سے گرتے ہی، کود کر بھاگ گیا۔ باقی دو زمین پر اُکڑوں بیٹھ گئے اور سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھکے اُس وقت تک لاتیں، گھونسے اور ڈھیلے کھاتے رہے جب تک پاس میں احمد گنج میں تعینات پولیس کی ایک ٹکڑی وہاں پہنچ نہیں گئی۔ اس کے علاوہ بھی اُدھر سے گزرنے والے کئی لوگ پٹے۔ تقریباً اسی کے ساتھ مرزا غالب روڈ پر صبح سے جگہ جگہ اکھٹے برافروختہ مجمعے نے اس سڑک پر تعینات پولیس کی چھوٹی ٹکڑیوں پر حملہ کر دیا۔ ان ٹکڑیوں میں دو تین سِول پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ چار چار پانچ پانچ ہوم گارڈ کے جوان تھے۔ تھوڑی دیر میں کافی تعداد میں پولیس اور ہوم گارڈ کے جوان مرزا غالب روڈ سے گاڑی بان ٹولے کی طرف بھاگتے دکھائی دینے لگے۔ گلیوں کے منھ پر کھڑے حملہ آور نوجوانوں اور لڑکوں کی بِھیڑ کے پتھروں سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھ سے چہرہ بچائے، وہ بینک آف بڑودا کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں احمد گنج سے پی اے سی اور پولیس کی ایک ٹکڑی پہنچ چکی تھی۔ ان بھاگنے والے سپاہیوں میں سے ایک بینک آف بڑودا سے قریب ایک فرلانگ پہلے ہی گر پڑا۔ اسے ایک بم لگ گیا تھا اور کانچ کی نُکیلی کِرچیں اس کے چہرے میں بھر گئی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھکے بھاگ رہا تھا۔ اچانک ایک گلی کے منھ پر بدحواسی میں ایک دم سڑک کے کنارے چلا گیا اور وہاں لڑکوں کی بھیڑ سے ٹکراتے ہوئے اس نے بیچ سڑک پر آنے کی کوشش کی کہ تبھی ایک چھُرا اس کی بائیں پسلیوں پر لگا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بیچ سڑک پر گر پڑا۔

قریب قریب ایک ساتھ کئی جگہوں پر بم پھینکنے اور فائرنگ کی وارداتیں ہوئیں۔ لگتا تھا جیسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت کوئی ان دیکھا ہاتھ ان سارے حادثوں کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ قریب قریب سبھی جگہوں پر بم پھینکے گئے۔ بم یا فائرنگ میں کوئی زخمی نہیں ہوا۔ ان کا مقصد صرف دہشت پیدا کر کے ایک خاص قسم کی سراسیمگی پھیلانا لگتا تھا اور اس میں انھیں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلے دو تین دنوں سے یہ بات ہوا میں تیر رہی تھی کہ مسلمان پولیس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور تقریباً یہی ڈر پولیس کے سپاہیوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ صوبے کے بھی علاقوں میں کچھ جھگڑے ہوئے تھے جن میں کافی مسلمان پولیس کی گولیوں سے مارے گئے تھے، اس

لیے مسلمانوں کے دلوں میں غصہ بھرا تھا اور اس طرح کا پرچار کیا جارہا تھا کہ مسلمان اگر اپنے محلے میں اکادکا سپاہیوں کو پا جائیں گے تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے مسلم علاقوں میں اکادکا سپاہیوں نے دو تین دن سے جانا چھوڑ دیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہتھیار بند سپاہی اور داروغہ چار چار پانچ پانچ کی تعداد میں ان علاقوں میں جاتے تھے۔

ایک ساتھ کئی جگہوں پر پولیس پر بم پھینکنے اور فائرنگ کی جو واردات ہوئیں ان میں زیادہ تر جگہوں پر کوئی زخمی نہیں ہوا۔ اکثر بم پھینکے جانے والے مقامات پر پولیس کھلے میں ہوتی اور بم ہمیشہ دس پندرہ گز دائیں بائیں کسی دیوار پر پھینکا جاتا جس سے زخمی کوئی نہ ہوتا لیکن مان لیا جاتا کہ اسے مسلمانوں نے پھینکا ہوگا، اس لیے فوراً اس علاقے کے سبھی مسلمان گھروں کی تلاشی لی جاتی۔ زیادہ تر مقامات پر کچھ برآمد نہ ہوتا؛ کچھ مقامات سے گوشت کاٹنے کے چھرے یا تھانے میں جمع کرنے کے حکم کے باوجود گھروں میں پڑے لائسنسی اسلحہ برآمد ہوتے اور گھر کے مرد ۲۵ آرمز ایکٹ یا دفعہ ۱۹۹ میں گرفتار کر لیے جاتے۔

تین بجے جب بارش تھمی تو اس نے شہر کو اگست کی سڑی گرمی کے ساتھ ساتھ تناؤ سے بھی فوری طور پر نجات دلادی۔ پکنک اور رومانس حاصل کرنے کے ارادے سے پولیس کی گاڑیوں پر نکلے صحافیوں کو بڑی مایوسی ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ شہر کی سڑکیں سُونی پڑی ہیں۔ لوگ گھروں میں تھے۔ سڑکوں پر پولیس کی بدحواس گاڑیاں تھیں، اور تناؤ چاہے کہیں رہا ہو فی الحال سڑکوں سے غیر حاضر تھا۔

بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دو تین سمتوں سے پولیس کی گاڑیاں آکر شاہ گنج پولیس چوکی کے پاس رُکیں۔ اس وقت تک فوج نے چوکی کے آس پاس پوزیشن لینی شروع کر دی تھی۔ چوکی کے اندر سے کچھ سپاہی باہر جھانک رہے تھے اور چوکی کے آس پاس اور سامنے آنکھوں کے اسپتال اور نرسنگ ہاسٹل تک بالکل سناٹا تھا۔ بارش کا زور کچھ تھما ضرور تھا لیکن بیچ بیچ میں تیز ہو جانے والی بارش پورے ماحول کو پراسرار خاموشی میں تبدیل کر رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں فائرنگ ہوئی تھی اور فائرنگ ختم ہونے کے فوراً بعد والا تناؤ پورے ماحول میں گھل مل گیا تھا۔

پولیس کی گاڑیوں سے دو ایس پی، ایک ڈی ایس پی، کچھ انسپکٹر اور سب انسپکٹر اترے۔

ان میں سے ایک دو نے چوکی کے پاس کی عمارتوں کے برآمدے میں بارش سے بچنے کے لیے پناہ لینے کی کوشش کی لیکن زیادہ تر لوگوں نے چوکی کے سامنے سڑک پر ایک گھیرا بنا لیا اور اگلی کارروائی کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ انھیں کنٹرول روم سے وہاں ہونے والی فائرنگ کی اطلاع ملی تھی۔ انھیں سڑک پر دیکھ کر چوکی میں چھپے ہوئے اکا دکا سپاہی بھی قریب آ گئے۔ سبھی کے جسم تیز پانی کی بوچھار سے بھیگے ہوئے تھے۔

جوشیلے لہجے میں ایک دوسرے کی بات کاٹتے ہوئے سپاہیوں نے جو بتایا اس کا مطلب یہ تھا کہ بیس منٹ پہلے وہاں فائرنگ ہوئی تھی، پولیس پر زبردست پتھراؤ ہوا تھا اور پولیس نے ایک عمارت کی چھت پر چڑھ کر فائرنگ کی تھی۔ چوکی کے پیچھے ملی جلی آبادی تھی اور کچھ دیر پہلے گلیوں سے چیخنے چلانے کی آوازیں آئی تھیں۔ اِس وقت کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن انھیں پورا یقین تھا کہ پیچھے کچھ گھروں پر حملہ ہوا ہے۔

طے یہ ہوا کہ اندر گھس کر دیکھا جائے؛ باہر سڑک پر کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اندر گلی میں ایک بھی آدمی مارا گیا یا کسی گھر میں آگ لگائی گئی تو اس کے نتائج کافی خطرناک ہو سکتے تھے۔ ابھی تک وارداتوں کا رخ ایسا نہیں تھا جس سے کسی غیر معمولی فرقہ وارانہ فساد کا شک کیا جا سکے، لیکن ایک بار گلیوں میں آتش زنی یا چاقو بازی کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا۔

دونوں ایس پی تھوڑی دیر تک آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے، پھر ایک جھٹکے سے وہ گلی میں گھسے۔ ان کے پیچھے پی اے سی اور پولیس کا جتھا تھا۔ منہاج پور ایک پارک کے چاروں طرف بسا ہوا محلہ تھا جس میں کھاتے پیتے مسلمانوں کے دو منزلہ سہ منزلہ مکان تھے۔ دوسرے مسلمان علاقوں کی غریبی اور گندگی سے یہ علاقہ پاک صاف تھا۔

موسلادھار بارش اور دہشت زدہ سناٹے نے ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ پولیس اور پی اے سی کے جوان اپنے بوٹوں کی آواز سے خود بیچ بیچ میں چونک جاتے تھے۔ سارے انسپکٹروں اور سب انسپکٹروں کے ہاتھوں میں ریوالور یا پستولیں تھیں اور سپاہیوں کے ہاتھوں میں رائفلیں۔ سب نے اپنے ہتھیار مکانوں کی طرف تان رکھے تھے۔ ہر مکان کے چھجے ... دشمن نظر آ رہا تھا۔ سب کی انگلیاں گھوڑوں پر کسی ہوئی تھیں اور جوش میں کسی لمحے کوئی بھی انگلی ٹرگر پر ضروری دباؤ ڈال کر

Scanned with CamScanner

ایسی صورت حال پیدا کر سکتی تھی جس سے فائر ہو جائے۔ بیچ بیچ میں ٹھہر کر افسر لوگ پھسپھسا کر جوانوں کو رائفلوں کی نالوں کا رخ ہوا میں رکھنے کا حکم دے رہے تھے۔ وہ مکانوں کے برآمدوں اور کھمبوں کی آڑ لے کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ ڈرے ہوئے لوگوں کا جھنڈ تھا اور ہر آدمی نے اپنے دل میں ایک خیالی دشمن گڑھ رکھا تھا جو اسے مکانوں کے چھجوں یا گلیوں کے دہانوں پر دکھائی پڑ جاتا لیکن بندوق کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی وہ دشمن غائب ہو جاتا تھا۔

جہاں پارک ختم ہو جاتا تھا وہاں پہلی بار ٹکڑی کو کامیابی ہوتی نظر آئی۔ پارک کے ایک دم کونے پر زمین پر گاڑھا لال خون ایک بڑے دائرے میں سڑک پر پڑا تھا۔ اس خون کو چاروں طرف سے کسی نے اینٹوں سے گھیر دیا تھا۔ اینٹوں کا یہ گھیرا چھوٹا تھا اور تیز بارش کی وجہ سے خون کا دائرہ پھیل کر اینٹوں کے گھیرے سے باہر نکل گیا تھا۔ خون بہت گاڑھا تھا اور پوری طرح سے جم نہیں پایا تھا۔ بارش کے پانی نے اسے چاروں طرف چھترا دیا تھا، پھر بھی اینٹوں کے گھیروں میں وہ جگہ تلاش کرنا مشکل نہیں تھا جہاں کوئی گولی کھا کر گرا ہو گا، کیوں کہ درمیان میں ایک جگہ پر خون زیادہ موٹے تھکّے کی صورت میں پڑا تھا اور وہاں سے بارش اسے بہا کر پتلی پتلی لکیروں کی طرح مختلف سمتوں میں لے گئی تھی۔

ٹکڑی کے سینیئر افسروں نے تھوڑی دیر تک خون کی موجودہ حالت اور بہنے والی لکیروں کی سمتوں کا معائنہ کیا۔ باقی سبھی لوگ اپنے ہتھیاروں کو کس کر پکڑے چاروں طرف بارجوں اور چھجوں پر نگاہ گڑائے رہے۔ تیز ہونے والی بارش نے چاروں طرف دھند لکے کی ایک پرت سی جما دی تھی۔ اس کے پار چھجوں پر کوئی صاف صورت دیکھ پانا نہایت مشکل تھا پھر بھی کوشش کرنے پر ہر برآمدے میں کسی کھمبے یا کھڑکی کی آڑ میں کوئی نہ کوئی پرچھائیں دکھائی پڑ ہی جاتی اور بندوق پر بھنچی ہوئی انگلیاں اور سخت ہو جاتیں۔ لیکن تھوڑی دیر لگاتار دیکھنے کے بعد پتا چلتا کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی انھیں دھوکا ہوا ہے اور انگلیاں دھیرے دھیرے ڈھیلی ہو جاتیں۔

خون کی دھار دیکھ کر افسروں نے ایک گلی کا راستا پکڑا۔ گلی پارک کی حد سے شروع ہوتی تھی۔ راستے پر پڑی لال خون اور کیچڑ سنی لکیر دیکھنے سے ایسا لگتا تھا کہ کسی زخمی آدمی کو لوگ گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ پورے محلّے کے دروازے بند تھے۔ بارش اور سناٹے نے اسے مشکل بنا دیا تھا کہ اس بات کا پتا کیسے لگایا جائے کہ زخمی کس مکان میں چھپایا گیا ہے۔ صرف زمین پر پھیلی اور پانی

سے کافی حد تک دُھلی پچھلی لکیر ہی ایک ایسا سہارا تھی جس کے ذریعے تلاش کی کچھ امید کی جا سکتی تھی۔

گلیاں عجیب مایاجال کی طرح پھیلی تھیں۔ ایک گلی ختم ہونے سے پہلے کم سے کم تین حصوں میں بٹتی تھی۔ آسمان میں چھائے بادلوں اور تیز بارش نے دن دوپہر کو ڈھلتی شام سے ہم کنار کر دیا تھا۔ گلیوں میں ہلکا ہلکا اُمس بھرا اندھیرا تھا۔ اس پورے ماحول کے بیچ سے خون کی لکیر دیکھتے ہوئے آگے بڑھنا اور خیالی دشمن سے اپنے کو محفوظ رکھنا دونوں کافی مشکل کام تھے۔ آگے کے دو تین افسر زمین پر نگاہیں گڑائے خون کی لکیر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے اور پیچھے کی ٹکڑی کے لوگ اپنی پستولوں اور رائفلوں کا رخ چھجوں اور بارجوں کی طرف کیے دشمن سے حفاظت کی کوشش کر رہے تھے۔ بارش کے تھپیڑے گلی کی اونچی دیواروں کی وجہ سے ایک دم سیدھے منہ پر تو نہیں لگ رہے تھے لیکن تیز موسلادھار بارش نے لوگوں کو سر سے پاؤں تک شرابور کر رکھا تھا۔

اچانک آگے چلنے والا ایک افسر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے افسر نے بھی دھیان سے کچھ سننے کی کوشش کی اور وہ بھی ٹھٹکا سا ایک جگہ کھڑا ہو کر صاف صاف سننے کی کوشش کرنے لگا۔ باقی ٹکڑی میں سے کچھ لوگوں نے ان دونوں افسروں کا کھنچا ہوا چہرہ دیکھ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور پھر دیواروں کی آڑ میں کھڑے ہو کر اندازہ لگانے لگے۔

بارش اور سناٹے سے بھیگے ہوئے ماحول کی خاموشی کو توڑتی ہوئی رونے کی آوازیں ہلکے ہلکے تیرتی ہوئی اس مجمعے کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ آوازوں نے انھیں اور زیادہ ہوشیار کر دیا اور وہ لوگ آہستہ آہستہ پاؤں جما کر اُسی سمت بڑھنے لگے۔ تھوڑی ہی دور بڑھنے پر آواز کچھ صاف سنائی دینے لگی۔

یہ رونے کی ایک عجیب طرح کی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے چار پانچ عورتیں رونے کی کوشش کر رہی ہوں اور کوئی ان کا گلا دبائے ہوئے ہو۔ بھینچے گلے سے رونے کا ایک الگ ہی درد ہوتا ہے ــــ ڈراونا اور اندر تک توڑ دینے والا۔ یہ رونا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جو آواز چھَن کر پہنچ رہی تھی وہ پتھر دل سے پتھر دل آدمی کو بھی ہلا دینے کے لیے کافی تھی۔

آواز کا پیچھا کرتے کرتے پولیس کی ٹکڑی ایک چھوٹے سے چوک تک پہنچ گئی۔ چوک سے

تین سمتوں میں گلیاں پھوٹتی تھیں۔ چاروں طرف اونچے اونچے مکانوں کے درمیان یہ چوک عام دنوں میں بچوں کے لیے چھوٹے سے کھیل کے میدان کا کام کرتا تھا اور دن میں اس وقت گلزار بنا رہتا تھا، لیکن آج وہاں بالکل سناٹا تھا۔ پولیس والوں کے وہاں پہنچتے پہنچتے آواز ایک دم غائب ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ پولیس کے وہاں تک پہنچنے کی آہٹ ماتم والے گھر تک پہنچ گئی تھی اور رونے والی عورتوں کا منھ بند کرا دیا گیا تھا۔

اس چھوٹے سے چوک کے اندر جتنے مکان تھے، پولیس والے پوزیشن لے کر ان کے باہر کھڑے ہو گئے۔ افسر بھی ایک کھمبے کی آڑ لے کر اگلے قدم کے بارے میں دبی آواز سے بحث کرنے لگے۔ اتنا یقین تھا کہ وہ مکان جس کے اندر رونا ہو رہا تھا، یہیں کہیں قریب ہی تھا کیوں کہ ان کے اس چوک میں پہنچتے ہی آوازیں ایک دم بند ہو گئی تھیں۔ انھوں نے کھمبوں کی آڑ ہی سے چوک کی زمین پر خون کی لکیر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ خون کا شائبہ زمین پر ملنا یہاں پر مشکل تھا کیوں کہ اس علاقے میں پانی صرف آسمان سے نہیں برس رہا تھا بلکہ قریب قریب سبھی مکانوں کی چھتوں سے نالیاں سیدھی چوک میں کھلتی تھیں؛ چھتوں کا اکٹھا پانی نالیوں سے ہو کر چوک میں موٹی دھار کی شکل میں گر رہا تھا اور اس سے پوری زمین لبریز تھی۔

اچانک ایک سپاہی نے جوشیلے انداز میں اپنا ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ وہ ایک بڑے سے حویلی نما مکان کی سیڑھیوں پر دروازے سے سٹ کر کھڑا تھا۔ دروازے کے اوپر نکلا بارجہ اسے بارش سے بچا رہا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر اسے لال رنگ کا دھبا نظر آ گیا۔ حالاں کہ اس دھبے پر بارجے کی وجہ سے سیدھی بارش نہیں پڑ رہی تھی، پھر بھی آڑی ترچھی بوچھاروں نے اسے کافی دھندلا دیا تھا، اس لیے اس کی ٹھیک بغل میں کھڑے سپاہی کی بھی نگاہ اس پر دیر سے پڑی۔ اس کو ہاتھ ہلاتا دیکھ کر کچھ پولیس افسر اور داروغہ تیزی سے اپنی اپنی آڑ سے نکلے اور جھکی ہوئی پوزیشن میں تقریباً دوڑتے ہوئے اس بارجے تک پہنچ گئے۔

وہاں پہنچ کر کچھ نے جھک کر چوکھٹ کا معائنہ کیا جہاں پہلی بار خون کا دھبا دکھائی دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی جگہ پر ہلکے دھندلے لال دھبے دکھائی پڑنے لگے۔ اتنا یقین ہو گیا کہ اسی گھر میں کوئی زخمی حالت میں لایا گیا ہے۔

ایک افسر نے دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا؛ اندر پوری طرح سناٹا تھا۔ اس نے تھوڑی

تیزی سے دروازہ کھٹکھٹایا؛ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس نے ایک داروغہ کو اشارہ کیا۔ داروغہ نے آگے بڑھ کر دروازہ تقریباً پیٹنا شروع کر دیا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے دروازے کو تین چار لاتیں لگائیں۔ لات لگنے سے دروازہ بُری طرح ہل گیا۔ پرانا دروازہ تھا، ٹوٹنے کی حالت میں آگیا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ اندر سے کچھ آواز سی آئی۔ لگا کوئی دروازے کی طرف آرہا ہے۔

سیڑھیوں پر کھڑے لوگ دونوں طرف کنارے سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ دو ایک نے اپنے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیے۔

دروازے کے پاس پہنچ کر قدموں کی آہٹ تھم گئی۔ صاف تھا کہ کوئی دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر دروازہ کھولنے نہ کھولنے کے پس و پیش میں تھا۔ پھر اندر سے چٹخنی گرنے کی آواز آئی اور ایک ماتمی خاموشی کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔

سامنے ایک مُرجھایا ہوا سپاٹ بوڑھا چہرہ تھا جسے دیکھ کر یہ اندازہ کر پانا بہت مشکل تھا کہ مکان میں کیا کچھ رونما ہو چکا ہو گا۔

"سب کے سب بہرے ہو گئے تھے کیا؟ ہم لوگ اتنی دیر سے برسات میں کھڑے بھیگ رہے ہیں اور دروازہ پیٹ رہے ہیں۔"

بولنے والے کے لفظوں کی جھنجھلاہٹ نے بوڑھے کو پوری طرح بے چین کر دیا۔ اس کی خاموشی غیر معمولی تھی۔ دروازہ کھلنے سے کچھ بوچھاریں اس کی پیشانی اور چہرے پر پڑیں اور اس کی سفید داڑھی میں آکر الجھ گئیں۔

"اندر کوئی زخمی چھپا ہے کیا؟"

"جی نہیں... کوئی نہیں ہے۔" اس کی آواز اتنی ٹھہری ہوئی تھی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، کسی نے اسے ڈپٹنے کی کوشش نہیں کی۔

"بڑے میاں، ہم زخمی کے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ تم اسے ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اسے اسپتال تک اپنی گاڑی میں پہنچا دیں گے۔ دوا دارو وقت سے ہو گیا تو بچ سکتا ہے۔ نہیں تو اب پتا نہیں کتنے دنوں تک کرفیو لگا رہے اور ہو سکتا ہے علاج نہ ہونے سے حالت اور خراب ہو جائے۔"

Scanned with CamScanner

"آپ مالک ہیں حضور، پورا گھر کھلا ہے، دیکھ سکتے ہیں۔ اندر کوئی نہیں ہے۔"

اس نے گھر کی طرف اشارہ کیا لیکن خود دروازے پر سے نہیں ہٹا۔ وہ پورا دروازہ گھیرے کھڑا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بوڑھے چہرے کی غیر جذباتیت نے بوندا باندی کے ساتھ مل کر پورے ماحول کو اس قدر پراسرار بنا دیا تھا کہ سب کچھ ایک طلسم سا لگ رہا تھا۔

سب کو شش و پنج میں دیکھ کر بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازہ بند کرنا شروع کر دیا۔ اس کے حرکت میں آتے ہی یہ طلسم اچانک ٹوٹ گیا اور ایک افسر نے جھپٹ کر اپنا بوٹ دونوں دروازوں کے بیچ پھنسا دیا اور بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

دروازے کے فوراً بعد ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے کے بعد آنگن تھا جس کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ برآمدے سے لگے ہوئے چاروں طرف پانچ چھ کمرے تھے جن کے دروازے آنگن کی طرف کھلتے تھے۔ برآمدے میں سات آٹھ عورتوں، دو تین جوان مردوں اور تین چار بچوں کا ایک ماتمی دستہ تھا جو ایک چارپائی کو گھیرے کھڑا تھا۔ زخمی ننگی چارپائی پر پڑا تھا۔ خون چارپائی کی رسیوں کو بھگوتا ہوا زمین پر پھیل گیا تھا۔ حالاں کہ خون سے چارپائی پر لیٹے آدمی کا پورا جسم نہایا سا تھا، پھر بھی غور سے دیکھنے پر صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے بائیں کندھے سے قریب ایک بتا نیچے سینے پر چپکا ہوا قمیص کا حصہ زیادہ سرخ اور گاڑھے خون سے سنا تھا۔ گولی وہیں لگی تھی۔

اپنی تجربہ کار آنکھیں چارپائی پر لیٹی صورت پر دوڑانے کے بعد ایک داروغہ نے اپنی بغل میں کھڑے افسر کے کان میں پھسپھساتے ہوئے کہا:

"مر گیا ہے حضور۔"

افسر نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ کسی نے سنا نہیں تھا۔ چارپائی کے ارد گرد کھڑی عورتیں اور مرد ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ چارپائی پر لیٹا آدمی صرف زخمی پڑا ہے، مرا نہیں ہے۔ خاص طور سے عورتیں یہی سوچ رہی تھیں، یا ہو سکتا ہے ان میں سے کچھ لوگوں کو احساس ہو چکا ہو کہ زخمی مر گیا ہے، پر وہ اس بات کو ماننا نہ چاہتے ہوں۔

عورتوں نے پھر سے رونا شروع کر دیا۔ زیادہ تر عورتیں پردہ کرنے کے لیے اپنے ماتھے پر کپڑا ڈالے ہوئے تھیں۔ وہ بھنچی آوازمیں دھیرے دھیرے بے نقط رو رہی تھیں۔ ان کے جسم

ہولے ہولے ہِل رہے تھے۔ ان کے رونے اور بدن کی تھرتھراہٹ میں ایک عجیب سی لَے تھی اور یہ لَے تبھی ٹوٹتی تھی، جب ان میں سے کوئی ایک اچانک دوسری سے تیز آواز میں رونے لگتی یا کسی کا جسم دوسری عورتوں سے تیز کانپنے لگتا۔

افسروں نے آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کی اور ان میں سے ایک نے اپنے ماتحت کو حکم دیا:

"زخمی کو چارپائی سمیت اٹھالو۔ کالونی میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور مل جائے گا۔"

پولیس کے چار پانچ لوگوں نے پھرتی سے چارپائی چاروں طرف سے پکڑ کر ہاتھوں پر اٹھالی۔ چارپائی کے چاروں طرف اب بھی عورتیں اور مرد کھڑے چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ صرف عورتوں کے رونے میں رکاوٹ پڑی۔

"آپ لوگ بھی مدد کیجیے۔ جتنی جلدی اسپتال پہنچیں گے، اتنا ہی اچھا ہو گا۔"

ارد گرد کھڑی عورتوں اور مردوں میں کچھ ہلچل ہوئی۔ دو تین مردوں نے چارپائی کو ہاتھ لگایا۔ چارپائی تھامے لوگ دھیرے دھیرے دالان سے باہری دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

ایک عورت کو اچانک کچھ یاد آیا۔ وہ دوڑ کر ایک موٹی چادر لے آئی اور اس نے لیٹے ہوئے آدمی کو چادر اُڑھا دی۔ باہر بارش تیز تھی۔ شروع میں جس بوڑھے نے دروازہ کھولا تھا اس نے برآمدے میں ایک کھونٹی پر ٹنگا چھاتا اتار لیا اور چارپائی پر لیٹے آدمی کے منھ پر آدھا چھاتا کھولا اور پھر بند کر دیا۔ وہ مطمئن ہو گیا کہ باہر بارش میں یہ چھاتا کام کرے گا۔

چارپائی کو لوگ اس طرح اٹھائے ہوئے تھے کہ وہ ان کی کمر تک ہی اٹھی تھی۔ دروازے پر آ کر لوگ رک گئے۔ چارپائی جوں کی توں دروازے سے نہیں نکل سکتی تھی۔ باہر نکالنے کے لیے اسے ٹیڑھا کرنا ضروری تھا۔ پائنتی کی طرف کے لوگوں نے دہلیز سے باہر نکل کر چارپائی پکڑی۔ چوڑائی میں بھی ایک طرف سے لوگ ہٹ گئے۔ صرف تین طرف کے لوگوں نے ایک طرف چارپائی ٹیڑھی کر کے اسے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ چارپائی بار بار پھنسی جا رہی تھی۔ بہت صبر اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ چارپائی دھیرے دھیرے آدھی سے زیادہ جھک گئی اور اس پر لیٹا شخص ڈھلان کی طرف لڑھکنے سا لگا۔ دو تین لوگوں نے جھپٹ کر اسے سنبھالا۔ پوری حرکت کو پیچھے سے منظم کرنے والے افسر نے جھنجھلا کر تیزی دکھانے والے کو ڈانٹا:

"سنبھال کے نکالو۔ ابھی لاش گر جاتی۔"

"لاش" کے لفظ نے ماحول کو پوری طرح مَتھ ڈالا۔ عورتیں سہم کر ٹھٹھک گئیں۔ بوڑھے نے ایک لمبی سسکاری لی اور اپنے ہاتھ کے چھاتے پر پورا بوجھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک وہ اتنا بوڑھا ہو گیا کہ اسے چھاتے کا سہارا لینے کی ضرورت پڑنے لگی۔

عورتوں نے پہلی بار مٹی کا ماتم شروع کیا۔ ان کی دبی آواز پوری بلندی سے اٹھنے گرنے لگی۔ کچھ نے اپنی چھاتی زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ بھلاوے کا ایک جھوٹا سا پردہ جسے انھوں نے اپنے چاروں طرف بن رکھا تھا، ایک دم سے تار تار ہو گیا۔ جس وقت زخمی وہاں لایا گیا ہو گا اُس وقت ضرور اس کے جسم میں حرکت رہی ہو گی۔ دھیرے دھیرے جسم مردہ ہو گیا ہو گا، پر وہ اسے ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ پہلی بار "لاش" کے لفظ نے ان کو اس حقیقت سے واقف کرایا تھا۔

ان عورتوں میں سے دو تین جھپٹیں اور باہیں پھیلائے مُردے کے اوپر گر پڑیں۔ تب تک چارپائی باہر نکل گئی تھی۔ اس کا آدھا حصہ بارجے کے نیچے تھا اور آدھا بارش کے نیچے۔ جو لوگ پاؤں کے پاس چارپائی پکڑے تھے وہ پوری طرح بارش کی زد میں تھے۔ عورتوں کے پچھاڑ کھا کر چارپائی پر گرنے کے کارن چارپائی زمین پر گر پڑی۔ باقی عورتیں بھی چارپائی کے چاروں طرف بیٹھ گئیں۔ اوپر بارش تھی، نیچے عورتوں کا ماتمی دستہ تھا اور ان سب سے شرابور ہوتی ہوئی بیچارے مردوں کی خاموشی اور اُداس بھیڑ تھی۔

مردوں میں سے کچھ لوگ آگے بڑھے۔ انھوں نے عورتوں کو آہستہ آہستہ چارپائی سے الگ کرنا شروع کیا۔ کچھ عورتیں ہٹائے جانے پر چھٹک چھٹک کر پھر سے لاش پر جا پڑتیں۔ مردوں نے ہلکی سختی سے انہیں ڈھکیل کر الگ کیا۔

پولیس والوں اور گھر کے مردوں میں سے کچھ نے پھر سے چارپائی اٹھائی۔ اس بار انھوں نے چارپائی اپنے کندھوں پر لاد لی۔ تیز رفتار سے وہ گلی کے باہر کی طرف بھاگے۔ مشکل سے دس قدم پر گلی بائیں طرف مڑتی تھی۔ پہلے چارپائی عورتوں کی نظر سے اوجھل ہوئی، پھر اس کے پیچھے چلنے والا قافلہ بھی دھیرے دھیرے غائب ہو گیا۔ صرف ماتم کرنے والی عورتوں کی آوازیں ان کا پیچھا کرتی رہیں۔ دھیرے دھیرے وہ آوازوں کی حد کے باہر چلے گئے۔ اگر بیچ میں اونچے اونچے مکانوں کی دیواریں نہ ہوتیں اور وہ دیکھ سکتے ہوتے تو دیکھتے کہ عورتیں گھر کے اندر چلی گئی ہیں اور ایک بوڑھا

آدمی بارش کی ہلکی بوچھاروں میں چھاتے کی ٹیک لگائے دروازے کے بیچ کھڑا ہے۔ اسے دروازہ بند کرنا تھا، لیکن وہ پتا نہیں بھول گیا تھا یا شاید اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اب دروازہ بند کرنے کا کوئی حاصل نہیں رہ گیا ہے اس لیے وہ چپ چاپ بے چین خاموشی کے ساتھ کھڑا تھا۔

۲

کرفیو لگنے کے ساتھ ہی یکبارگی بہت ساری چیزیں اپنے آپ ہی ہو گئیں — مثلاً شہر کا ایک حصہ پاکستان بن گیا اور اس کے رہنے والے پاکستانی۔ یہ حصہ جانسن گنج سے اٹالہ اور خلد آباد سے مٹھی گنج کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ ہر سال دو ایک بار ایسی نوبت ضرور آتی تھی جب شہر کے باقی حصوں کے لوگ اس حصے کے لوگوں کو پاکستانی قرار دیتے تھے۔ پچھلے کئی سالوں سے جب کبھی شہر میں کرفیو لگتا تو اس کا مطلب صرف اس علاقے میں کرفیو سے ہوتا۔ اس کے پرے جو شہر تھا وہ ان حادثوں سے بالکل بے خبر اپنے میں مست ڈوبا رہتا۔ جنکشن سے سول لائنز کی طرف اُترنے والوں کو یہ احساس بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ چوک کی طرف کتنا خوفناک سنّاٹا پھیلا ہوا ہے۔ کٹرا، کیٹر گنج یا سول لائنز کے بازاروں میں زندگی اپنی چہل پہل سے بھرپور رہتی اور چوک، مٹھی گنج میں لوگ دن کے اُن چند گھنٹوں کا انتظار کرتے جب کرفیو میں چھوٹ ہوتی اور وہ بھیڑوں کی طرح بھربھرا کر سڑکوں پر نکل کر دوزخ سے نجات محسوس کرتے۔

اس بار بھی یہی ہوا۔ شہر کے پاکستانی حصے میں کرفیو لگ گیا۔ کچھ سڑکیں ایسی تھیں جو ہندو اور مسلم آبادی کے بیچ سے ہو کر گزرتی تھیں۔ ان کے مسلم آبادی والے حصے میں کرفیو لگ گیا اور وہاں زندگی پوری طرح سے تھم گئی، جب کہ ہندو آبادی والے حصوں میں زندگی کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی۔

سعیدہ کے لیے یہ پہلا کرفیو تھا۔ پچھلے جون میں جب کرفیو لگا تھا تو وہ گاؤں گئی ہوئی تھی۔ جس وقت کرفیو لگا وہ چوک میں گھنٹا گھر کے پاس ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر کی دکان میں اپنی دوسری لڑکی کو دوا دلانے لے گئی تھی۔ اس کی بڑی لڑکی گھر پر اپنی دادی کے پاس رہ گئی تھی۔ سعیدہ پہلے

Scanned with CamScanner

ہی دن سے اپنی ساس کی منت کر رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کی دکان تک چلی چلے، لیکن ایک تو بیڑی کا دھندا ایسا تھا کہ اس میں دو تین گھنٹے کی بربادی سے دوسرے جون کی روٹی خطرے میں پڑ جاتی تھی اور شاید اس لیے بھی کہ اس کے تابڑ توڑ دو دو لڑکیاں ہو گئی تھیں اور اس کی ساس کو اس کی لڑکیوں سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ وہ آج تک ٹال مٹول کرتی رہی۔ اس کی صلاح پر سعیدہ لڑکی کو گھریلو دوائیں دیتی رہی لیکن آج جب سویرے سے پوری طرح پست دکھائی دینے لگی تب اس نے اپنی پڑوسن سیف النسا کو بمشکل تمام اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ گھنٹا گھر تک چلے۔ بدلے میں اس نے سیف النسا کے ساتھ چوڑی کی دکان تک چلنے کا وعدہ کیا جہاں سے سیف النسا چوڑیاں خریدنے کے لیے کافی دنوں سے سوچ رہی تھی۔

دوا لے کر وہ ابھی دکان کے باہر نکلی ہی تھیں کہ کرفیو لگ گیا۔ دراصل کرفیو لگنے کی کوئی رسمی کارروائی نہیں ہوئی لیکن سیف النسا کے تجربے اسے نے بتا دیا کہ کرفیو لگ گیا ہے۔ پورے چوک میں عجیب افراتفری تھی۔ دوکانوں کے شٹر اتنی تیزی سے گر رہے تھے کہ ان کی ملی جلی آواز پورے ماحول میں خوف کا زبردست احساس طاری کر رہی تھی۔ جس طرح بچے ایک قطار میں اینٹیں کھڑی کر کے انھیں ایک سرے سے دھکیلتے ہیں تو لہروں کی طرح اینٹیں ایک کے اوپر ایک گرتی چلی جاتی ہیں، اسی طرح بھیڑ کے ریلے نخاس کی طرف سے گھنٹا گھر کی طرف چلے آ رہے تھے۔

"یا خدا... رحم کر!" سیف النسا کے منھ سے بےساختہ نکلا اور اس نے جھپٹ کر سعیدہ کی کلائی تھام لی۔ جب تک اچانک منھ کھولے سعیدہ کچھ سمجھتی تب تک وہ اسے گھسیٹتی ہوئی بازار میں قریب پچیس تیس گز آگے بڑھ گئی۔

"کا ہوا بہن؟"

"کرفو... کرفو... یا خدا، کسی طرح گھر پہنچ جائیں۔"

ایک ایک قدم آگے بڑھنا مشکل تھا۔ مخالف سمت سے لہروں کی طرح جمِ غفیر پھٹا پڑ رہا تھا۔ دکان دار بدحواس سے اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ سائیکلیں، رکشے، گاڑیاں اور اِکّے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنے کے چکر میں اس قدر ریل پیل مچائے ہوئے تھے کہ عام دنوں کے لیے مناسب چوڑی سڑک بھی کسی پتلی گلی کی طرح ہو گئی تھی۔

سیف النسا سعیدہ کو گھسیٹتے ہوئے کسی طرح پھل منڈی تک پہنچ پائی۔ پھل منڈی کے

Scanned with CamScanner

دہانے پر روز ریلا لگانے والے ٹھیلے غائب تھے۔ ٹھیلے والے بڑی جلدی میں گلیوں یا گھنٹا گھر کی طرف بھاگ گئے تھے۔ یہ پہلی ہی نظر میں عیاں ہو جاتا تھا کیوں کہ چاروں طرف آم، سیب اور سنترے بکھرے پڑے تھے جنھیں بدحواس لوگ کچلتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ سیف النسا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ سعیدہ کو لے کر پھل منڈی ہی میں گھس گئی اور اسے پار کرتی ہوئی میسر گنج کی بھول بھلیوں میں بھٹک گئی۔

میسر گنج کا جسم کا بیوپار پوری طرح ٹھنڈا پڑا تھا۔ رنڈیوں نے اپنے دروازے بند کر لیے تھے اور روز جھنڈ کے جھنڈ مٹر گشت کرنے والے گاہکوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ دو دو چار چار گھروں کے بعد اوپری منزل کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی کوئی رنڈی، ایک عام منظر تھا۔ ان رنڈیوں کی آنکھوں میں بے چارگی اور غصہ صاف دکھائی پڑتا تھا کیوں کہ انھیں پچھلے کئی دنگوں کا تجربہ تھا۔ ہر بار کرفیو لگنے پر دھیرے دھیرے وہ فاقے کے قریب پہنچ جاتی تھیں اور زیادہ تر کوٹھوں پر تو چار چھ دن بعد ہی سے خالی پانی پینے کی نوبت آجاتی تھی۔

سیف النسا یہاں کے ماحول سے پہلے سے واقف تھی۔ دو بار وہ اپنے شوہر کے ساتھ خریداری کرنے کے لیے ان گلیوں کے پاس کی دکانوں پر گئی تھی، اور باہر سے جھانک کر جتنی دور دیکھا جا سکتا تھا اتنی دور تک گلی کا جائزہ اس نے لیا تھا۔ سعیدہ کے لیے آج پہلا موقع تھا جب وہ ان گلیوں کو دیکھ رہی تھی، اس لیے اسے گنہگاری، سنسنی اور شرم کی ملی جلی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ سیف النسا کے بنا بتائے بھی وہ جان گئی تھی کہ وہ کہاں آ گئی ہے۔ سیف النسا اس کی کلائی پکڑے کھینچتی چلی جا رہی تھی۔ سناٹے اور خوف کی وجہ سے گلیاں اسے عجیب طرح کے اسرار سے بھری لگ رہی تھیں۔ اُنھیں کی طرح گھبرائے ہوئے اکادکا لوگ پاس سے گزرتے ہوئے اس رنگ کو زیادہ گہرا بناتے جا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ان گلیوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے وہ گڑمنڈی کے پاس واپس جی ٹی روڈ پر نکلیں۔

اس وقت تک جی ٹی روڈ کافی حد تک خالی ہو گئی تھی۔ پولیس کی ایک جیپ بڑی تیزی سے ان کے پاس سے گزری۔ اس میں بیٹھا ہوا ایک افسر ہیجان زدہ آواز میں کرفیو لگائے جانے کا اعلان کر رہا تھا اور لوگوں سے فوراً اپنے اپنے گھروں میں لوٹ جانے کی اپیل کر رہا تھا۔

کرفیو کا اعلان سعیدہ کے لیے ایک خوفناک تجربہ تھا۔ اپنی بچی کو چھاتی سے چپکائے ہوئے وہ

Scanned with CamScanner

پوری طرح سیف النسا کی مرضی پر کھنچی چلی جا رہی تھی۔ سیف النسا زیادہ تجربہ کار اور بہادر تھی، اس لیے اپنے کو اس کے اوپر چھوڑ کر وہ خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ دراصل سعیدہ کو اس شہر میں آ کر رہتے ہوئے صرف چار سال ہوئے تھے اور ابھی تک اس شہر میں وہ خود کو بالکل اجنبی محسوس کرتی تھی۔ اس کا گھر پورہ مفتی کے پاس تھا اور شادی کے چار سال بعد بھی اس کا من وہیں کے لیے پھڑکتا تھا۔ اس کا شوہر اپنے پورے خاندان کے ساتھ بیڑی بناتا تھا اور شادی کے بعد شروع کے کچھ مہینوں کو چھوڑ کر، جب وہ اس کے ساتھ سنیما، بازار وغیرہ جایا کرتا تھا، اسے اکثر سودا سلف لینے لانے کے لیے ساتھی کی ضرورت پڑتی تھی اور ایسے وقت سیف النسا ہی اس کے کام آتی تھی۔ سیف النسا کا شوہر جیپ فیکٹری میں چپراسی تھا اس لیے اسے ہر مہینے بندھی بندھائی رقم ملتی تھی۔ وہ بیڑی بنانے کا کام کرتی ضرور تھی لیکن شوقیہ ــــ صرف فاضل آمدنی کے لیے۔ سعیدہ کی حالت دوسری تھی؛ بیڑی اس کے خاندان کا واحد ذریعۂ معاش تھا۔ اس کا پورا خاندان اوسطاً چودہ گھنٹے روز محنت کرتا تھا تب کہیں جا کر دو جون کی روٹی کا انتظام ہو پاتا تھا۔ شادی کے دو چار ہی مہینوں میں اس نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ اس کے اور اس کے شوہر کے لیے سنیما دیکھنے یا بازار گھومنے سے زیادہ ضروری ہے کہ گھر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اندھیری سیلن بھری تنگ کوٹھری میں کمر جھکائے جھکائے بیڑی کے بنڈل باندھتے رہیں اور بچوں کا کم سے کم پیٹ بھرنے کا سکون لیے، رات میں سو سکیں۔

حالاں کہ شہر کی ٹیڑھی میڑھی نامعلوم گلیوں میں سیف النسا کا ہاتھ تھامے تھامے گزرتے ہوئے سعیدہ کو لگ رہا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا، لیکن آخر میں اسے اپنی گلی مل ہی گئی۔ اس کی گلی بھی ویران تھی، پھر بھی اس گلی میں پہنچتے ہی اسے ایک قسم کا سکون محسوس ہونے لگا۔

گلی کے مکان بُری طرح بند تھے۔ دروازے کھڑکیاں سبھی پوری طرح بھڑے ہوئے تھے۔ اتنا خوفناک سناٹا اور اتنی خاموشی سعیدہ نے آج تک اپنی گلی میں محسوس نہیں کی تھی۔ اسے لگا کہ ویران گلی میں وہ اپنا گھر بھول جائے گی۔ ان کے گلی میں پہنچنے کے بعد دو ایک کھڑکیاں ہلکے سے کھڑکیں۔ ایسا لگا جیسے کسی نے جھانک کر ایک دم سے کھڑکی کے پلّے بند کر دیے۔ کھڑکیوں کے اس طرح کھلنے بند ہونے سے سعیدہ کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سیف النسا کا گھر پہلے پڑتا تھا اس سے کچھ اور آگے سعیدہ کا گھر تھا۔

Scanned with CamScanner

سیف النسا کے ہاتھ چھڑا کر اپنے گھر میں گھسنے کے بعد اس کے اور اپنے گھر کے بیچ کے تیس چالیس گھر کے فاصلے کو پار کرنے میں سعیدہ کو کئی یگ لگ گئے۔ اپنی بیٹی کو سینے سے چپکائے جب وہ اپنے گھر کے سامنے والی نالی کو پھاندتے ہوئے دروازے پر پہنچی تو خوف اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے ہلکے سے دروازے پر دستک دینی چاہی لیکن دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی اس نے پایا کہ وہ بُری طرح سے دروازہ پیٹ رہی ہے۔

سب سے پہلے اندر سے اس کی ساس کے کھانسنے کی آواز آئی، پھر کوئی مردانے قدموں کی آہٹ آ کر دروازے پر ٹھٹھک گئی۔ آہٹ سے اس نے پہچانا، یہ اس کا شوہر تھا۔ اچانک اس کے جی میں آیا کہ وہ رونے لگے۔ گھر کے پاس پہنچتے ہی کوئی غیر مرئی احساس تھا جو اسے رونے پر مجبور کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس کے شوہر نے دروازہ کھولا وہ سچ مچ رونے لگی — پہلے دھیرے دھیرے، پھر ہرک ہرک کر۔

سعیدہ کی ساس نے آگے بڑھ کر اس کی بیٹی کو گود میں لے لیا۔ بیٹی صبح سے زیادہ پست نظر آ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے ساس بھی رونے لگی۔ پہلی بار سعیدہ کو اپنی ساس سے ممتا محسوس ہوئی اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

"کچھ نہیں ہوا... سب ٹھیک ہو جائے گا... اللہ سب ٹھیک کرے گا..." ساس کے کہنے پر سعیدہ کو لگا کہ سچ مچ کچھ نہیں ہوا اور سچ مچ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے بھی کیا ہوا تھا اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ تو بھاگ دوڑ اور سناٹے کے خوف سے گزرتی ہوئی یہاں تک آ گئی تھی۔ راستے میں سیف النسا کے منہ سے اسے صرف اتنا پتا چلا کہ کرفیو نام کی کوئی چیز لگ گئی ہے جس میں گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت ہے۔ اگلے کچھ دنوں میں یہ بات اسے زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آ سکی کہ گھر سے باہر نہ نکلنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

۳

کرفیو شروع میں تو ہر جگہ لگا لیکن جلد ہی اُن حصوں سے اس کا اثر کم ہونے لگا جو پاکستانی

Scanned with CamScanner

نہیں تھے۔ ان حصوں میں ہندو رہتے تھے، اور ہندو ہونے کے ناتے ظاہر تھا کہ اس دیش سے سچا پریم کرنے والے وہی تھے۔ اس لیے شروع میں تو لوگ ضرور کچھ گھنٹوں کے لیے اندر قید ہوئے لیکن جلد ہی وہ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھول کھول کر جھانکنے لگے۔ بچوں نے ماں باپ کی آنکھیں بچائیں اور چبوتروں پر آ کر بیٹھ گئے۔ بیچ بیچ میں ماں باپ کان پکڑ کر گھسیٹتے چلاتے بچوں کو گھر کے اندر پٹک دیتے لیکن بچے پھر چھوٹ کر اندر سے باہر بھاگ آتے۔

بیچ بیچ میں دو دو چار چار کی تعداد میں پولیس والے آتے اور بچوں کو ہڑکاتے ہوئے چبوتروں پر ڈنڈے پٹکتے چلے جاتے۔ بچوں کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ وہ گلیوں میں گلی ڈنڈے سے لے کر کرکٹ تک تمام کھیل کھیلنے لگے۔ کچھ عورتیں بھی باہر دروازوں پر نکل کر بتیانے لگیں۔ ان کی چِنتا کا خاص موضوع یہ تھا کہ بچے کھیلتے ہوئے گلی سے باہر سڑکوں پر نہ چلے جائیں اور دفتروں، دکانوں یا کارخانوں میں گئے اُن کے مرد صحیح سلامت گھر لوٹ آئیں۔ زیادہ تر گھر خاندان کے کمانے والے ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ کچھ بچے بھی اسکولوں میں پھنس گئے تھے۔

جیسے جیسے دیر ہوتی جا رہی تھی، عورتوں کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ گلی کافی گھنے مکانوں کی بستی تھی لیکن بستی کے بیچ میں ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا خالی پڑا تھا۔ اسے کسی نے برسوں پہلے خرید لیا تھا لیکن ابھی تک اس پر کوئی تعمیر نہیں کی گئی تھی۔ برسوں سے یہ محلے کا کوڑاخانہ بنا ہوا تھا اور برسوں سے محلے کی عورتیں مشترکہ مصیبت یا خوشی کے موقعوں پر وہاں جمع ہو کر شور شرابا کرتی چلی آ رہی تھیں۔ ڈھیرے ڈھیرے کئی عورتیں وہاں اکٹھی ہو گئیں۔ جن کے مرد اور بچے واپس آ گئے تھے انھوں نے اپنے سبھی لوگوں کو گھروں کے اندر کر لیا اور کھڑکیوں چھجوں سے ساری کارروائی دیکھنے لگیں، اور جن کے گھر کا کوئی فرد باہر رہ گیا تھا انھوں نے باہر کھلی جگہ پر اپنے کو اکٹھا کر لیا اور باتیں کرنے لگیں۔ ان کی آوازوں میں جوش اور دکھ بھرا ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے اندھیرا گلی میں پھیلنے لگا تھا اور باہر لگتا تھا کہ کرفیو پوری سختی کے ساتھ لگ گیا ہے، اس لیے باہر سے گلی میں آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ اکادکا مردوں کے علاوہ چار پانچ بچے ہی اندر آ پائے تھے۔ ان مردوں اور بچوں کے ساتھ کچھ عورتیں گھروں کے اندر چلی گئیں۔ آنے والے اپنے ساتھ افواہوں کا پلندا لے کر آئے تھے۔ ان کے پاس طرح طرح کی خبریں تھیں — مثلاً دسیوں ہندوؤں کی لاشیں نالیوں میں پڑی ہیں، یا پولیس نے لاشیں کئی ٹرکوں میں لاد کر جمنا

میں بہادی ہیں۔

یہ گلی بھی قریب قریب پڑوس کی گلی ہی کی طرح تھی جس میں مسلمان رہتے تھے — اسی کی طرح گندی، مفلس اور بدبودار۔ گھروں کے پاخانوں کی گندگی بہہ بہہ کر گلی کی نالیوں میں پہنچ رہی تھی اور، اگرچہ گلی کے روزمرہ کے باشندوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، پھر بھی باہر سے پہلی بار گلی میں آنے پر یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی بنا ناک پر رومال رکھے گلی میں داخل ہو جائے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ ہندوؤں کی گلی تھی، اس لیے کرفیو نے لوگوں کو گھروں کے اندر بند نہیں کیا تھا۔ ان کے صرف گلی کے باہر نکلنے پر پابندی لگی تھی۔

گلی میں دیوی لالہ کا داخلہ ایک تفریحی رلیف کی طرح تھا۔

دیوی لالہ روز کی طرح صبح گلی سے نکل گئے تھے اور روز ہی کی طرح گرتے پڑتے گلی میں لوٹ رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ روز نو دس بجے رات کے بعد لوٹتے تھے اور آج دو تین گھنٹے پہلے لوٹ رہے تھے۔ روز گلی کے زیادہ تر لوگ جس وقت کھانا کھا رہے ہوتے ہیں، اسی وقت دیوی لالہ کی شراب میں ڈوبی ہوئی کڑک دار آواز ہوا میں تیرتی ہے۔ آج دیوی لالہ کچھ پہلے آ گئے تھے۔ روز کی طرح نہ تو وہ چہک رہے تھے اور نہ ہی شراب پینے سے پیدا ہونے والی خوداعتمادی ان کے اندر تھی۔ وہ کچھ پریشان سے تھے۔ ایک تو انھیں شراب نہیں ملی تھی اور دوسرے ان کو راستے میں کئی جگہ گرتے پڑتے آنا پڑا تھا۔ اس سے ان کے جسم پر جگہ جگہ کھرونچیں آ گئی تھیں اور ان کے پاجامے کے پائنچے نالیوں کے پانی اور گندگی سے شرابور تھے۔

دیوی لالہ پیشہ ور خون بیچنے والوں میں سے تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن سروپ رانی اسپتال میں جا کر اپنا خون بیچتے تھے اور چالیس پچاس روپے لے کر لوٹ آتے تھے۔ اسی آمدنی کے بل پر وہ شام کو ٹھرا چڑھا کر لوٹتے تھے۔ آج انھوں نے خون ضرور بیچا پر پی نہیں پائے؛ اس سے پہلے ہی کرفیو لگ گیا۔ وہ تب تک کرفیو والے علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔ اگر کہیں انھیں پہلے پتا چل جاتا تو وہ شراب پی کر ہی کرفیو میں گھستے۔ ایک بار گھس جانے کے بعد انھوں نے باہر نکلنے کی کوشش بھی کی، لیکن شٹروں کے گرنے، لوگوں کے بدحواس بھاگنے دوڑنے اور پولیس کی لاٹھیوں نے ایک عجیب سا چکرویو بنا دیا تھا۔ اس چکرویو میں وہ صرف آگے کو بھاگ رہے تھے اور کافی دیر بعد جب انھیں سنبھلنے کا ہوش آیا تو وہ اپنے گھر کی گلی کے دہانے پر تھے۔

دیوی لال کو دیکھتے ہی گلی کے کچھ بچے اکٹھے ہو گئے اور روز کا کورس شروع ہو گیا۔

دیوی کے دو ٹوپی
بکری کے دو کان
دیوی لالہ بگنے پہنچے
ان کو پکڑ لیا شیطان

عورتوں نے اس پریشانی کے ماحول میں بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ دو ایک نے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرانا چاہا۔ پتا نہیں یہ ماحول میں چھائی دہشت اور اداسی کا اثر تھا یا دیوی لالہ کی بے کیفی کا کہ آج بچے چپ ہو گئے۔ روز کی طرح انھوں نے روکنے پر اور زیادہ اچھل اچھل کر دیوی لالہ کی مٹی پلید نہیں کی۔ شراب نہ پینے کی وجہ سے دیوی لالہ کو اپنا بدن ٹوٹتا سا محسوس ہو رہا تھا اور انھیں بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"کیوں لالہ، دنگے میں بہت لوگ مرے کا؟"

سوال دیوی لالہ سے پوچھا گیا تھا۔ وہ اکیلے آدمی تھے جو کرفیو لگنے کے بعد کافی دیر تک کرفیوزدہ علاقے میں گھومنے کے بعد محلّے میں پہنچے تھے، اس لیے منفرد ہونے کے احساس میں گم تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں سکیڑیں اور پورے یقین سے بولنے کی کوشش کی۔ اگرچہ شراب نہ پینے سے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی، پھر بھی انھوں نے سنبھلنے کی پوری کوشش کی۔

"ارے چاچی، شہر میں لہاش ہی لہاش ہیں۔ دوئی ٹرک میں لہاش جاتی تو ہم خود دیکھا... پولیس والے جمنا میں بہانے لے جا رہے تھے۔ مُسلے مار چھرا چاکو چمکاتے گھوم رہے ہیں۔ ہندون بیچاروں کا تو کوئی رکھوالا نہیں ہے۔"

"ہے بھگوان، جو لوگ ابھی گھر نہیں لوٹے ان کا کیا ہو گا؟"

جن عورتوں کے شوہر اور بچے گھروں کو نہیں لوٹے تھے ان کے چہرے اُتر گئے اور کچھ نے تو ہولے ہولے رونا سسکنا شروع کر دیا۔ جن کے گھر کے لوگ صحیح سلامت لوٹ آئے تھے انھوں نے چٹخارے لینے شروع کر دیے۔

Scanned with CamScanner

"تو لالہ، کیا مسلمان پولیس کے رہتے چاقو چھرا لیے گھوم رہے ہیں؟"

"گھوم رہے ہیں؟ ارے گھونپ رہے ہیں! کئی تو ہم اپنی سامنے مارتے دیکھے۔ ہندو بیچارے پٹ پٹ گر رہے ہیں۔ اب ان مُسلوں کو جان لینے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ پولیس ان کا کیا بگاڑ لے گی۔ کتنی لہاشیں تو ہمارے پیر کے نیچے آتے آتے بچیں۔"

دیوی لالہ ہانکے جا رہے تھے۔ شراب نہ پیے رہنے سے تھوڑی خوداعتمادی ضرور بیچ بیچ میں گڑبڑا جاتی لیکن لوگوں کے چہرے پر تیرنے والا تجسس اور دہشت انھیں پھر سے بولنے کا حوصلہ دے دیتی۔ وہ بول رہے تھے اور سوالیہ پریشان چہرے انھیں سُن رہے تھے۔ یہ سلسلہ تبھی ٹوٹتا جب باہر سے گرتا پڑتا کوئی اور فرد گلی میں داخل ہو جاتا اور سننے والوں کی بھیڑ اسے گھیر لیتی۔ کرفیو لگنے کے بعد تین چار گھنٹے چوں کہ جم کر بارش ہوئی تھی اس لیے آنے والا بری طرح بارش میں نہایا ہوتا اور پاجامے یا پینٹ کے نیچے کا پائنچا گلی کی کیچڑ سے لت پت ہوتا۔ ہر آنے والا آتا اور کھوجی بھیڑ کے پاس کھڑے ہو کر کچھ نہ کچھ نئی بات بتاتا۔ جب تک اس کی بیوی یا بچے اسے گھسیٹ نہ لے جاتے تب تک وہ لوگوں کے چہرے پر کھنچی کشمکش اور بے یقینی کی لکیروں کا مزہ لیتا رہتا۔

پولیس اور پی اے سی کے سات آٹھ جوان ڈنڈے زمین پر پھٹکارتے گلی کے دہانے سے اندر گھسے۔ ان کے گھستے ہی لوگ ہڑبڑا کر بھاگے۔ گرتے پڑتے لوگوں کو بھاگتے دیکھ کر پولیس والوں میں سے ایک دو کو مسخری سوجھی۔ انھوں نے اَور زور سے لاٹھیاں زمین پر پٹکیں اور ہوا میں گالیاں اچھالتے ہوئے دوڑنے کا ناٹک کیا۔ لوگ اَور زور سے بھاگے اور گلی کے کیچڑ اور نالیوں کے پاخانے میں پیر سانتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ جن کے دروازے بند تھے انھوں نے انھیں بری طرح پیٹ ڈالا۔

گھروں میں بند ہو کر بچوں نے کھڑکیوں سے اپنی ناک سٹا دی اور آنکھیں باہر جمع پولیس والوں پر مرکوز کر لیں۔ عورتیں کواڑوں کی درازوں سے چپک گئیں۔ مرد اپنے مرد ہونے کے احساس سے دبے اپنی تشویش کی نمائش نہیں کر سکتے تھے اس لیے بند، اُمس بھرے کمروں میں پنکھے کے نیچے بیٹھے اپنے خارش زدہ بدن کھجلاتے رہے۔ بارش بند ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور ایک بار پھر سے اُمس پورے ماحول پر طاری ہو گئی تھی۔

پولیس والے باہر ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اس بھگدڑ میں دیوی لالہ بھی ڈر کر ایک

کوڑے کے ڈھیر کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ دن میں بھاگتے وقت دوچار لاٹھیاں ان کے پیر اور پیٹھ پر پڑی تھیں، اس لیے پولیس والوں کو دیکھ کر وہ ڈر گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ بد بودار کوڑے کو اپنی ناک پر جھیلتے رہے، پھر ہمت بٹور کر انھوں نے اُچک کر دیکھا۔ پولیس والوں میں ایک مقامی تھانے کا سپاہی بھی تھا جسے وہ مصرا کے نام سے جانتے تھے اور جس کے ساتھ بیٹھ کر انھوں نے کئی بار شراب پی تھی۔ مصرا کو دیکھتے ہی ان کی ہمت لوٹ آئی اور وہ کوڑے کے ڈھیر کو تقریباً ڈھکیلتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

"جے ہند پنڈت جی! ہم تو بے کار ڈر رہے تھے۔"

"کون؟ دیوی لالہ؟ جے ہند جے ہند۔ کھو کہاں چھپے ہو؟ کیسا محلّہ ہے بھائی، سسُر پانی کو بھی ترس گئے۔ آج دوپہر سے ایک بوند پانی نہیں گیا حلق میں۔ کچھ چائے وائے کا انتظام کرو بھائی۔"

دیوی لالہ جھپٹ کر ایک مکان کے بند دروازے پر پہنچے اور لگے دروازہ پیٹنے۔

"کون ہے؟ کیا ہے؟ گھر میں کوئی مردمانس نہیں ہے،" اندر سے زنانی آواز آئی۔

"ہے کیسے نہیں؟ ارے ہم خود دیکھا رام سکھ کمپوزیٹر کو اندر آتے۔ بھائی ہم دیوی لالہ ہیں۔ باہر داروغہ جی کھڑے ہیں۔ کھولو دروازہ کھولو، پانی چاہیے۔"

رام سکھ کمپوزیٹر نے تو نہیں لیکن دیوی لالہ کی آواز سے مطمئن ہو کر اس کی بیوی نے آدھا دروازہ کھولا۔

باہر لاٹھیوں اور بندوقوں کے ساتھ پولیس ان کے ساتھ تھی، اس لیے دیوی لالہ کافی جوش میں تھے۔ انھوں نے کڑک دار آواز میں ایک بار پھر سے رام سکھ کو باہر آنے کو للکارا۔ رام سکھ کی پتنی نے ایک بار پھر ممیاتے ہوئے بتایا کہ رام سکھ گھر میں نہیں ہیں، پر دیوی لالہ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر میں بات اس پر ختم ہوئی کہ رام سکھ کی گھر والی گرما گرم چائے بنا کر سب کو پلائے۔

چائے بن کر جب تک باہر آئی تب تک کچھ گھروں کی کھڑکیوں کے پلّے آدھے پورے کھل چکے تھے۔ کچھ بچوں نے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں نے انھیں ڈانٹ کر اندر کر دیا۔ پر جب چائے باہر آنے لگی تو دیوی لالہ نے رام سکھ کے دو لڑکوں کو مدد کے لیے باہر بلا لیا۔ ان کی دیکھا دیکھی بغل کے دو لڑکے اور نکل آئے۔ سپاہیوں نے بے من سے انھیں ڈانٹا اور پھر چائے پینے

میں لگ گئے۔ لڑکے بھی ڈھیٹوں کی طرح پہلے اپنے دروازوں سے چپکے رہے اور پھر دھیرے دھیرے گلی میں اتر آئے۔ تھوڑی دیر میں بچوں کی اچھی خاصی بھیڑ پولیس والوں کے ارد گرد اکٹھی ہو گئی۔ وہ للچائی آنکھوں سے ان کے ہتھیار دیکھتے رہے اور ان ہتھیاروں کے نام ایک دوسرے کو بتاتے رہے۔ بیچ بیچ میں پولیس والوں میں سے کوئی انھیں جھڑک دیتا یا اپنی لاٹھی زمین پر پٹک دیتا۔ بچے بھاگتے اور تھوڑی دور پر پھر اکٹھے ہو جاتے۔ وہ کورس میں گاتے:

ہندو پولیس بھائی بھائی
کٹوا قوم کہاں سے آئی

پولیس والے ہنستے اور گالی والی دے کر پھر چائے پینے میں لگ جاتے۔ دیوی لالہ ان کے کھانے کا انتظام کرنے لگے۔ کرفیو ہر دوسرے تیسرے سال لگتا تھا۔ پولیس والے ہر بار اسی گلی میں یا بغل کی کسی گلی میں کھانا کھاتے۔ یہاں کھانا کھا کر محلّے والوں سے کچھ ہنسی مذاق کرتے اور پھر پاکستانی گلیوں میں کرفیو لگانے چلے جاتے۔

گلی میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو اکیلے اس پوری ٹکڑی کے لیے کھانے کا معقول انتظام کر سکتا۔ دیوی لالہ ایک ایک گھر کا حال جانتے تھے، اس لیے انھوں نے کسی گھر پوری چھنوائی، کہیں آلو کی بھجیا تلی گئی اور دو ایک گھروں سے ڈانٹ کر اچار اور چٹنی اکٹھا کی گئی۔

پولیس والے جب تک کھانے بیٹھے تب تک کافی لوگ ہمت بٹور کر ان کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ ہندو لوگ تھے، اس لیے فطرتاً ملک کی سب سے زیادہ فکر انھیں ہی تھی۔ انھوں نے پولیس ٹکڑی میں اپنے جاننے والوں کو ڈھونڈا، یا نئے سرے سے تعارف حاصل کر لیا، اور انھیں پُرجوش لہجے میں خفیہ طرز کی خبریں دینے لگے۔ کسی کو جانکاری تھی کہ پاکستانی گلی کے فلاں گھر میں ٹرانسمیٹر لگا ہوا ہے جس سے ایک ایک پل کی خبر بھیجی جا رہی ہے، اسی لیے تو جو دنگا دوپہر بعد ہوا اس کی خبر شام کو بی بی سی سے آ گئی۔ جو ذاتِ شریف ٹرانسمیٹر والی جانکاری دے رہے تھے ان سے ایک آدھ حاسد پڑوسیوں نے پوچھا بھی کہ انھوں نے بی بی سی کب سنا، لیکن باقی سب نے مان لیا کہ بی بی سی نے ضرور یہ خبر دی ہوگی۔ کچھ لوگوں نے پاکستانی گلی کے کچھ مکان بتائے جن میں ان کے مطابق ہتھیاروں کے ذخیرے تھے۔ ان ہتھیاروں کی تفصیل لوگوں نے اپنی اپنی

عام معلومات کے مطابق الگ الگ دی- زیادہ تر لوگوں نے سنیما اور اخباروں میں پستولوں اور بموں کے بارے میں پڑھا تھا، اس لیے اس کے مطابق ان میں پستولوں اور بموں کو اکٹھا کیا گیا تھا- کچھ لوگوں نے اسٹین گن بھی چھپائے جانے کی خبر دی- پولیس والوں نے خبریں اکٹھی کیں- وہ ہر بار دنگوں میں پاکستانیوں کو سبق سکھاتے تھے- اس بار بھی یہ خبریں ان کے کام آنے والی تھیں-

پولیس والوں نے کھانا کھایا اور نالیوں پر کھڑے ہو کر ہاتھ منہ دھویا- وہ تھوڑی دیر تک دانت وانت کھودتے رہے، پھر بغل والی گلی میں پاکستانیوں کو سبق سکھانے چلے گئے-

رات کافی ڈھل چکی تھی- عام طور سے اس وقت تک یہ گلی تھک تھکا کر سو جاتی تھی، لیکن آج گلی میں گھروں، سیڑھیوں اور چبوتروں پر لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اکٹھے تھے- فرق صرف اتنا تھا کہ گلی کی نالیوں پر چارپائیاں نہیں پڑی تھیں- باوجود اس کے کہ یہ ہندوؤں کی گلی تھی اور کرفیو صرف اس حد تک لگا تھا کہ لوگ گلیوں کے باہر بڑی سڑک تک نہیں جا سکتے تھے، پھر بھی اُمس بھری رات میں گھر کے اندر سونے کو مجبور تھے- گھروں کے اندر جانے کا خیال ہی ناقابلِ برداشت تھا اس لیے لوگ باہر گلی میں بیٹھ گئے اور گپ لڑاتے رہے- دوسرے وہ مطمئن تھے، گلی میں بیٹھنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا- دہاڑی کمانے والے ضرور پریشان تھے کہ اگر کرفیو تین چار دن چل گیا تو گھر میں جلنے والے چولھے کی رفتار مدھم ہوتی جائے گی- پچھلے برسوں میں جب تک شہر کے حکمرانوں کو لگتا کہ شہر کو اچھی طرح سبق نہیں سکھایا گیا ہے، تب تک وہ کرفیو اٹھانے کو ٹالتے جاتے- دو تین لگاتار کرفیو جاری رہتے تو دہاڑی والے واویلا کرنے لگتے-

گلی کے ایک کونے پر اچانک دو تین پتھر کسی دروازے سے ٹکرائے- سیڑھیوں، چبوتروں پر بیٹھے لوگ ہڑبڑا کر بھاگے- کچھ لوگ نالیوں میں پھنس کر گر گئے- کچھ عورتوں نے چیخنا شروع کر دیا- بچوں کو سنبھالنے کے چکر میں عورتیں گر گر پڑیں- لیکن یہ بدحواسی چند منٹوں کی رہی- جلد ہی لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ گلی پر باہر سے کوئی حملہ نہیں ہوا بلکہ گلی کے کنارے اکٹھے بیٹھے لڑکوں ہی نے اٹھ کر یوسف درزی کے مکان کے بند دروازے پر دو تین اَدھے مار دیے تھے- یوسف درزی اس گلی میں اکیلا مسلمان تھا- ملک کی تقسیم کے بعد اس کے سبھی بھائی پاکستان چلے گئے، صرف وہی رہ گیا تھا- ہر فساد میں اس کی بیوی اسے تیس پینتیس سال پرانی بےوقوفی پر کوسنے

لگتی اور ہر دنگے میں وہ فیصلہ کرتا کہ اس گلی کا مکان بیچ کر وہ کسی محفوظ جگہ پر مکان لے لے گا، لیکن ہر بار فساد ختم ہونے کے بعد وہ دو تین دن سبھی جگہ پر مکان ڈھونڈھتا اور پھر چپ چاپ سر جھکا کر کپڑے سینے لگتا۔ فساد میں یوسف درزی کے خاندان کے لیے صرف یہی فرق پڑتا کہ وہ اپنے مکان میں قید ہو جاتا۔ مکان چاروں طرف سے بند کر دیا جاتا۔ دروازوں پر تختے اور چارپائیاں لگا دی جاتیں اور گھر کے کمروں میں لوگ چپ چاپ سُن ہو کر بیٹھ جاتے۔

یوسف درزی کے نو بچے تھے۔ ان میں چھ لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں مختلف عمروں کی تھیں اور اپنی اپنی عمر کے مطابق لفڑوں میں گھری تھیں۔ وہ لفڑے محلے کے تمام لڑکے لڑکیوں کے لفڑوں کی طرح تھے، جو اسکول جانے کی عمر سے شروع ہوتے تھے اور شادی ہوتے ہی ختم ہو جاتے تھے۔ آج تک تو اس گلی میں ایسا ہوا نہیں کہ جس کے ساتھ چھپ چھپا کر آنکھیں لڑائی گئی ہوں، کتابوں کاپیوں میں چھپا کر چٹھیاں بھیجی گئی ہوں، اُسی سے شادی ہو گئی ہو۔ مستقبل میں بھی ایسا ہونے کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے یوسف درزی کی لڑکیاں اسکول جاتے جاتے یا اپنے گھر کی کھڑکی دروازے پر کھڑے ہو کر بے خیالی میں لڑکوں کو دیکھ کر مسکرا دیتیں یا آنکھیں نیچی کر کے تیزی سے بغل سے نکل جاتیں۔

آج بھی کرفیو لگنے سے پیدا ہوئی بوریت کو دور کرنے کے لیے وہ لڑکیاں باری باری سے کھڑکی پر آ کر بیٹھ جاتیں اور نیچے گلی میں چبوترے پر بیٹھے لڑکوں کی سیٹیوں اور پھبتیوں پر مسکرا کر ہٹ جاتیں۔ یوسف درزی کا پشتینی مکان اس محلے کے مکانوں کے لحاظ سے کافی بڑا تھا۔ نیچے دو کمرے تھے، آنگن تھا اور باورچی خانہ تھا۔ اوپر ایک کمرہ تھا اور کھلی چھت تھی۔ چھت کی دیواریں ضرور یوسف نے اپنی لڑکیوں اور دنگوں کی وجہ سے کافی اونچی کرا دی تھیں۔

پورے گھر میں سہما ہوا سناٹا تھا۔ یوسف اور اس کی بیوی نے باہری دروازہ بند کر کے اس پر تختے اور چارپائیاں کھڑی کر کے مضبوطی کر دی تھی۔ یوسف کرفیو لگتے ہی بڑی مشکل سے گرتا پڑتا اپنی دکان بند کر کے گھر آیا تھا۔ وہ کافی دیر تک گھر کے دروازے بند کر کے اوندھے منھ بستر پر پڑا رہا۔ اس کی بیوی دبے لفظوں میں اسے کوستی رہی۔ لڑکے لڑکیاں سہمے سہمے کونوں کھدروں میں دبکے رہے۔ اندھیرا ہونے پر لڑکیاں باری باری سے اوپر کمرے میں کھڑکی تک آنے جانے لگیں۔ ماں نے کھانا پکانا شروع کیا اور لڑکیوں میں سے دو ایک کو دھول دھپے لگا کر اپنے ساتھ رسوئی

میں لگالیا۔ باپ بیچ بیچ میں ذرا بھی شور ہونے پر دانت پیس پیس کر لڑکوں کو گالیاں دیتا۔

کھانا بن جانے پر یہ سلسلہ ٹوٹا اور پورا خاندان نیچے اکٹھا ہو کر کھانا کھانے بیٹھا۔ بیوی پروستی رہی اور یوسف درزی اپنی عادت سے مجبور سر جھکائے کھاتا رہا۔ بچے بھی اس کی موجودگی سے خائف ہو کر بنا کچھ بولے کھانا کھاتے رہے۔ اس بیچ باہر چبوترے پر بیٹھے لڑکوں کا صبر جواب دے گیا۔ انھوں نے پہلے تو ایک آدھ کنکریاں اوپر کھڑکی پر پھینکیں، اور جب کوئی لڑکی کھڑکی پر نہیں آئی تو تین چار اَدّھے اور پوری اینٹیں دروازے پر دے ماریں۔

دروازے پر اینٹ لگتے ہی جو بھڑ بھڑ کی آوازیں ہوئیں انھوں نے یوسف درزی کے پورے خاندان کو خوف کے سمندر میں ڈبو دیا۔ چھوٹے بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ یوسف نے دہشت بھری آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر چارپائیاں رکھی تھیں لیکن پھر بھی اگر باہر سے دباو پڑتا تو پرانے وقت کی مار کھایا دروازہ کتنی دیر تک رک پاتا۔ اس نے اپنے چھوٹے لڑکے کو کچھ اشارہ کیا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔ یوسف اور اس کی بیوی نے دو تین بھاری سامان اور اٹھا کر دروازے سے لگا دیے۔ بچوں کے نوالہ نگلتے ہاتھ رک گئے اور انھوں نے اپنی خوف زدہ آنکھیں دروازے پر لگا دیں۔

باہر گلی میں بھی اینٹوں کی آوازوں نے لوگوں کو کچھ دیر کے لیے تہ وبالا کر دیا۔ لیکن جلد ہی لوگوں کی سمجھ میں آگیا کہ یہ کوئی باہری حملہ نہیں تھا بلکہ گلی کے ہی لڑکوں نے یوسف درزی کے مکان پر پتھر پھینکے تھے۔

لوگوں نے لڑکوں کو گالیوں سے جھڑکا۔ جو لوگ دوسری گلیوں کے مسلمانوں کے یہاں پاکستانی ٹرانسمیٹر اور ہتھیاروں کا ذخیرہ ہونے کا بیان کر رہے تھے انھیں کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ کیسے اپنی گلی کے مسلمان کے مکان پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک ساتھ اتنے لوگ للکارنے لگے کہ شرارتی لڑکے سہم کر دبک گئے۔

گلی والوں کو بھی احساس ہوا کہ افراتفری میں اس اکیلے مکان کو وہ بالکل بھول گئے تھے۔ وہ مکان کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ دو تین نے الگ الگ آوازیں لگا کر یوسف کو دروازہ کھولنے کو کہا۔ اندر سے کوئی آہٹ نہیں آئی۔

"آج پہلا دن ہے، آج دروازہ نہیں کھولیں گے،" کسی نے کہا۔ بات صحیح تھی کیوں کہ پہلے

بھی کرفیو کے دوران دو ایک دن تک یوسف کے گھر کا دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ "یوسف بھائی گھبرانا نہیں، ہم لوگ یہاں ہیں،" دیوی لالہ نے اپنی شراب کی پیاسی زبان کی اینٹھن کو دباتے ہوئے کہا۔ لڑکوں نے وہ بات پکڑلی۔ انھوں نے چلبلی آواز میں گانا شروع کیا۔

یوسف تم سنگھرش کرو، ہم تمھارے ساتھ ہیں

ابھی ابھی چناو ختم ہوا تھا اور نعرہ لڑکوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ بڑوں نے انھیں جھڑکنے کی کوشش کی پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ لوگ الگ الگ گروہوں میں تتر بتر ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں اوپر والی کھڑکی کھل گئی اور لڑکے بھی نیچے سامنے والے چبوترے پر جم گئے۔

۴

کرفیو کا دوسرا دن تھا اور سعیدہ کی بیٹی پوری طرح پست ہو گئی تھی۔ اگست کی سڑی گرمی نے لگاتار بند کمرے کو جہنم میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس جہنم میں گھری عورتوں اور مردوں کے جسموں کی خوشبو کے ساتھ بچوں کے پاخانے کی بدبو بھی شریک ہو گئی تھی۔ ۱۳ ضرب ۸ فٹ کے کمرے اور اس کے ساتھ لگے ۸ ضرب ۵ فٹ کے برآمدے میں لوگ قید تھے۔ اس میں سعیدہ، اس کا شوہر، اس کی ساس اور سسر، اس کی ایک بڑی نند، دو چھوٹے دیور ایسے تھے جنھیں بڑا کہا جا سکتا ہے؛ اس کی نند کا سات سال کا لڑکا اور اس کی دو بیٹیاں، تین ذی روح ایسے تھے جن کی گنتی چھوٹوں میں ہو سکتی تھی۔

اپنے گاؤں سے جب سعیدہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو بہت ساری چیزوں سے وہ مانوس نہیں ہو پائی تھی۔ وہ محلہ جسے منہاج پور کے نام سے پکارا جاتا تھا، خاص طور سے مسلمانوں کا محلہ تھا اور اکثر مسلم محلوں کی طرح غریبی، گندگی اور جہالت سے بجبجاتا رہتا تھا۔ بڑی مشکل سے سعیدہ یہ بات سمجھ پائی کہ یہ چھوٹا سا کمرہ اس کا پورا گھر ہے۔ اس کمرے میں ساس، سسر، دیور، نند کی موجودگی میں اسے اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کرنی تھی۔ شروع شروع تو وہ چڑ جاتی تھی۔ ایک کمرے کے اس گھر میں پیچھے کی طرف ایک برآمدہ تھا جس سے ملا ہوا چھوٹا سا پاخانہ تھا۔ اس پر ایک

Scanned with CamScanner

ٹاٹ کا پردہ ٹنگا رہتا تھا اور کمانے والا نہ ہونے کی وجہ سے کبھی بھی یہ پوری طرح سے صاف نہیں ہوتا تھا۔ ایک خاص طرح کی بدبو اس سے ہمیشہ نکلتی رہتی تھی۔ سعیدہ کو اس بدبو کے ساتھ جینے کی عادت ڈالنے میں کئی مہینے لگ گئے۔

اسی برآمدے میں سعیدہ کو شادی شدہ زندگی کا ابتدائی سکھ حاصل ہوا۔ پہلی رات کو چھوڑ کر، جب اس کے ساس سسر سبھی کو لے کر باہر گلی میں نالے پر سونے چلے گئے تھے، باقی تقریباً روز ہی کوئی نہ کوئی کمرے میں موجود رہتا، کبھی کبھی تو پورا کنبہ ہی اندر موجود رہتا۔ سعیدہ کا شوہر برآمدے میں زمین پر بستر بچھا کر پڑا رہتا اور بے چینی کے ساتھ سعیدہ کا انتظار کرتا۔ وہ دیر ہونے پر مضحکہ خیز انداز میں کھانستا اور اس کی کھانسی کی آواز سن کر سعیدہ کا بند بند کاٹھ کی طرح تن جاتا۔ اسے شوہر کی بے حیائی پر بے حد غصہ آتا اور اس کا غصہ تب تک رہتا جب تک وہ دھیرے سے اُٹھ کر زمین پر پورے کمرے میں سوئے لوگوں کو لانگھتی پھلانگتی اپنے شوہر کی بغل میں جا کر لیٹ نہ جاتی۔

کرفیو کا دوسرا دن تھا اور سعیدہ کو چھوڑ کر گھر کے باقی سبھی افراد کو معلوم تھا کہ ابھی اگلے کئی دنوں تک اس میں چھوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ شہر کے حکام کبھی کبھی سبق سکھانے کے لیے کرفیو کئی دنوں تک نہ ہٹانے کے اصول پر یقین رکھتے تھے اور جب انھیں یہ اطمینان ہو جاتا کہ انھوں نے کافی سبق سکھا دیا ہے تبھی وہ کرفیو ہٹاتے۔

بند کمرے میں پڑے رہنے سے سعیدہ کو دو دقتیں محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک تو اس کی بٹیا کی بیماری تھی جس کو دیکھ کر اس کی قیافہ شناس ساس کو لگ رہا تھا کہ اس کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ اس کی ساس نے کل گیارہ بچے پیدا کیے تھے جن میں سے سات مر چکے تھے۔ بچوں کو مرتے دیکھنے کا اسے کچھ ایسا تجربہ تھا کہ اسے اب کسی بھی مرتے ہوئے بچے کو دیکھ کر اس کی ہونے والی موت کا احساس ہو جاتا تھا۔ سعیدہ کی دوسری دقت بڑی عجیب قسم کی تھی۔ وہ جس ماحول سے اس شہر میں آئی تھی، وہاں اس طرح کی دقت کا خیال بھی اس کے لیے مضحکہ خیز تھا۔ وہاں روز صبح منھ اندھیرے المونیم کا لوٹا ہاتھ میں لیے اپنی کسی بہن یا پڑوسن کے ساتھ وہ دور کھیتوں میں نکل جاتی۔ اس کے گاؤں میں دو ایک زمیندار گھروں کو چھوڑ کر باقی کسی کے گھر میں پاخانہ نہیں تھا۔ عورتیں صبح شام اندھیرے میں کھیتوں میں چلی جاتی تھیں۔ جن دنوں کھیت خالی ہوتے اُن دنوں

وہ کسی چھوٹی موٹی جھاڑی یا اونچی مینڈ کے پیچھے چھپ جاتی تھیں۔ اس عادت میں تبدیلی بھی آتی تھی، جب بارش پڑتی تھی یا جب کسی کا پیٹ خراب ہو جاتا تھا۔

سعیدہ کی ساس نے اسے پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ یہاں اسے کیا کرنا پڑے گا۔ اس کے ساس سسر دیہات سے آ کر اس گلی میں بسے تھے، اس لیے اس کی ساس جانتی تھی کہ گاؤں سے پہلی بار آنے پر عورت کے سامنے کیا کیا دقتیں آ سکتی ہیں۔ پہلی ہی شام سعیدہ گھر کے سنڈاس میں گئی تو اُلٹیاں روکتے روکتے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے بری طرح پانی بہنے لگا تھا اور کھٹی پت بھری رال اس کے ہونٹوں کے کونوں سے رس رس کر اس کے کپڑے بھگو گئی۔ سنڈاس ۶ ضرب ۳ فٹ کا کمایا جانے والا پاخانہ تھا، جس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ اس میں مشکل سے کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ اندھیرے سیلن بھرے اس کمرے میں ایک تیز بدبو ہر وقت اٹھتی رہتی تھی اور اس کا دروازہ کھلتے ہی یہ بدبو پورے گھر پر بھبکے کی طرح چھا جاتی تھی۔ دروازہ بند ہونے پر بھی گھر کے پورے جغرافیے پر یہ بدبو ایک دھیمے غلاف کی طرح چھائی رہتی تھی۔ اس بدبو کے ساتھ جینے کے لیے اس سے واقف ہونا ضروری تھا اور یہ واقفیت حاصل کرنے میں سعیدہ کو مہینوں لگ گئے۔

سنڈاس دن میں ایک بار صاف ہوتا تھا۔ سعیدہ نے شروع میں چالاک بننے کی کوشش کی۔ صبح ساڑھے سات بجے تک بھنگی آ جاتا تھا۔ بنا بولے دروازے کے باہر سیڑھیوں پر وہ خاص ڈھنگ سے جھاڑو پٹکتا، جھاڑو کی آواز اس کے آنے کا اشارہ تھی اور اس آواز پر سعیدہ کا دیور یا ساس اٹھ کر دیکھ آتی کہ پاخانے میں کوئی گیا تو نہیں ہے۔ اس میں کسی کے ہونے یا اس کے خالی ہونے کی اطلاع بھنگی کو دے دی جاتی۔ پاخانے کی صفائی کے لیے پیچھے گلی میں جانا پڑتا تھا جہاں پاخانے کے نیچے کا قریب قریب ایک مربع فٹ چھوٹا سا حصہ کھلتا تھا۔ اسے ڈھکنے کے لیے ٹین کا ایک ٹکڑا کیلوں کے سہارے جڑا ہوا تھا۔ وقت کی مار نے اس ٹین کے ٹکڑے کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ بھنگی کو روز اس ٹین کے ٹکڑے کو کھولنے یا بند کر۔نے میں یہی ڈر لگتا تھا کہ دوسرے دن یہ ٹکڑا اسے صحیح سلامت ملے گا بھی یا نہیں۔ سعیدہ نے پانچ سات ہی دن میں بھنگی کے معمولات سمجھ لیے۔ وہ صبح ہی سے دھیان لگا کر بیٹھی رہتی اور جیسے ہی بھنگی صفائی کر کے ہٹتا وہ سنڈاس کی طرف جھپٹتی۔ دقت صرف اتنی تھی کہ اسے روز بہت سویرے پاخانے جانے کی عادت تھی۔ صبح سات ساڑھے سات تک انتظار کرنا کافی تکلیف دہ محسوس ہوتا تھا۔ اپنے اوپر قابو رکھنے کے لیے اسے طرح طرح کی

حرکتیں کرنی پڑتی تھیں۔ اکثر اس کا پورا جسم اکڑ جاتا۔ جلد ہی اس کی ساس نے اس کی یہ حرکت پکڑ لی۔ اس کی ساس کو یہ بہت برا لگا کہ چار دن پہلے گھر میں آئی لونڈیا اپنے کو خاندان کے دوسرے لوگوں سے برتر سمجھے اور ایسا برتاؤ کرے جس سے دوسرے لوگ اپنے کو کمتر سمجھیں۔ اس نے ایک دن صبح صبح سعیدہ کو ایسی چنی چنی گالیاں دیں کہ وہ شرم اور گھبراہٹ میں کافی دیر تک اپنے پیروں میں منھ چھپائے بیٹھی رہی۔

لیکن اس کی ساس، جو اس کی ساس کے علاوہ پھوپھی بھی تھی، جلد ہی پسیج گئی۔ س نے دو تین بار دیکھا کہ سعیدہ ابتر حالت میں سنڈاس سے نکلتی، اس کی آنکھوں سے بُری طرح پانی ٹپکتا رہتا اور اُلٹی روکنے کی کوشش میں اس کے منھ سے رال کی شکل کا مادہ گرتا رہتا۔

سعیدہ کے گھر کے پاس جہاں گلی ختم ہوتی تھی وہاں ایک پلاٹ خالی پڑا تھا۔ اسے کسی نے گھر بنوانے کے لیے نیو بھروا کر پچھلے کئی برسوں سے خالی چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے پیچھے نالا تھا جو کافی دور تک گلی کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا اُتر کی طرف نکل جاتا تھا۔ یہ پلاٹ اور نالا دن بھر محلے کے بچوں کی آوارہ گردی اور کھیل کود کا اڈّا بنا رہتا۔ سعیدہ کی ساس صبح منھ اندھیرے اُسے لے کر اسی میں جانے لگی۔ کبھی وہ پلاٹ کے کسی کونے میں بیٹھ جاتی اور کبھی نالے کے کنارے چلی جاتی۔ نالے کے کنارے اُترنے کے لیے ڈھلان سے اترنا پڑتا تھا، اس لیے اکثر ساس بہو ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے کو سہارا دیتیں۔ بڑھیا ساس ایک دو بار گر کر اپنے ٹخنوں میں موچ بھی لگا بیٹھی۔ ہر بار گرنے پر وہ سعیدہ کو کوستی اور بیٹھے بیٹھے یا چلتے چلتے اتنی گالیاں دیتی کہ سعیدہ روہانسی ہو جاتی۔

اس پورے معمول میں دقت یہ تھی کہ ساس بہو کو صبح بہت سویرے اٹھنا پڑتا۔ انھیں کسی رات گیارہ بجے سے پہلے سونا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ سعیدہ کو تو اس کے بعد بھی اپنے شوہر کے لیے ایک آدھ گھنٹے تک جاگنا پڑتا۔ اس کے بعد اتنے سویرے اٹھنے کا مطلب تھا پورا دن اونگھتے ہوئے بِتانا۔ ساس نے تو پانچ سات ہی دن میں توبہ بول دی، مگر سعیدہ کو اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔ سنڈاس میں بیٹھنے کا خیال ہی اتنا اُبکائی بھرا تھا کہ وہ روز صبح صبح مقررہ وقت پر اٹھ بیٹھتی۔ کبھی کبھی شوہر رات کو دیر تک سونے نہ دیتا تو باقی بچے تین چار گھنٹے سعیدہ کے اس دہشت میں نکل جاتے کہ کہیں سورج نکل آئے اور اس کی آنکھ نہ کھلے۔ وہ نیم غنودہ حالت میں رہتی اور بیچ بیچ میں چونک کر اٹھ جاتی اور اپنے شوہر کی کلائی میں آنکھیں گڑا گڑا کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش

Scanned with CamScanner

کرتی۔ رات بھر وہ اسی طرح سوتی اور دن بھر ساس کی گالیاں سنتی۔

کرفیو کے دوسرے دن گھر، بجبجاتے سنڈاس اور اُمس بھری گرمی میں، ایک ایسے دوزخ میں تبدیل ہو گیا جس میں زندہ رہنے والے افراد کے لیے پسینے اور بدبو سے پست وجود کو ڈھونا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ سعیدہ نے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر اندر گھسنے کی کوشش کی اور تقریباً قے کرتی ہوئی باہر بھاگی۔ پورا دن ہو گیا تھا اور وہ ایک بار بھی سنڈاس نہیں گئی تھی۔ صبح سے وہ کچھ نہیں کھا رہی تھی۔ مارے ڈر کے اس نے چائے بھی نہیں پی تھی۔

سعیدہ کی لڑکی دن بھر اپنی دادی کی گود میں پڑی رہی تھی۔ دو سال کی لڑکی تین دن کی پیچش سے بے حال ہو گئی۔ آج دوپہر بعد سے اسے اُلٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ سڑتی گرمی اور گندگی نے اسے ہیضے کا شکار بنا دیا ہے۔ صرف دادی اور ماں اس کے بارے میں پریشان تھیں۔ دادا اور باپ کمرے کے ایک کونے میں اکڑوں بیٹھے بیڑیاں بنانے میں اس قدر مشغول تھے کہ اس اندھیرے سیلن بھرے کمرے میں اچانک کوئی روشنی میں سے آتا تو انھیں بھُوت سمجھنے کی بھول کر بیٹھتا۔ چاروں طرف سے بند کمرے میں ان کے ننگے بدن پر پسینا بری طرح چپچپا رہا تھا اور ان کے پیشہ ور ہاتھ پتوں، تمباکو اور دھاگوں پر مضراب کی طرح چل رہے تھے۔ سعیدہ کے دونوں دیور اور اس کی نند کا لڑکا کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھے کیرم بورڈ کھیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر میں یہی ایک تفریح کا سامان تھا اور صبح سے اسے کھیلتے کھیلتے لڑکے بور ہو گئے تھے۔ وہ کھیلتے، جھگڑتے، کھیلنا بند کر دیتے، اور پھر کھیلنے لگتے۔ صبح سے یہی چل رہا تھا۔ آج چوں کہ بیڑی بنانے کا سامان کم تھا اس لیے انھیں کھیلنے کے عوض میں لاتیں، گھونسے یا گالیاں نہیں مل رہی تھیں۔ ڈیڑھ کمرے کے مکان میں صرف سعیدہ کی نند چل پھر رہی تھی اور گھر کے لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنے میں لگی تھی۔

سعیدہ دو دن کے لیے دوا لائی تھی اور گھبراہٹ میں اس نے ایک ہی دن میں اسے پلا دیا تھا۔ دوپہر تک دوا ختم ہو گئی۔ سعیدہ نے کئی بار مجبور اور لاچار نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ایک آدھ بار اس نے اپنے سسر کا لحاظ چھوڑ کر شوہر سے باہر جا کر دوا لانے کی گڑگڑاہٹ بھری خوشامد بھی کی، لیکن اس کا شوہر اور سسر بے حسی سے اپنے کام میں لگے رہے۔

شوہر کو سویرے بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا، اس لیے اب وہ باہر جانے کی کوئی التجا سننے کو تیار نہ

تھا۔ صبح پانی کے لیے اسے باہر نکلنا پڑا تھا۔ گھر میں ایک نل تھا جس میں صبح اور شام کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پانی بوند بوند ٹپکتا تھا۔ پانی کی باقی ضرورت گلی کے منھ پر لگے عام نل سے پوری ہوتی تھی۔ روز صبح اور شام وہاں کُہرام مچتا تھا؛ عورتیں ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی، اپنی اپنی بالٹی کو آدھا تہائی بھرتی تھیں۔ گلی کے زیادہ تر مکانوں میں ایک دو ٹونٹیوں سے زیادہ نہیں تھیں جن سے جاڑوں میں بھی لوگوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ پھر اِس وقت تو بلا کی گرمی تھی جس میں آدمی کے حلق میں ہر وقت کانٹے لگے رہتے ہیں، اس لیے سعیدہ کے شوہر نے اپنی ماں کے کہنے پر جوکھم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ پچھلے دن دوپہر میں کرفیو لگنے کے بعد سے ایک بوند پانی باہر سے گھر میں نہیں آیا تھا۔ گھر کے نل میں روز کی طرح اتنا پانی ٹپکا تھا کہ سویرا ہوتے مشکل سے ڈیڑھ بالٹی پانی بچا تھا۔ اس لیے ماں کے کہنے پر وہ بالٹی ہاتھ میں لیے باہر گلی کے ٹھنڈے اندھیرے میں اُتر گیا۔

تقریباً بارہ گھنٹے اُمس بھرے کمرے میں بند رہنے کے بعد کھلے پن میں نکلنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ ابھی پو نہیں پھٹی تھی اور گرمی کی صبح ٹھنڈی بیار کے ساتھ تازگی دے رہی تھی۔ پوری گلی میں سناٹا تھا اور رات میں گلی کے ایک ایک انچ میں پڑی رہنے والی چارپائیاں جانے کہاں رخصت ہو گئی تھیں۔ روز کی تنگ گلی آج کافی کھلی اور چوڑی نظر آ رہی تھی۔ زندہ ہستیوں کے نام پر صرف کتے تھے۔ روز رات بھر گلی میں جگالی کرتی گھومنے والی گائیں بھی کرفیو کی زد میں آ گئی تھیں اور لاپتا تھیں۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بالٹیاں لٹکائے سہمی سہمی چال سے آگے بڑھا۔ نل قریب سو گز دور تھا۔ تھوڑا ہی آگے بڑھنے پر پانی کی آواز آنے لگی۔ نل کھلا ہوا تھا اور صبح صبح تیز رفتار سے پانی آنے کی وجہ سے اس کے زمین پر گرنے کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ روز ہی کی طرح رات میں نل بند نہیں کیا گیا تھا اور روز ہی کی طرح پانی تیز رفتار سے زمین پر گر رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ روز اس وقت تک اکا دکا عورتیں بالٹیاں لیے نل کی طرف جاتی یا واپس آتی دکھائی دے جاتی تھیں جب کہ اس وقت وہ بالکل اکیلا تھا۔

دس پانچ قدم چلنے کے بعد اس کا ڈر دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا۔ وہ مستی میں آنے لگا۔ رات بھر کی بے کیفی نے اس کے جسم میں جو اکڑن بھر دی تھی، صبح کی ٹھنڈی بیار نے اسے دور

Scanned with CamScanner

کر کے تازگی پیدا کر دی۔ وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگا۔ اپنے آپ سے بے خبر جب وہ نل کے قریب پہنچا تو اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اونچی آواز میں گا رہا ہے۔ اس نے نل کے نیچے بالٹی لگانے سے پہلے پانی کی، ٹھنڈی دھار اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹ کر منھ ہاتھ دھویا۔ پانی اتنی تیز رفتار سے آرہا تھا کہ لاکھ بچاتے بچاتے اس کی لنگی اور بنیان بھیگ گئی۔ پانی ٹھنڈا تھا اور اس کا لمس تن میں سکھ اور جھرجھری ایک ساتھ پیدا کر رہا تھا۔

پتا نہیں اس کی اونچی آواز کا اثر تھا یا صبح صبح ٹھنڈے پانی سے منھ ہاتھ دھونے کا، ایک دو پولیس والے اونگھتے آلساتے وہاں نمودار ہوئے۔ اُسے ان کے وہاں ہونے کا پتا تب چلا جب انھوں نے گالیوں اور ڈنڈوں کی بوچھار ایک ساتھ شروع کر دی۔ "مادر — سالے، کرفیو میں یہاں اپنی ماں — آیا ہے!" اس جملے کے ساتھ دنادن اس کے پیروں اور کولھوں پر ڈنڈے پڑنے لگے۔

اس کی دوسری بالٹی آدھی بھری تھی۔ وہ لڑکھڑا کر ایک طرف کو جھکا اور پھر سنبھل کر اس نے دونوں بالٹیاں اٹھائیں اور گھر کی طرف بھاگا۔ دونوں پولیس والے شاید رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد اتنے تھکے ہوئے تھے کہ انھیں اس کے پیچھے بھاگنے میں کوئی نتیجہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اپنا چلو نل میں لگا کر پانی پینا شروع کر دیا اور دوسرا کھڑا ہوا اسے ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا۔ بھاگتے بھاگتے وہ دو تین بار لڑکھڑایا۔ جگہ جگہ اس کی بالٹیوں کا پانی چھلکتا رہا اور راستے بھر اسے ایسا لگتا رہا جیسے اس کے پیچھے دونوں یمدوت دوڑتے چلے آرہے ہوں۔ جب وہ گھر کے اندر گھسا تو اس کی دونوں بالٹیوں میں دو دو چار چار لوٹے پانی بمشکل رہ گیا تھا۔

اس لیے سعیدہ کے کئی بار اشارے سے اور کئی بار صاف صاف کہنے کے باوجود اس کے دل میں باہر نکل کر لڑکی کے لیے دوا لانے کے لیے کوئی جوش پیدا نہیں ہوا۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں لگا رہا۔

سعیدہ نے بھی جھنجھلا کر اپنے شوہر سے بولنا بند کر دیا۔ بیچ بیچ میں جب اس کی بیٹی اپنی دادی کے اوپر اُلٹی یا دست کر دیتی تو وہ اٹھتی اور پانی کے ساتھ پوری کنجوسی برتتے ہوئے ساس کی ساڑھی یا بدن پونچھ دیتی۔ اس کی ساس نے کئی بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دھیرے دھیرے مرتے دیکھا تھا؛ اس کے لیے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں تھا کہ یہ بچی بھی اب مر رہی ہے۔

چھوٹی سی بچی کو مرتے ہوئے دیکھنا بطور ماں کے سعیدہ کا پہلا تجربہ تھا۔ اس نے شہر میں آ

Scanned with CamScanner

کر کئی فلمیں دیکھی تھیں جن میں اکثر عورتیں اپنے مرحوم بچوں کی یاد میں گاتے گاتیں اور بچوں کی بھولی شرارتوں کے تصور میں ڈوبی رہتیں۔ سعیدہ نے اپنی بٹیا کی شرارتیں یاد کرنے کی کوشش کی، پر اسے ہر بار مایوسی ہوئی۔ جو چیز اسے یاد آرہی تھی وہ بھوک، دھول اور بہتی ناک کا کچھ ایسا ملاجلا ملغوبہ تھا جس سے فلمی ماں کی مکمل حقیقت کا کوئی ماحول نہیں بن پا رہا تھا۔ اسے بار بار یاد آرہا تھا، اس بِٹیا کی پیدائش پر اس کی چھاتیوں میں دودھ نہیں اترا تھا۔ سال بھر کی اس کی پہلی بیٹی ابھی تک اس کی چھاتی بھنبھوڑتی تھی پر اِس بیٹی کے جنم سے کچھ دن پہلے سے اس کی ساس نے بڑی بیٹی کو ڈانٹ پھٹکار کر یہ عادت چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ بڑی بیٹی روتی رہتی اور وہ چھوٹی کو اپنی چھاتیوں سے چپکائے رہتی۔ دودھ پتا نہیں اس بار کیوں نہیں اتر رہا تھا۔ لاچاری، غریبی اور مشقت سے ٹوٹا ہوا اس کا بدن اسے پوری طرح سے ماں بننے سے روکتا تھا۔ وہ جھنجھلا کر اپنی دونوں بیٹیوں کو زمین پر ساتھ ساتھ لٹا دیتی اور خود گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ دونوں بیٹیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر روتیں اور روتے روتے بے دم ہو جاتیں۔ گھر کے ذی روح سر جھکائے بیڑی بناتے رہتے۔ بچوں کا اس طرح رونا اس گھر کے ماحول میں ایسی جانی پہچانی صورتِ حال تھی کہ انھیں اپنا کام چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

آج یہی بِٹیا مر رہی تھی۔ زندگی کا سب سے بڑا دکھ ماں کی گود میں اس کے بچے کی موت ہے۔ سعیدہ کا پور پور ماں بن گیا تھا اور نوحہ کر رہا تھا۔ اس کی ایک کم زور اور غریب بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے مر رہی تھی اور کچھ نہ کر پانے کا احساس اسے بری طرح تڑپا رہا تھا۔ اسے گردن جھکائے، لاتعلق سا، بیڑی بناتا ہوا اپنا شوہر کسی ظالم راکھشس سا لگ رہا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ چیخ چیخ کر کمرے کے سناٹے کو توڑ ڈالے اور پتھر کی طرح سخت اور بے حس اپنے شوہر کا سینہ اپنے نکیلے ناخنوں سے چھلنی کر ڈالے۔

جس طرح خاموش کالے جل والی جھیل کا سناٹا اس میں پتھر گرنے سے ٹوٹتا ہے، اسی طرح اس گرم، اُمس والے کمرے کی خاموشی سعیدہ کی چیخ سے ٹوٹی اور کمرے کا ماحول پانی کی طرح دیر تک کانپتا رہا۔ بٹیا کی آنکھیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں اور ہچکی کے ساتھ سانس اکھڑنے لگی تو اس کی دادی سمجھ گئی کہ اب اس کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ پر ماں کی سمجھ میں یہ تب آیا جب اس نے بٹیا کے منھ کے کونے سے بہتی رال اور اُلٹی کے گھول کو پونچھنے کی کوشش کی اور اس کے اوپر جھکے

Scanned with CamScanner

جھکے دیکھا کہ بیٹی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں عجیب طرح سے جھپک رہی ہیں، اور اس کی دونوں آنکھوں کے کنچے اوپر کی طرف چڑھتے چڑھتے اچانک جامد ہو گئے۔ اسے ایک ناقابلِ برداشت قسم کی گھبراہٹ اور ڈر اپنی پسلیوں میں دوڑتا محسوس ہوا اور وہ چیخ پڑی۔

سعیدہ کے شوہر کے لیے موت ایک بہت معمولی قسم کی چیز تھی۔ اس کے اپنے گھر اور پڑوس میں ہر سال موت کسی نہ کسی کو اپنے جبڑے میں کس لیتی تھی۔ مرنے والوں میں اکثر چھوٹے بچے ہوتے تھے، پر اپنی بچی کی موت میں پتا نہیں کیا تھا کہ ضبط کا سارا ناٹک کرنے کے باوجود سعیدہ کی پہلی چیخ سن کر وہ بل گیا۔ جس بیٹی کو دو سال میں مشکل سے چار چھ بار گود میں لے کر باپ کی طرح پیار کیا تھا، اس کے مرنے پر وہ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا خلا میں تاکتا رہا۔ ماں باپ کی موجودگی اسے رونے سے روک رہی تھی۔ روتی ہوئی سعیدہ زمین پر سر پٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساس اور نند اسے پوری طرح سے جکڑے ہوئے تھیں، لیکن پھر بھی بیچ بیچ میں اس کا سر دیوار یا فرش سے ٹکرا جاتا۔ شوہر کا دل ہوا کہ وہ اٹھ کر بیوی کا سر سہلا دے۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور پیچھے کے برآمدے میں بیٹھ کر رونے لگا۔ شاید وہ اپنی بیمار بچی کے لیے کچھ نہ کر پانے کا گناہگار تھا جس نے اسے رونے پر مجبور کر دیا۔

۵

لڑکی کی عمر چودہ سال رہی ہو گی۔ نام بتانے سے قارئین کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہونا ہے۔ نام کے ساتھ مذہب جُڑا ہوتا ہے اور ہمارے اس مہان جگت گرو دیش میں مذہب کبھی انا کی تسکین کی وجہ ہوتا ہے تو کبھی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا بہانہ بن سکتا ہے۔ مثلاً یہ لڑکی اگر مذہباً ہندو نکلی تو ہندو دلاوروں کے لیے ڈوب مرنے کی بات ہو جائے گی اور اگر مسلمان نکلی تو اسلام خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اس لیے اے قارئین، بہتر ہے کہ ہم اس لڑکی کو ہندو یا مسلمان نہ مانیں اور اس کی مصیبت کو صرف اس کی ذاتی مصیبت مان لیں۔

یہ لڑکی اس ملک کی اکثر لڑکیوں کی طرح جہالت، غریبی اور خوابوں کے ساتھ جینے پر مجبور

تھی۔ ہندی فلموں اور رانو کے ناولوں نے اس کے جذبات گڑھنے شروع کیے تھے اور وہ دن رات خوابوں میں ان راجکماروں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی جنھیں اس کی زندگی میں کبھی نہیں آنا تھا۔ اس لڑکی کی گلی کی نالیوں میں پاخانہ بجبجاتا رہتا تھا اور صفائی تبھی ہوتی تھی جب کسی بڑے افسر یا وزیر کا معائنہ ہوتا تھا۔ اس لڑکی کی بڑی بہن بھی اس گندی گلی میں لمبی گاڑیوں والے راجکماروں کا تصور کرتی رہی تھی اور پچھلے سال گلی کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ ان لڑکیوں کے باپ اور بھائیوں نے اسے تیسرے ہی دن بمبئی کے ریلوے پلیٹ فارم پر پکڑ لیا اور پندرہ دن کے اندر اسے ایک ایسے خلاصی سے بیاہ دیا گیا جس کی پہلی بیوی اپنے پیچھے تین بچوں کو چھوڑ کر پچھلے ہی سال مری تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ بھی یہی ہونا تھا، پر اس کے باوجود یہ لڑکی عمر کی ماری گنگناتی رہتی تھی۔

روز کی طرح یہ لڑکی آج بھی ایک بجے واپس گھر لوٹ رہی تھی۔ وہ گیارھویں کلاس میں پڑھتی تھی اور اس کا اسکول گھر سے تین کلومیٹر دور تھا۔ صبح سات بجے سے اس کا اسکول شروع ہوتا تھا۔ شفٹوں میں چلنے کی وجہ سے جاڑا گرمی برسات، کبھی بھی یہ وقت بدلتا نہیں تھا۔ گھر سے وہ چھ بجے نکلتی تھی۔ گرمیوں میں تو یہ گوارا تھا، لیکن سردیوں میں اسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اکثر پہلا پیریڈ چھوٹ جاتا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ لازمی طور سے پونے چھ بجے نکل جاتی تھی۔ اس پابندی کے پیچھے پڑھائی میں اچانک پیدا ہونے والی دل چسپی نہیں تھی بلکہ وجہ کچھ اور ہی تھی۔

اس لڑکی کی گلی میں کچھ آگے چل کر ایک لڑکا رہتا تھا۔ لڑکا اس سے چار پانچ سال بڑا تھا اور کچھ چھیلا ٹائپ کا تھا۔ سالوں سال ایک ہی گلی میں رہتے ہوئے بھی اس سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ایک دوسرے میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ہوا یہ کہ اس لڑکے کو انٹر پاس کرنے کے بعد اس کے باپ نے نوکری کرنے کی صلاح دی۔ لڑکے نے بی اے کرنے کی ضد کی تو باپ نے دھُنائی کر دی۔ لڑکے نے دو تین دن کھانا پینا چھوڑ دیا۔ باپ نے اسے اپنی تنخواہ اور مہنگائی کا موازنہ سمجھا دیا۔ لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سات آٹھ دن بعد باپ نے ایک مقامی اخبار میں لڑکے کی تصویر چھپوائی اور نیچے لکھا کہ اس کی ماں سخت بیمار ہے اور وہ فوراً لوٹ آئے۔ لڑکا لوٹ آیا۔ باپ نے پھر پٹائی کی۔ لڑکا اس بار نہیں بھاگا اور اس نے چپ چاپ نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اس معاملے میں وہ اپنی پیڑھی کے تمام

لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت نکلا۔ بنا کسی سفارش کے نینی کی ایک فیکٹری میں صرف دو ہزار روپے رشوت دے کر اسے ٹائم کیپر کی نوکری مل گئی۔ رشوت دینے کے لیے اس کے باپ نے دفتر کے کئی لوگوں سے اُدھار لیا اور لڑکا اپنی پہلی ہی تنخواہ سے یہ قرض پاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لڑکی کے آج کل پابندی سے صبح پونے چھ بجے گھر سے نکلنے کے پیچھے یہ لڑکا اور اس کی نوکری تھی۔ لڑکے کو آٹھ بجے فیکٹری پہنچنا ہوتا تھا، اس لیے وہ چھ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ گھر سے سٹی بس کا اسٹاپ تقریباً ایک کلومیٹر دور تھا۔ یہ وہ راستا تھا جس سے ہو کر لڑکی بھی اسکول جاتی تھی۔ ایک ہی راستے سے جاتے جاتے دونوں کی آنکھیں محاورے کی زبان میں لڑ گئیں۔ صبح صبح بِھیڑ کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوتا تھا؛ اکادکا کوئی بغل سے گزر جاتا۔ آنکھیں لڑانے کے لیے یہ بڑا موزوں وقت ہوتا تھا۔ دو ایک دن تو لڑکی نے دھیان نہیں دیا لیکن ایک دن اچانک اسے لگا کہ اس کے آگے چلنے والا لڑکا جان بوجھ کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل رہا ہے تاکہ وہ اس کے برابر آ جائے۔ لڑکی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے رفتار دھیمی کرنی ہے یا تیز۔ لڑکے کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا بدن تھر تھرانے لگا اور جاڑے کی اُس صبح اس کی کنپٹی گرم ہو گئی۔

لڑکی نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ لڑکے نے بھی اپنی رفتار اَور دھیمی کر دی۔ لڑکی سمجھ گئی کہ دوری کم ہونی ہی ہے۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی، لہذا دوری کم ہو گئی۔ پھر تو صبح صبح اٹھنے میں ہونے والی کاہلی ختم ہو گئی اور دونوں روز پابندی سے ایک کلومیٹر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اس آدھے گھنٹے ہی کے ساتھ میں دونوں نے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ لڑکی بنا وجہ مسکرانے لگی اور لڑکا اپنے بالوں کو سنوارنے کے لیے اپنی پینٹ کی پچھلی جیب میں کنگھا رکھنے لگا۔ لڑکے کو کل چار سو نوّے روپے تنخواہ کی صورت میں ملتے تھے۔ ان میں سے سو روپے کے قریب مہینے میں بس اور رکشا میں خرچ ہو جاتے تھے۔ باقی تین سو نوّے روپے وہ لائق بیٹے کے طور پر اپنی ماں کے ہاتھ میں ہر پہلی تاریخ کو دے دیتا تھا۔ نوّے سو روپے وہ اپنے جیب خرچ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس دوستی کے نتیجے میں اس نے اپنے جیب خرچ میں کمی کی اور لڑکی کو ایک دن پکچر دکھا لایا، اسے ایک قلم بھینٹ کیا اور دو بار ریستوراں میں چائے پلائی۔ اس مہینے اس نے اپنی ماں کو سو روپے کم دیے اور بہانہ بنا دیا کہ اس کی جیب سے گر گئے۔ وہ لڑکی کو ایک شال بھینٹ

کرنا چاہتا تھا۔ اسے دو تین مہینے ماں سے جھوٹ بول کر اتنے پیسے بچانے تھے کہ ان سے شال خریدی جاسکے۔ تب تک سردیاں بھی شروع ہو جائیں گی۔ اس نے اپنا ارادہ لڑکی کو بتا بھی دیا۔ لڑکی کو زندگی میں یہ پہلی شال ملنے جارہی تھی۔ وہ رہ رہ کر شال کا دباؤ اپنے سینے پر محسوس کرتی اور مسکرانے لگتی۔ اس نے اپنے گھر کے دو چار بے کار ہو چکے سویٹروں کو اُدھیڑا اور لڑکے کے لیے سویٹر بُننے لگی۔ ظاہر ہے کہ وہ ماں کو یہ نہیں بتا سکتی تھی، اس لیے یہ سب کارروائی چوری چھپے ہی ہوئی۔ ایک بڑی سی ٹوکری میں ماں ہر سال جاڑا ختم ہونے پر گھر بھر کے پھٹے چیتھڑے سویٹر سمیٹ کر رکھ دیتی تھی اور جاڑا شروع ہونے سے ایک آدھ مہینے پہلے ان سویٹروں کو اُدھیڑ اُدھیڑ کر، دو تین سویٹروں کا اُون ملا کر، ایک نیا سویٹر بُنتی تھی۔ تقریباً ہر سویٹر کا اُون اس عمل سے اتنی بار گزرتا کہ پندرہ بیس دن پہننے کے بعد وہ پھر پھٹنے لگتا اور جاڑا ختم ہوتے ہوتے تارتار ہو جاتا۔ اس نے ڈھیرے سے ایک دن لڑکے کے ناپ کے سویٹر کے لیے ضروری اُون ٹوکری میں سے نکال لیا اور اپنی سہیلی کے یہاں رکھ دیا۔ روز اسکول جاتے وقت راستے میں سہیلی کے یہاں سے اون لے لیتی اور پھر دن بھر بُن کر واپس آتے وقت سہیلی کے یہاں رکھ دیتی۔

اس لڑکی کی زندگی اسی طرح محرومیوں اور رومانس کا مکسچر بن کر اگلے دو تین سال، جب تک اس لڑکے کے ساتھ فرار ہونے کا موقع نہیں آتا یا اس کی شادی نہیں ہو جاتی، چلتی رہتی اگر یہ کرفیو اس کے تجربات کی دنیا میں بھونچال بن کر نہ آجاتا۔ ہوا یہ کہ پچھلے ایک ہفتے سے شہر کا مزاج گرم ہو رہا تھا۔ لڑکی کے ماں باپ تجربہ کار تھے اور جانتے تھے کہ مزاج کی یہ گرمی جلد ہی دنگے کی شکل میں برسے گی اور شہر کرفیو کی مار میں آجائے گا۔ ماں نے رات ہی میں کہہ دیا تھا کہ صبح اسکول نہیں جانا، مگر لڑکی کے روزمرہ میں اسکول کی بہت اہمیت تھی۔ دراصل غریبی کی ماری یہ لڑکی اسکول کے بعد کا پورا وقت اپنے گھر کو سنبھالنے میں لگاتی تھی۔ اس کی ماں ایک دکان دار کے لیے پیٹی کوٹ سیتی تھی۔ روز وہ لڑکی کے اسکول سے آتے ہی پیٹی کوٹ سینے بیٹھ جاتی اور آٹھ دس روپے کما لیتی تھی۔ لڑکی اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ گھر کا چوکا برتن سنبھال لیتی تھی۔ دیر رات تک گھر کے کام کاج کو ختم کرنے کے بعد وہ پڑھنے بیٹھتی۔ پڑھتی کیا، پڑھنے اور سوچنے میں لگی رہتی۔ اس اُوبنے والے اور بے رس ماحول میں سویرے اسکول جانے کی وجہ سے جو تھوڑی بہت مٹھاس مل جاتی تھی اُسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ماں کے منع کرنے کے

باوجود وہ سب کی آنکھیں بچا کر تیار ہوئی اور کب اسکول نکل گئی، گھر میں کوئی نہیں جان پایا۔

لڑکی کو بڑی کوفت ہوئی کہ لڑکا آج نہیں آیا۔ لڑکی کو لگا کہ اسے دیر ہو گئی۔ وہ پوری گلیاں لانگھتی ہوئی سڑک پر اس جگہ تک گئی جہاں لڑکا اپنی کمپنی کی بس پکڑتا تھا۔ وہاں پر روز کے مقابلے میں ایک تہائی لوگ بھی نہیں آئے تھے۔ لگتا تھا شہر کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے دفتر نہ جانا ہی مناسب سمجھا۔ بس آئی اور چلی گئی، لڑکی تب تک کھڑی رہی۔ لڑکا بزدل نکلا، اپنی ماں کے آنچل سے نکل نہیں پایا۔ لڑکی نے غصے اور کھیج سے اس کی بزدلی کو کوسا اور واپس گھر جانے کے لیے مڑی، لیکن گھر جا کر کون ماں کے ہاتھوں ذلیل ہوتا، اس لیے وہ اسکول چلی گئی۔

اسکول میں بہت کم لڑکیاں اور استانیاں آئی تھیں، اس لیے کوئی کلاس نہیں چلی۔ کلاس میں لڑکیاں اُدھم مچاتی رہیں اور پرنسپل کے کمرے میں بیٹھی استانیاں بار بار چائے منگاتی اور گپ لڑاتی رہیں۔ لڑکی نے کئی بار سوچا کہ گھر واپس چلی جائے لیکن کھیج اور ماں کے ڈر سے وہ کافی دیر اسکول کے میدان میں دھوپ میں بیٹھی اپنی ایک سہیلی سے دنیا بھر کی باتیں کرتی رہی۔ بات چیت کے اس عمل میں اس نے سنا زیادہ اور بولی کم۔

اچانک انھوں نے دیکھا کہ پرنسپل کے کمرے سے استانیاں بدحواس سی نکلیں اور پھاٹک کی طرف بھاگیں۔ راستے میں جو بھی لڑکی انھیں ملی، انھوں نے اسے فوراً گھر جانے کی ہدایت کی۔ میدان کی طرف ایک چپراسی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے دور سے ہاتھ ہلا کر اور چلّا کر گھر بھاگ جانے کے لیے کہا۔

ڈھوروں کی طرح ہر طرف سے لڑکیاں بھاگیں اور زیادہ تر کو گیٹ پر آنے پر پتا چلا کہ شہر میں گڑبڑ ہو گئی ہے اور کرفیو لگا دیا گیا ہے۔

حالاں کہ لڑکی کا گھر ایسی گلی میں پڑتا تھا جہاں ہر سال دو سال میں کرفیو لگتا ہی رہتا تھا، پھر بھی کرفیو کے دوران سڑک پر بھاگنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بے تحاشا بھاگی۔ دکانیں دھڑادھڑ بند ہو رہی تھیں؛ شٹروں کے گرنے کی آواز طلسمی دہشت پیدا کر رہی تھی۔ سائیکلوں پر اور پیدل، بدحواس بھاگتے لوگوں کی بھیڑ، رگڑتی ٹکراتی، گرتی پڑتی، جس طرح دوڑ رہی تھی اس کا تصور بھی کسی دوسرے دن کرنے میں وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی، مگر آج کی دوڑ سے اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو بھر آ رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

جی ٹی روڈ پر تیسری گلی تھی جہاں سے لڑکی اپنے گھر کے لیے مڑتی تھی۔ آج اسے ہوش ہی نہ رہا اور بھیڑ کے ایک ریلے کے ساتھ وہ کسی دوسری گلی میں ڈھکیل دی گئی۔ گلی میں جب وہ گھسی تو ایک جتھے کا حصہ تھی، لیکن کسی طلسم کی طرح اچانک باقی لوگ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور اس لڑکی نے دن دوپہر میں اپنے کو ایک ایسی گلی میں پایا جو پوری طرح ویران تھی، جس میں کھلنے والے سارے دروازے اور کھڑکیاں سخت جبڑوں کی طرح بھنچی ہوئی تھیں اور جس کے مکان دولت مند محلوں کی طرح تھے۔ ان مکانوں میں یہی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ لڑکی گھبراہٹ کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس گلی سے وہ سیکڑوں بار گزری تھی لیکن آج وہ نہ جانے کیسے اجنبی سی لگ رہی تھی۔

وہ ایک کونے میں کھڑی ہو کر زندگی کی علامات ڈھونڈنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر کی کوششوں کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ گلی کے مکان اتنے مُردہ نہیں جتنے شروع میں لگے تھے۔ ہر مکان میں کھڑکیوں دروازوں کے پیچھے چہرے سٹے ہوئے تھے اور بیچ بیچ میں کوئی پلا کانپتا اور اس کے پیچھے ڈری گھبرائی آنکھیں جھانکتی نظر آ جاتیں۔ گلی کے باہر جی ٹی روڈ پر کوئی شور ہوتا اور دروازوں کھڑکیوں کی درازیں ایک دم مُند جاتیں۔ آس پاس کے کسی مکان کا دروازہ یا کھڑکی آواز کرتی اور لڑکی ڈری ہوئی ہرنی کی طرح چوکنّی ہو جاتی اور اس کی سانس تیز ہو جاتی۔

جن طاقت ور باہوں نے لڑکی کو بے دردی سے اندر گھسیٹ لیا وہ پتا نہیں کہاں سے اگ آئی تھیں۔ لڑکی کو صرف ایک آواز شٹر اٹھانے کی سنائی دی اور جب تک وہ اس آواز کی دھمک سے چونکے، تب تک چھ مردانہ کھردرے ہاتھوں نے اسے ایک تنگ سے چھوٹے کمرے میں گھسیٹ لیا۔ یہ کمرہ ایک چکی کا کمرہ تھا جس میں آٹا پیسا جاتا تھا۔ اس میں چھپے ہوئے مردوں نے اچانک شٹر آدھا اوپر اٹھایا اور لڑکی کو اندر گھسیٹ لیا۔ گھسیٹے جانے کی ہڑبڑاہٹ میں لڑکی کا سر کھٹ سے شٹر سے ٹکرایا۔ سر کی چوٹ اور کھینچے جانے کی دہشت نے لڑکی کو ایک دم وحشت زدہ کر دیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کی چیخ حلق میں گھٹ گئی۔ اسے جب تک بات سمجھ میں آتی تب تک دکان کا شٹر پھر سے گر چکا تھا اور وہ ایک ایسی چارپائی پر پٹک دی گئی تھی جو بُری طرح جھلنگا ہو چکی تھی اور جس پر آٹے کی پرت در پرت جمی ہوئی تھی۔

"میں تمھاری بہن ہوں بھیا، مجھے چلے جانے دو!"

یہی اکیلا جملہ تھا جو وہ لڑکی بول پائی۔ اس پر تینوں دھیرے دھیرے ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک نے بوری کاٹنے کے لیے رکھا ہوا چھرے کی شکل کا لوہا اٹھا لیا اور لڑکی کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"چپ سالی، ہم بہن — ہیں!"

لڑکی چپ ہو گئی۔ اس کے بعد جس تجربے سے ہو کر وہ گزری وہ نہایت لجلجا اور خوفناک تھا۔ جتنی دیر وہ ہوش میں رہی اسے ایسا لگتا رہا جیسے گرم سلاخیں اس کے بدن میں چبھوئی جا رہی ہوں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے مرد کو دیکھتی رہی اور اپنے تجربوں کی دنیا میں کچھ ایسے تجربے جوڑتی رہی جو باقی زندگی میں اس کے ساتھ بُرے خوابوں کی طرح رہنے والے تھے۔

جس طرح ذبح کیے ہوئے جانور کے منہ سے غوں غوں کی آواز نکلتی ہے، کچھ کچھ اسی طرح کی آواز لڑکی کے منہ سے نکل رہی تھی۔ درد کی لہر تھی جو پاؤں سے اٹھ کر اس کے پورے بدن کو جھنجھوڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بری طرح چھٹپٹا رہی تھی اور کئی بار اٹھنے کی کوشش میں چارپائی کی پٹیوں سے ٹکرا کر زخمی ہو چکی تھی۔ اس کی تکلیف تبھی ختم ہوئی جب وہ بے ہوش ہو گئی۔

قارئین، اس کے بعد کی تفصیل بے کار ہے۔ جس طرح لڑکی کی ذات یا مذہب کے بارے میں پوچھنا بے کار ہے، اسی طرح اس کی عصمت دری کرنے والوں کی ذات یا مذہب جاننے کا بھی کوئی مطلب نہیں۔ اس بات کی بھی تفصیل جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ آٹے کی دھول اور غبار میں اٹی ہوئی لڑکی ہوش میں آنے کے بعد اپنے پھٹے چُٹے کپڑوں میں گھر کیسے پہنچی، یا پھر اس محلّے میں سبھی نامرد بستے تھے جنھوں نے اپنے دروازوں کھڑکیوں کی درازوں میں سے لڑکی کو تین درندوں کے ہاتھوں چکّی کے اندر کھینچے جاتے دیکھا اور درازیں چپ چاپ بند کر لیں۔ مطلب صرف اس بات کا ہے کہ کرفیو کسی بھی قوم یا مذہب کی لڑکی کو زندگی کے سب سے معصوم تجربے سے بے دخل کر سکتا ہے اور اسے جانوروں کی سطح پر اتار کر احساس کی ایسی خوفناک سرنگ میں ڈھکیل سکتا ہے جہاں سے ایک بار گزرنے کے بعد پوری زندگی دکھ بھرے خوابوں کی بھول بھلیوں میں تبدیل ہو جائے۔

Scanned with CamScanner

۶

دنیا میں سب سے بڑی ٹریجڈی ماں کی گود میں اس کے بچے کا مرنا ہے۔ یہ ٹریجڈی اس چھوٹے سے دوزخ نما، ڈیڑھ کمرے کے گھر میں چند گھنٹے پہلے واقع ہوئی۔ اس گھر کے مزدور افراد کے لیے موت ایک دیکھی بھالی صورتِ حال تھی؛ ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی بچہ اس گھر میں یا پڑوس میں مرتا تھا۔ بھوک، غریبی اور جہالت سے جو ماحول یہاں بنتا تھا اس میں بچوں کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ تھا۔ لہذا بڑے لوگوں کے لیے تو اس میں بہت کچھ غیر یقینی نہیں تھا، لیکن گھر میں موجود بچے اور سعیدہ اس حادثے سے بری طرح ہل گئے تھے۔

کمرے کے بیچوں بیچ دو ڈھائی فٹ لمبی ایک لاش پڑی تھی جسے ایک سفید چادر کے پھٹے ٹکڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ گھر کے سارے بڑے افراد کمرے کے چاروں طرف دیواروں پر سر ٹکائے آدھ لیٹے پڑے تھے۔ سعیدہ کی بڑی بچی جو ابھی ساڑھے تین سال کی ہوئی تھی، ایک ٹک اپنی بہن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہوش میں آج پہلی بار اس کی بہن خاموش پڑی تھی، نہیں تو جب بھی اس نے دیکھا اسے منمناتے یا روتے ہی دیکھا تھا۔ ایک بار اس نے پوچھا بھی:

"کس امی، آج بہنا بولت کا ہے نہیں؟"

مگر اس پر سعیدہ اتنی زور سے دہاڑ مار کر روئی کہ وہ گھبرا کر چپ ہو گئی۔ اسے لگا کہ اس نے کوئی ایسی چیز پوچھ لی ہے جو اسے نہیں پوچھنی چاہیے تھی۔ اس کا سات سال کا پھپھیرا بھائی دوسرا ایسا فرد تھا جو اس موت سے بری طرح بے چین تھا۔ دراصل چھوٹی لڑکی ان دونوں بچوں کے لیے کھلونے کی طرح تھی۔ اس کے آنے کے بعد یہ دونوں اپنے کو بڑا سمجھنے لگے تھے۔ سعیدہ اکثر کام دھندے میں پھنسی رہنے پر چھوٹی بیٹی کو ان دونوں کے حوالے کر دیتی تھی۔ حالاں کہ دونوں کو چھوٹی کا لگاتار رونا یا منمنانا ناپسند تھا، پھر بھی دونوں اس کے ساتھ بڑوں کی طرح پیش آتے؛ اسے تھالی یا کٹوری بجا کر چپ کرانے کی کوشش کرتے یا اپنی گود میں لٹا کر بڑوں کی طرح پانی یا دودھ چمچ یا کٹوری سے پلانے کی کوشش کرتے۔

بچی کی موت دن چھپنے سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے رات اُتر آئی اور اس نے اس گھر کو بھی باہر کے پورے ماحول کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس گھر میں دو بلب

تھے؛ ایک اس کمرے میں جہاں گھر کے افراد بیٹھ کر بیڑی بناتے تھے، اور دوسرا پیچھے برآمدے میں جس کی روشنی اس برآمدے میں ایک کنارے بنی رسوئی اور سنڈاس تک جاتی تھی۔ دونوں کی مریل روشنی نے گھر کے افراد کو جادو لوک کی مصوّر پرچھائیوں سا بنا دیا تھا۔

غم اور ماتم کی رات اتنے دھیرے دھیرے بیتتی ہے کہ لگتا ہے وقت تھم گیا ہے۔ ایسی رات کسی بھی طرح کٹتی دکھائی نہیں دیتی۔

کسی کی شبِ وصل سوتے کٹے ہے
کسی کی شبِ ہجر روتے کٹے ہے
یہ کیسی شبِ ہجر ہے یا الٰہی!
نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

اس گھر کے افراد کے لیے بھی آج کی رات کچھ ایسی ہی ہو گئی ہے۔ گھر کے دو چھوٹے فرد موت کے اسرار سے جوجھتے جوجھتے زمین پر لڑھک گئے۔ دوپہر بعد سے ان کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔ بھوک نے کافی دیر تک انھیں سونے نہیں دیا لیکن نیند تو بچوں کی سب سے پیاری دنیا ہوتی ہے، لہذا خالی پیٹ بھی وہ دھیرے دھیرے نیند کے سمندر میں کھو گئے۔ جانے یہ گھر کی عورتوں کو ماتم کرتے ہوئے دیکھنے کا اثر تھا یا بھوک سے انتڑیوں کی اینٹھن کا نتیجہ، ان کی ننھی آنکھوں سے کافی آنسو بہے تھے اور دونوں کے گالوں پر آنسو لکیروں کی شکل میں جم گئے تھے۔

گھر کے بڑے افراد دیوار پر سر ٹکائے بیٹھے تھے۔ سعیدہ کا بوڑھا سسر اپنی آنکھیں آدھی کھولے، کمرے کی نہ جانے کس چیز پر انھیں ٹکائے، خاموش، دھیان میں گم سا بیٹھا تھا۔ اپنے بچپن میں ماں باپ کی موت کو چھوڑ کر آج تک کسی کی بھی موت پر وہ مضطرب نہیں ہوا تھا۔ باپ سے وہ بہت زیادہ لگاؤ محسوس کرتا تھا اور اس کی موت کے وقت تک وہ اتنا سمجھ دار ہو گیا تھا کہ موت کا مطلب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ اس کا باپ اسے بہت پیار کرتا تھا اور دن بھر بیڑی بنانے کے بعد اسے شام کو گھمانے ضرور لے جاتا تھا۔ اسے سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے یہ سکھ حاصل تھا۔ گھوم کر جب وہ لوٹتا تو اس کے پاس رنگ برنگے کنچے اور پتنگیں ہوتی تھیں اور اس کے منھ اور مٹھیوں میں کھٹ مٹھی گولیاں بھری ہوتیں۔ اس کے سارے بھائی چھوٹے سے کمرے

Scanned with CamScanner

میں بیٹھے بیڑیاں بناتے رہتے اور وہ ان کے حسد کا مرکز بنا، بیچ کمرے میں بیٹھ کر پتنگ میں ڈور چڑھاتا یا کنپے کھیلتا۔ باپ کے مرنے کے بعد اسے جو احساس ہوا وہ بعد کی موتوں پر نہیں ہوا۔ بعد کے برسوں میں موت اس کے لیے معمولی اور ٹھنڈی شے بن گئی۔ جس علاقے میں وہ رہتا تھا وہاں پچیس سال کے بعد ہر شخص تمباکو اور سیلن کا شکار ہو کر ٹی بی کا مریض بن جاتا تھا۔ بچے بھی بہت زیادہ تعداد میں پیدا ہوتے اور اسی شرح میں مرتے تھے۔ دراصل موت اس کے لیے اتنی جانی پہچانی شے تھی کہ آج بچی کی موت نے اس پر زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اسے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ بچی کو دفن کیسے کیا جائے گا۔ آج رات کرفیو کھلنے کے کوئی آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔ کل دن میں بھی کرفیو کھلے گا یا نہیں، کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ صبح صبح اس کا لڑکا بالٹی لیے جس طرح پانی چھلکاتا ہوا گھر کے اندر آیا اور گھر کا دروازہ بند کر کے ہوا کو گالیاں دیتا رہا، اس سے وہ صاف سمجھ گیا تھا کہ باہر اُسے ذلیل کر کے کھدیڑا گیا ہے۔ جس طرح کی سرمئی گرمی پڑ رہی تھی، اس میں لاش دوپہر شروع ہونے سے پہلے ہی دفن ہو جانی چاہیے تھی، نہیں تو اس میں سڑاند اور بدبو شروع ہو جاتی۔

کرفیو کا اسے پرانا تجربہ تھا۔ کرفیو کے دوران کوتوالی میں بیٹھ کر ایک مجسٹریٹ کرفیو پاس بناتا تھا۔ یہ پاس بنوانا اس کی جیسی حیثیت کے لوگوں کے لیے آسان نہیں تھا۔ پچھلے ایک آدھ موقعوں پر اس نے پاس بنوانے کی کوشش کی تھی اور ہر بار ناکام ہو کر لوٹا تھا۔ لڑکے سے کہنے کے لیے اس نے کئی بار ہمت بٹورنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار اس کا منھ دیکھ کر چپ رہ گیا۔

یہ لڑکا اس کی اولاد میں دوسرے نمبر پر تھا، لیکن لڑکوں میں پہلے نمبر کا ہونے کے کارن وہ ذمے داری کے احساس سے وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کے بھیتر بڑا ہونے کا یہ احساس اتنا گھرا بیٹھا تھا کہ تیرہ چودہ سال کا ہوتے ہوتے وہ بیڑی بنانے کی مشین میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ نہ اس نے دوسرے لڑکوں کی طرح کیرم بورڈ اور شطرنج کھیلنے کے لیے باہر گلی کے چبوتروں پر بھاگنے کی کوشش کی اور نہ ہی پتنگ اڑانے کے لیے دریا کے کنارے دوڑ لگائی۔ اس کے اس غیر معمولی ذمے داری کے احساس نے اس کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک ایسی پرت چڑھا رکھی تھی جسے چھید کر اس کے من میں کچھ تھاہ لگا پانا نہایت مشکل تھا۔ گھر کا کوئی فرد اس سے ایسی بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا جس کے بارے میں توقع ہوتی کہ اسے پسند نہیں آئے گی۔ آج وہ سب سے چھپ کر پیچھے برآمدے میں رو آیا تھا۔ یہ بات بھی گھر کے دوسرے افراد کے لیے

Scanned with CamScanner

تعجب کی تھی۔ جس لڑکی کو اس نے کبھی گود میں اٹھا کر پیار تک نہیں کیا اس کے لیے وہ روئے گا، یہ کسی کو امید نہیں تھی۔ بہرحال، رونے سے اس کے چہرے کی سختی غائب ہو گئی۔ اس کا چہرہ صاف شفاف نیلے پانی کی طرح ہو گیا تھا جس پر کھنچی دکھ کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ شاید اس کے چہرے کی یہ نرمی تھی جس سے متاثر ہو کر اس کے باپ نے اس سے کہہ ہی دیا:

"پاس بنوائے جائے کے ہے۔"

"کے جائے؟"

"تو اَور کے؟"

"ہم نہ جاب۔"

"کا ہے؟"

پھر وہ خاموشی جس سے سب سراسیمہ ہو جائیں۔ مگر اس بار اس خاموشی کی دہشت کو سعیدہ نے توڑا۔ عام طور سے وہ ساس سسر کے سامنے نہیں بولتی تھی۔ ساس سسر کے سامنے شوہر سے بولنے کی بات تو اَور بھی خیالی تھی، لیکن دکھ نے اسے دنیاداری سے پرے کر دیا۔ وہ ابھی تک اسی سوچ سے نہیں اُبھری تھی کہ اگر اس کے خاندان کے کسی مرد نے ہمت دکھائی ہوتی اور کرفیو میں جا کر دوا لے آیا ہوتا تو شاید اس کی بٹیا بچ گئی ہوتی۔ اب اس کے شوہر کی بزدلی کے کارن بیٹی کی مٹی بھی خراب ہو گی۔ دکھ یا غصے میں اکثر وہ کھڑی بولی بولنے لگتی تھی۔ آج تو دونوں کی کیفیت تھی۔ اس نے اونچی آواز میں آہ و زاری شروع کر دی۔ "ہے مولا، میری بٹیا کو زندہ رہتے دوا نہیں ملی، اور اب مرے کے بعد قبر و نہ نصیب ہو گا کا... ہے مولا، کا ہے اس ابھاگن بٹیا کو اس گھر ما بھیجے..."

سعیدہ کے رونے نے سب سے پہلے اس کے سسر کو توڑا۔ بوڑھا مذہبی آدمی تھا۔ دونوں وقت کی روٹی کمانے سے فرصت پاتا تو روزہ نماز میں لگ جاتا۔ یہ تصور بھی اس کے لیے محال ہو گیا کہ اس کی پوتی کو مذہبی طریقے سے مٹی نہیں ملے گی۔ اس نے گھر والوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ سبھی جھکے، پست چہرے زمین پر نظریں گڑائے بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چرا کر وہ سعیدہ کے رونے کا مقابلہ کر رہے تھے۔

"کون سکھ ملا رہے مور سون چریا کو ای گھر میں آ کے... نہ ڈھنگ سے دودھ ملا، نہ دوا نہ دارو! اب قبرو نہ ملی... کا مورے آکا!"—

بوڑھے کو چھٹپٹاہٹ ہونے لگی۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اسے امید تھی کہ اس کی بیوی تو اسے قوت مدافعت دے گی ہی، لیکن اس کی بڑھیا بھی اس سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ ایک آدھ بار دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں، لیکن ہر بار بڑھیا زمین پر یا خلا میں تاکنے لگی۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی: سات سے کچھ اوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ اس سال پتا نہیں کیا انتظام تھا، لیکن پچھلے کرفیو کے موقعوں کا اسے تجربہ تھا۔ ساڑھے سات بجے کے بعد کوئی کرفیو پاس بنانے والا افسر آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ اگر پاس بنوانا تھا تو فوراً گھر سے نکلنا تھا۔ وہ کمزور ارادے کے ساتھ، تقریباً لڑکھڑاتے ہوئے، اٹھا۔ لگاتار بیٹھے رہنے سے اس کا ایک پیر سُن ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے مالش کر کے اور چٹکی کاٹ کر اس پیر کو جگایا، کیل پر سے اتار کر کُرتا اپنے بدن پر ڈالا، آہستہ آہستہ ایک بیڑی سلگائی اور جھجکتے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

گھر سے باہر گلی میں ٹھوس اندھیرا شانت جھیل کی طرح پھیلا ہوا تھا جس میں پہلا پیر رکھتے ہی وہ پوری طرح اس میں ڈوبتا چلا گیا۔ زندگی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ روز اس وقت یہی گلی آوازوں سے بھنبھناتی رہتی تھی۔ اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ اس وقت بچھنے والی چارپائیوں کا قطاریں غائب تھیں اور روز جس گلی میں آدھی رات تک بنا کسی سے ٹکرائے نکلنا دوبھر تھا وہ آج کسی چوڑی سڑک کی طرح لگ رہی تھی۔

اس گلی میں عام روشنی پہلے بھی فقط کہنے کو تھی اور آج بھی گھروں کے کواڑ بند ہونے کی وجہ سے ان سے گلی میں پڑنے والی روشنی اَور بھی چھَن چھَن کر پڑ رہی تھی۔ ایک طرح سے اندھیرے ہی میں وہ آگے بڑھا، مگر اس کا اسے خوب اندازہ تھا۔ بچپن سے وہ انہیں گلیوں میں پلا بڑھا تھا۔ مکان ضرور اس نے دو تین بدلے تھے لیکن سب اسی علاقے میں تھے۔ گلیاں اندر اندر میلوں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی اجنبی اگر ان میں پھنس جائے تو اسے باہر کی بڑی سڑک پر نکلنے ہی میں گھنٹوں لگ جائیں، لیکن بوڑھے کی یہ جانی پہچانی دنیا تھی۔ اس میں وہ اندھیرے میں بھی تیرتا چلا جا سکتا تھا۔ مگر آج کی بات کچھ اَور ہی تھی۔

آج گلیوں میں خوف پیدا کرنے کی حد تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ جہاں دو تین گلیاں ملتیں یا کوئی گلی سڑک پر نکلتی، وہیں پولیس کے جوان جتھے بنائے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ سیٹی بجاتے یا کوئی دکھائی دے جاتا تو سڑک پر ڈنڈے پٹک کر اسے گالیاں دیتے ہوئے للکارتے۔ پولیس

والوں کے ڈر سے بوڑھے کو کافی لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ اس کے گھر سے کوتوالی مشکل سے ایک کلومیٹر دور تھی لیکن آج چکر لگاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ یہ فاصلہ نہ جانے کتنا بڑھ گیا ہے۔ پولیس والوں سے بچتا بچتا وہ کوتوالی کے ایک دم پچھواڑے پہنچ گیا تھا کہ اچانک پکڑا گیا۔

ہوا یہ کہ گلی میں سے نکل کر اسے بڑی سڑک پر آنا تھا۔ گلی کے اندر سے سڑک کا جو حصہ دکھائی دے رہا تھا وہ بالکل خالی تھا۔ کوئی آواز بھی نہیں تھی۔ لیکن سڑک پر آکر جیسے ہی وہ تین چار قدم آگے بڑھا، گالیوں کی بوچھار اس کے کانوں میں پڑی۔ اس کے بوڑھے جسم نے بھاگنے کی مضحکہ خیز حرکت کی، مگر ایک ڈنڈا اس کے پیروں پر پڑا اور وہ گر پڑا۔ گرنے پر اس نے احساس کیا کہ غلطی کہاں پر ہوئی۔ گلی جہاں کھلتی تھی وہیں ایک دکان کی بنچ پر کچھ سپاہی ایک کھمبے کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھکے، اکتائے ہوئے، وہ اونگھ رہے تھے اس لیے خاموش تھے۔ بوڑھے کو دیکھ کر وہ ہوشیار ہو گئے اور ان میں طراری آگئی۔

پتا نہیں بڑھاپا تھا یا دہشت، بوڑھا گرا تو پھر دیر تک نہیں اٹھا۔ پسینے اور رال نے اس کی داڑھی بھگو دی اور اس کی مغموم ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں سپاہیوں پر ٹکی اگلے ڈنڈے کا انتظار کر رہی تھیں، لیکن اگلا ڈنڈا نہیں اٹھا۔ اس کے بڑھاپے نے سپاہیوں کو بے دل کر دیا۔ جس سپاہی نے ڈنڈا مارا تھا وہی گالیاں بکتا رہا، باقی سب اُوب سے بھرے بیٹھے رہے۔

"مادر—— اس کرفیو میں نکلنے کو کیا ڈاکٹر بتائے رہے؟"

بوڑھا چپ رہا۔ کچھ بولنے کو اس کے ہونٹ کانپے لیکن حلق سے غوں غوں کے سوا کوئی صدا نہیں نکلی۔

"بول سالے، کوئی بم وم تو نہیں چھپائے ہے؟ مُسلوں کا کوئی بھروسا نہیں! دیوان جی، تلاشی لے لوں کیا؟"

"لے لو۔ لیکن پوچھ تو لو کہاں جا رہا تھا۔"

"بول بے! کہاں جا رہا تھا؟"

بوڑھے نے بولنے کی کوشش کی مگر اب بھی اس کی آواز سمجھ میں آنے لائق صاف نہیں ہوئی تھی۔ سپاہی نے اس کا کالر پکڑ کر اسے اٹھا لیا۔ بوڑھے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ملتجیانہ کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر گھبراہٹ اور ڈر سے نکلی آواز سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

Scanned with CamScanner

"بہن ---، بولتا ہے یا دوں ایک رپٹا اور؟" سپاہی نے ہاتھ اٹھایا۔ جڑے ہوئے دونوں ہاتھ بوڑھے نے اپنے منھ کے سامنے کر لیے۔ سپاہی نے بھی مارا نہیں، صرف دھمکاتا رہا۔ تھوڑی دیر میں بوڑھے کے بول صاف پھوٹے:

"سرکار، پاس بنوانے جا رہا۔ گھر میں مٹی پڑی ہے۔ ناتن گزر گئی۔"

"کیا؟" سپاہی تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔

"جھوٹ تو نہیں بول رہا؟ ابھی گھر چل کر دیکھیں گے۔ اگر غلط نکلا تو سالے، ڈنڈا ڈال دیں گے!" دوسرے سپاہی نے کہا۔

"چلو دیکھ لو صاحب، پاس ماگھر ہے۔"

اس پولیس ٹکڑی کا نایک سنجیدہ آدمی تھا۔ وہ ابھی تک زیادہ نہیں بولا تھا مگر بات لمبی کھنچتے دیکھ کر اس نے دخل دیا:

"جانے دو بھیا، غمی کسی پر بھی پڑ سکتی ہے۔"

"کٹوؤں کو بچے پیدا کرنے کے سوا اور کیا کام ہے! سالے چوہے کے بچوں کی طرح پیدا کریں گے اور مریں گے۔ چھوڑو سالے کو۔ بھاگ جا بے! بِنا پاس لیے لوٹا تو سمجھ لے تیرے باپ یہاں بیٹھے ہیں۔ بھاگ... بھاگ جا!"

بوڑھا بھاگنے کی حالت میں نہیں تھا، لیکن لڑکھڑاتے قدموں سے جس رفتار سے وہ چلا وہ اس کی عمر کے لحاظ سے بھاگنے جیسی ہی تھی۔ وہ ایک آدھ بار لڑکھڑایا، گرتے گرتے سنبھلا، اور گرتا سنبھلتا آخر میں کوتوالی کے موڑ پر پہنچ گیا۔

کوتوالی میں پچھلے برسوں جیسا ہی منظر تھا۔ باہر سڑک پر پولیس، پی اے سی اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں پٹی پڑی تھیں۔ پولیس کے جوان بے ترتیب سڑک پر، بند پڑی دکانوں کے چبوتروں، بنچوں اور بنٹیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں کسی بڑے افسر کے آنے پر ان میں ہلچل ہوتی لیکن پھر جلد ہی وہ تھکان اور اُوب کے مہاساگر میں ڈوب جاتے۔ ایک کنارے پر بیٹھی ایک لیڈی مجسٹریٹ کرفیو پاس بنا رہی تھی۔ اس کا کمرہ اور کمرے کے باہر کا برآمدہ مچھلی بازار کی طرح شور سے بھنبھنا رہا تھا۔ کمرے کے باہر اندر دلالوں، نیتاؤں، صحافیوں، خدائی خدمت گاروں، اور مصیبت زدہ لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ پریشان حال لوگ ایک ایک پاس کے لیے گڑگڑا رہے تھے۔ نیتا اور دلال

دھڑادھڑ پاس بنوا کر اپنے اپنے چمچوں کو دیتے جا رہے تھے۔ جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا، جھڑکیاں کھاتے ہوئے ایسے لوگوں کی بھیڑ میں بوڑھا بھی شامل ہو گیا۔

بوڑھا اس ملک ایسے کثیر لوگوں کے گروہ کا حصہ تھا جس کے لیے عزت اور ذلت کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ بے کسی ان کے وجود کا اٹوٹ حصہ بن جاتی ہے۔ زندگی بھر دُھتکارے جاتے، ڈانٹیں کھاتے، ان کا پورا قد انسانی قد سے کافی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ بوڑھا بھی بار بار بھیڑ میں ہچکولے کھاتا، لتاڑا جاتا، دائیں بائیں ہوتا رہا اور آخر میں مجسٹریٹ کی میز تک پہنچ ہی گیا۔

"نام؟ نام بولو، جلدی! اب کیا ایک گھنٹے تک میں تم سے نام ہی پوچھتی رہوں گی؟" مجسٹریٹ کی جھنجھلائی ہوئی آواز نے بوڑھے کو جھنجھوڑا۔

"عبدالرشید... عبدالرشید..."

"وجہ؟"

"جی..."

"جی جی کیا کر رہا ہے؟ پاس لینے کی وجہ کیا ہے؟"

"پوتی مر گئی ہے۔ کل مٹی دینی ہے۔"

"اوہ... کیا عمر تھی اس کی؟" آواز پہلی بار نرم ہوئی۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مری ہوئی پوتی کی عمر یاد کرنے کی اسے ذرا بھی خواہش نہیں ہوئی۔

"کتنے لوگ جائیں گے؟"

"سات آٹھ۔"

"سات آٹھ کیوں؟ دو بہت ہیں۔" آواز پھر چڑچڑاہٹ اور کھسیاہٹ سے بھر اٹھی۔ بوڑھے نے ایسے موقعے پر وہی کیا جو اس دنیا کے لوگ کرتے ہیں۔ پہلے اس نے بحث کرنے کی ناکام کوشش کی، پھر ڈانٹ دیے جانے پر وہ ادھورے لفظوں میں گڑگڑانے لگا۔ کوئی اثر نہ پڑتا دیکھ کر اس نے مجسٹریٹ کے پیر پکڑنے کی کوشش کی۔ آخر میں جھڑکی کے ساتھ وہ تین لوگوں کے لیے کل صبح کا کرفیو پاس مٹھی میں بھینچے کمرے سے باہر نکل گیا۔

راستے بھر اسے دو تین جگہ ٹوکا گیا۔ دو تین جگہ اسے پولیس والے ہی ملے، لیکن کرفیو پاس

Scanned with CamScanner

جنے اس کے دل میں ایک خاص طرح کی خود اعتمادی بھر دی تھی۔ ایک آدھ بار جب پولیس والوں نے کرفیو پاس الٹ پلٹ کر دیکھا، اسے پھاڑ کر پھینکنے کی دھمکی دی یا سچ مچ ہی ہوا میں اُچھال کر زمین پر پھونک دیا، تو اس کی خود اعتمادی ڈگمگائی ضرور، لیکن پھر بھی اس کی بے کسی اور خود اعتمادی نے مل کر ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ دھیرے دھیرے کسی طرح گھر پہنچ ہی گیا۔

گھر پوکھر کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح تھا۔ اس میں اس کے آنے سے ہلکی ہلکی ہلچل شروع ہو گئی۔ سبھی بڑے لوگ جاگ کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک بار ہلکے سے کھٹکھٹانے ہی پر بڑھیا نے دروازہ کھول دیا۔ ایسا لگا جیسے وہ اس کا دروازے سے لگ کر انتظار کر رہی تھی۔ اسے غصہ بھی آیا کہ بِنا نام وام پوچھے بڑھیا نے کیسے دروازہ کھول دیا، لیکن وہ ضبط کر گیا۔

"پاس ملا؟" بڑھیا نے اس کے گھر میں گھستے ہی پوچھا۔

"ہاں ملا۔ تین جنے جائیں گے۔ صبح مولوی صاحب کا دیکھے کا پڑی۔"

"بس تین جنے؟ کیسے کل ہوئی؟"

ساس کی آواز سن کر سعیدہ کچھ چونکی۔ وہ گھٹنوں میں منہ دبا کر بیٹھی تھی۔ اسے لگا کہ شاید اس کا سسر ناکام لوٹا ہے۔ اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

"ہے مولا، ہمری بٹیا کے کا ماٹی بھی نہ ملی..."

"چوپ... سالی... خوب ملی ماٹی۔ من بھر کے ماٹی دے کل!" اس کے شوہر نے اسے بیچ ہی میں ڈپٹا۔ پوری واردات میں اپنی بیوی کے سامنے بزدل ثابت ہو جانے کے احساس نے اسے درندگی کی حد تک وحشی بنا دیا تھا۔ وہ اتنا خاموش طبیعت کا انسان تھا کہ اس نے شاید ہی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ گالی گلوچ کی ہو۔ آج پتا نہیں بیوی کی نظر میں ڈرپوک ثابت ہو جانے کی شرم تھی یا اپنی مرتی ہوئی بیٹی کے لیے کچھ نہ کر پانے کی بے بسی، جس نے اسے وحشی بنا دیا۔ اگر سعیدہ فوراً پوری بات سمجھ کر چپ نہ ہو جاتی تو شاید وہ اسے مار بھی بیٹھتا۔

بوڑھے کے آنے کے بعد خاموش کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے آوازوں کی جو ہلچل ہوئی تھی، وہ جلد ہی دھیرے دھیرے پھر خاموش ہو گئی۔ کمرے کے افراد جنھوں نے کھڑے ہونے یا بیٹھنے کے لیے اپنے پہلو بدلے تھے، پھر سے دیواروں پر پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گئے۔ صرف سعیدہ کی ساس اٹھ کر بکسے الٹ پلٹ رہی تھی۔ کافی محنت کے بعد اسے ایک سفید چادر مل ہی گئی۔ وقت کی

مار نے اسے بدرنگا بنا دیا تھا مگر سعیدہ کی ساس کو لگا کہ اس کے سوا کفن کا کام دینے کے لیے اس کے پاس کوئی اور کپڑا اس وقت نہیں مل سکتا۔ وہ اسی کپڑے کو لے کر قینچی سے کاٹ چھانٹ کرنے لگی۔

رات کو تو بہرحال بیتنا ہی تھا لیکن جاگتی آنکھوں سے یہ قرض کی صورت میں ادا ہو رہا تھا۔ بچی کی لاش کے اردگرد چھوٹے بچے فرش پر لڑھک گئے تھے۔ اگر لاش کا منھ کپڑے سے ڈھکا نہ ہوتا تو یہ بھی ان نیند میں ڈوبے بچوں میں سے ایک ہوتی۔ بڑوں کے پیٹ میں صبح کے بعد پانی کے سوا کچھ نہیں گیا تھا۔ پانی بھی کفایت کے ساتھ خرچ ہوا تھا، اس لیے سب کی آنتیں بھوک سے اینٹھی ہوئی تھیں اور سبھی کے حلق پیاس سے سوکھے تھے۔ یہ روز کمانے اور روز کھانے والوں کا گھر تھا۔ کرفیو لگنے کے دوسرے یا تیسرے دن سے فاقوں کی نوبت آجاتی تھی۔ اگر موت نہ ہوئی ہوتی تب بھی شاید یہی حالت ہوتی۔ وہ سبھی آدھ لیٹے کل کی فکر میں تھے۔ اگر کل بھی کرفیو نہیں ہٹا تو دوسرے وقت تک تو گھر کے بچوں کو بھی فاقہ کرنے کی نوبت آجانے والی تھی۔

ٹمٹماتے بلب کی روشنی میں رات بیتی لیکن بہت دھیمے دھیمے۔ باہر گلی میں دو ایک بار پولیس والوں کے بوٹوں کی آہٹ گونجی۔ ایک آدھ بار دور کہیں ہر ہر مہادیو یا اللہ اکبر جیسی آواز سنائی دی۔ کمرے کے لوگ ایک دوسرے سے آنکھیں چرائے، بہت آہستہ آہستہ حرکت کرتے رہے اور رات ہولے ہولے بیتتی رہی۔

۷

سڑی گرمی کی دوپہری میں تین بجے بجلی چلی گئی اور جلد ہی سفید پوشوں کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ ایک کمرے میں ایک خاتون مجسٹریٹ بیٹھ کر پاس بنا رہی تھی۔ اس کے کمرے میں اتنی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر پلے ہوئے تھے اور ایک کے اوپر ایک گرے پڑ رہے تھے۔ ایسے میں بجلی چلی گئی اور پنکھا بند ہوا تو پسینے اور جھنجھلاہٹ نے کمرے کو چھوٹے موٹے لڑائی کے میدان میں تبدیل کر دیا۔

پنکھا بند ہوتے ہی بغل کے بڑے کمرے میں بیٹھے صحافیوں نے فساد کا تذکرہ چھوڑ کر بجلی کے محکمے کو کوسنا شروع کر دیا۔ انھیں تین بجے ضلعے کے اعلیٰ حکام نے مختصر معلومات دینے کے لیے بلایا تھا۔ ایک تو ساڑھے تین بج چکے تھے اور اعلیٰ حکام ابھی تک غیر حاضر تھے، دوسرے بجلی چلی گئی۔ صحافیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ جو چھوٹے افسران ابھی تک بیٹھے انھیں بہلا رہے تھے، دھیرے دھیرے باہر کھسک گئے۔ صحافیوں نے پریس کانفرنس کے بائیکاٹ کی بات کی اور بنا کسی بے صبری کے بیٹھے رہے۔ آج ان کا اپنا مطلب تھا اس لیے چاہے جتنی بھی دیر ہو وہ اٹھنے والے نہیں تھے۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو ان میں زیادہ تر پیر پٹکتے ہوئے نکل جاتے اور چھوٹے افسران ان کے سامنے گھگھیاتے رہ جاتے۔

تیسری طرف کوتوالی کے آنگن میں ایسے لوگوں کی بِھیڑ تھی جنھیں امن کمیٹی کی بیٹھک کے لیے بلایا گیا تھا۔ یہ سیاست داں، سوشل ورکر، بیوپاری اور ڈاکٹر وکیل جیسے پیشوں سے وابستہ لوگ تھے جو ہر سال فساد کے موقعے پر یا تہوار وغیرہ کے دنوں میں کوتوالی میں بلوائے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے چہرے اور تقریریں اتنی گھِس پِٹ گئی تھیں کہ کوتوالی کی دیواریں بول سکتی ہوتیں تو ان کے کھڑے ہوتے ہی ان کی تقریر دُہرانے لگتیں۔ اس سال بھی فساد شروع ہونے پر پہلے تو افسروں نے حکم جاری کیا کہ ایک پرندہ بھی سڑکوں پر نہ دکھائی دے اور باہر نکلنے والوں کی کھال کھینچ لی جائے۔ بعد میں جب منتریوں کے دورے شروع ہوئے اور یہ شکایت کی جانے لگی کہ عوامی نمائندوں کا اشتراک نہیں لیا جا رہا ہے، تب انھوں نے رات دیر گئے امن کمیٹی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ صبح سے دوپہر تک جلدی جلدی لوگوں کو اطلاع دینے کے لیے سپاہی دوڑائے گئے اور تین بجے کے اجلاس کے لیے ساڑھے تین بجے تک دس پندرہ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اکا دکا لوگ ابھی تک آتے جا رہے تھے، اور آنے کے بعد قریب قریب سبھی لوگ یہی قصہ سناتے کہ کس طرح انھیں دیر سے خبر ملی اور کس طرح انھوں نے فوراً بدن پر کُرتا ڈالا یا چپلیں پہنیں اور بھاگے چلے آئے۔ اس طرح کا اجلاس کبھی وقت پر نہیں شروع ہوا تھا، اس لیے امید تھی کہ اگلے ایک آدھ گھنٹے تک لوگ آتے رہیں گے۔ حکام نے سوچا بھی یہی تھا کہ پریس کانفرنس کے بعد یہ اجلاس شروع ہو جائے۔

بجلی کے جاتے ہی تینوں جتھوں میں بٹے ہوئے لوگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔

اُمس اور پسینے سے تر لوگوں کے لیے بیٹھنا مشکل ہونے لگا۔ پریس کے لوگ اٹھے اور باہر برآمدے میں دو تین گروپوں میں بٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی بات چیت کا خاص موضوع فساد کی شروعات کی وجہ اور فساد میں افسروں کی ناکامی تھا۔

منشی ہر پرشاد پرانے جنگِ آزادی کے سپاہی تھے اور پچھلے بیس برسوں سے راجدھانی سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے کے نمائندہ خصوصی تھے۔ وہ ستر سال کی عمر میں بھی بالکل چاق و چوبند رہتے تھے۔ لوگ انھیں چھیڑتے تھے اور وہ ہر بار کوئی ایسا بے باک تلخ تبصرہ کر دیتے تھے جس سے کوئی نہ کوئی تلملا جاتا اور دوسرے لوگوں کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا۔ آج وہ خاموش بیٹھے تھے اور کئی صحافیوں کی کوششوں کے باوجود کچھ نہیں بولے۔

"کیا بات ہے منشی جی، آج طبیعت کچھ ڈھیلی لگ رہی ہے۔"

"طبیعت سُسری کو کیا ہوا ہے، پر..." منشی جی نے بہت ٹالنے کی کوشش کی لیکن پھر انھیں محسوس ہوا کہ نہ بولنے پر چھیڑخانی ہو گی، اس لیے بولے، "میں سوچ رہا تھا یہ امن کمیٹی کے نام پر جو شنکرجی کی برات کوتوالی میں اکٹھی کی گئی ہے، اگر ان سب کو بند کر دیا جائے تو شہر میں دنگا فساد ابھی رک جائے۔" تیز ہنسی کا فوارہ چھوٹا۔ امن کمیٹی میں حصہ لینے والے جو برآمدے میں کھڑے تھے، ان میں سے کچھ نے نہ سننے کا ناٹک کیا اور کچھ تلملا گئے۔ کچھ، جو زیادہ موٹی چمڑی کے تھے، انھوں نے ہنسی میں ساتھ دیا۔

"انھیں کو کاہے کو بند کرتے ہیں منشی جی! ارے اپنے صحافی ساتھیوں کی بات کیجیے نا، جو چٹخارے لے لے کر خبریں چھاپ رہے ہیں۔ مرے گا ایک، انھیں لاشیں پچیس دکھائی دیں گی۔ پٹاخا چھوٹے گا تو بم چھاپیں گے۔ ہمارے ساتھ ساتھ انھیں بھی بند کیجیے تبھی فساد رکے گا۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر ہنگامہ ہوتا رہا۔ پریس کی آزادی سے لے کر حکومت میں عوام کی حصے داری تک تمام باتیں ہوتی رہیں، لیکن جلد ہی معاملہ ٹھنڈا ہو گیا اور دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے انفرادی ہنسی مذاق کرنے لگے۔ زیادہ تر لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنے کے عادی تھے۔

منشی جی کا من پھر سے کھِن ہو گیا۔ وہ فسادزدہ علاقوں میں آج دیر تک گھومتے رہے تھے اور تشدد کی تباہی کے ننگے ناچ سے بری طرح بے چین تھے۔ صحافیوں اور امن کمیٹی کے لوگوں کے

Scanned with CamScanner

درمیان جو فحش قسم کے مذاق چل رہے تھے، انھوں نے انھیں اور غم زدہ کردیا۔ راجدھانی سے چار اخبار نویسوں کا ایک گروہ آیا تھا جو اپنی پوشاک اور کیمروں کی وجہ سے الگ پہچانا جارہا تھا۔ اپنے کو مقامی صحافیوں سے زیادہ معزز مانتے ہوئے، یہ گروہ الگ کھڑا تھا۔ منشی جی بجھے دل سے اس گروہ کے پاس چلے گئے۔

"منشی جی، اِٹ اِز ہاریبل! اتنی بڑی ٹریجڈی اس شہر میں رونما ہو چکی ہے، پھر بھی ان جرنلسٹوں کے احساسِ خودداری کو کیا ہو گیا ہے؟ کیسے بے شرم ہو کر ہنس رہے ہیں۔"

منشی ہرپرشاد نے آنکھیں سکیڑ کر جینز دھاری لڑکی کو بولتے ہوئے سنا۔ انھیں لگا کہ انھیں قے ہو جائے گی۔ آج یہ لڑکے لڑکیاں ان کے ساتھ گھومتے رہے تھے۔ جلے ہوئے مکان یا ان کے ملبے میں دبے کنگالوں کو دیکھ کر انگریزی میں اپنی تکلیف بیان کرنے والے ان لوگوں نے تیز دھوپ ہو جانے پر انفارمیشن افسر کی جیپ سے کریٹ اتروا کر ایک آدھ جلے مکان کے برآمدے میں بیٹھ کر چِلڈ بیئر پی تھی۔ منشی جی ڈرائیور کی بغل میں بیٹھے غصے سے ہارن بجاتے رہے تھے۔ اب اس لڑکی کو دوسرے بے شرم اور بے حس لگ رہے تھے۔

کامریڈ سورج بھان منشی جی کی دلی حالت بھانپ گئے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے ان کے دوست تھے۔ یہ بات انھیں اچھی طرح معلوم تھی کہ منشی ہرپرشاد صرف قلم گھسیٹ صحافی نہیں تھے؛ خبریں انھیں متاثر کرتی تھیں اور اکثر خبریں جمع کرتے کرتے وہ ان کا حصہ بن جاتے تھے۔ انھوں نے قریب جا کر ملائمت سے منشی جی کا ہاتھ پکڑا اور انھیں ایک دوسرے کونے کی طرف لے گئے۔

برآمدے کے ایک طرف زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے پر لوگوں کا دھیان اُدھر منتقل ہو گیا۔ کھیم چند جگل کشور نامی فرم کے مالک لالہ رادھے لال چڑائے جانے پر کسی زخمی ناگ کی طرح پھنکار رہے تھے:

"ٹھیک ہے، فساد میں اناج کی قیمتیں بڑھیں گی تو میرا فائدہ ہو جائے گا، لیکن فائدہ کے کا مٹا ہے؟ میں اتنا گنہگار نہیں ہوں کہ اپنی بِکری بڑھانے کے لیے خود فساد کرا دوں۔ آپ تو شرما جی، یہ بھی کرا سکتے ہیں۔ آپ کو پاکستان اور مسلم لیگ کے جھنڈے میں فرق نہیں معلوم ہے۔ خلد آباد کی مسجد کی بغل میں مسلم لیگ کا دفتر ہے۔ پھر بھی آپ نے مسلم لیگ کے دفتر پر

لہرانے والے جھنڈے کی تصویر چھاپ کر یہ کیپشن دیا کہ مسجد پر پاکستانی جھنڈا لہرایا گیا ہے۔ اب بتائیے، فساد آپ کرار ہے ہیں کہ ہم؟"

"لیکن گرو! فساد شروع ہونے پر منافع تو تم ہی کماؤ گے۔"

"ہاں، اب جنتا سالی گدھی ہے، دنگا کرتی ہے، تو چار پیسے ہم بھی کما لیتے ہیں۔"

لوگ ہنسے اور پھر ذاتی قسم کے مذاق ہونے لگے جس سے فضا کا بوجھل پن گھٹنے لگا۔

ان دونوں طرح کی بھیڑ سے الگ تیسری قسم کی بھیڑ تھی جو بجلی چلی جانے کے باوجود کمرے سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہ کرفیو پاس بنوانے والوں کی تھی جو ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک خاتون مجسٹریٹ اور دو تین اہلکاروں سے اُلجھی ہوئی تھی۔ مجسٹریٹ ایک نوجوان لڑکی تھی جو ابھی نئی نئی نوکری میں آئی تھی۔ نئی ہونے کی وجہ سے ابھی وہ اپنے دوسرے ہم پیشہ افسروں کی طرح بے حس نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کے دل میں کچھ آدرش واد باقی تھا۔ وہ کچھ کام کرنا چاہتی تھی اور جنتا اس کے لیے پوری طرح سے فضول چیز نہیں ہوئی تھی، اس لیے پسینے سے بالکل لت پت ہونے پر بھی وہ اپنے کام میں جُٹی ہوئی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ جھنجھلا ضرور جاتی تھی لیکن اس کی انگلیاں رُک نہیں رہی تھیں۔ اس کے عملے نے دو ایک بار گرمی یا اُمس کی دُہائی دی لیکن مجسٹریٹ کی بے رُخی کی وجہ سے انھیں باہر جانے کا موقع نہیں ملا۔

امن کمیٹی میں آئے ہوئے لوگوں میں کچھ سیاسی لیڈر تھے۔ میونسپلٹی کے چناو قریب تھے۔ باہر آنے پر انھیں پاس بنوانے والوں میں اپنے ووٹر نظر آ گئے۔ انھوں نے اپنے اپنے ووٹروں کو پکڑا اور ان کے پاس بنوانے کے لیے پل پڑے۔ ان کے آ جانے سے سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ مجسٹریٹ کی آواز زیادہ جھنجھلانے لگی۔ ایک دوسرے کو ڈھکیلتے اور شور مچاتے لیڈروں کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ کمرے میں اُمس زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس نے اچانک اپنی فائلیں بند کیں اور اعلان کیا کہ بجلی آنے پر کام ہوگا۔ اس کے ماتحتوں کو موقع ملا، وہ سرپٹ کمرے سے نکل بھاگے۔

مجسٹریٹ کے عورت ہونے کے خیال سے لیڈر لوگ پہلے تو سٹپٹائے، پھر ایک دم سے بلا شروع ہو گیا۔

"افسر شاہی نے دیش برباد کر دیا صاحب! پہلے دنگا کراتے ہیں، پھر جنتا کے ساتھ جانوروں کی طرح پیش آتے ہیں۔"

"ابھی دنگا ہو تو ان کی انکم تو اَور بڑھ جاتی ہے۔ بانٹیے رِلیف، کمائیے پیسا! ہمیں نہیں پتا یہ کل سے جو دودھ بٹ رہا ہے اس کی ملائی کہاں جا رہی ہے!"

"ارے۔نہیں دیجیے سو روپیا ایک پاس کا، سب بن جائے گا۔ بجلی رہے نہ رہے!"

"کیا... کیا کہا؟ میں پیسا مانگ رہی ہوں؟" مجسٹریٹ کا منھ تمتما گیا۔ وہ کچھ اَور کہنا چاہتی تھی پر اس کی آواز رُندھ گئی۔ اس کے چپراسی اور ماتحتوں نے دو ایک پولیس سپاہی بلا لیے اور ان کی مدد سے اسے بغل والے کمرے میں لے گئے۔

مجسٹریٹ نئی تھی اور اس لیے اس طرح کی کیفیت جھیلنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیڈر لوگ پرانے تھے، انھیں پتا تھا کہ بِھیڑ بن کر کس طرح افسروں کو ہُوٹ کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں پریشان اور دُکھی لوگوں کا جتھا تھا جنھیں پتا نہیں چل پا رہا تھا کہ انھیں کرفیو پاس کب ملے گا۔ ان میں سے کسی کا بچہ بیمار تھا، کسی کو اسٹیشن جانا تھا۔ یہ لوگ کمرے میں اِدھر اُدھر بکھر کر بیٹھ گئے۔ انتظار کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

"ایکسکیوزمی، منشی جی، یہ جھنڈے کا کیا معاملہ ہے؟" دلّی سے آئے ہوئے پریس کے لڑکے لڑکیوں نے منشی جی کو گھیر لیا۔

"جھنڈا؟ کیسا جھنڈا؟" منشی جی نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"ابھی کوئی کہہ رہا تھا نا کہ یہاں لوکل پریس نے مسلم لیگ کے جھنڈے کو پاکستانی جھنڈا بنا کر چھاپ دیا تھا؟"

منشی جی مقامی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، اس لیے جواب دیا سورج بھان نے:

"بھائی، معاف کیجیے گا آپ کا نام نہیں معلوم، لیکن آپ جو بھی ہوں اتنا سن لیجیے کہ آپ کے راجدھانی کے اخباروں نے بھی کم غدر نہیں ڈھایا ہے۔ ہر دنگے میں آپ لوگ پاکستانی ہاتھ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے کوئی دنگا ایسا نہیں ہوا جس میں مسلمان زیادہ نہ مارے گئے ہوں، لیکن آپ لوگ ہمیشہ ایسی خبریں چھاپتے ہیں جن سے لگتا ہے کہ ہندوؤں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ اگر مسلمان پی اے سی کی زیادتی کی شکایت کرتے ہیں تو وہ آپ کو غدار نظر آنے لگتے ہیں۔ لوکل پریس والے آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مسجد کی بغل میں مسلم لیگ کے دفتر پر اس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ تھوڑی سی ٹرِک فوٹوگرافی سے جھنڈا مسجد پر پہنچ گیا۔ نیچے یہ کیپشن دینے میں ان کا کیا

جاتا ہے کہ جھنڈا پاکستانی ہے۔ اب اس بات سے اگر شہر کا تناؤ کچھ بڑھ گیا تو اخبار والوں کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ دلّی سے لکھنؤ تک اخباروں کے دفتروں میں زیادہ تر پینٹ کے نیچے ہاف پینٹ پہننے والے لوگ ہیں۔"

"منشی ہر پرشاد نے کامریڈ سورج بھان کا ہاتھ دبایا اور انھیں ایک کونے میں لے گئے۔ راجدھانی والے ان کے حملے سے کچھ بوکھلا گئے۔ وہ جواب دینا چاہتے تھے لیکن کامریڈ کے ہٹ جانے سے تلملا کر رہ گئے۔

بجلی اور اعلیٰ حکام ایک ساتھ آئے۔ ایک کمرے میں پریس کانفرنس شروع ہوئی۔

"مرنے والوں کا ٹوٹل کتنا پہنچا؟"

"سترہ۔"

"نہر میں کتنے بہا دیے گئے؟"

"مرنے والوں کی گنتی کیسے کرتے ہیں؟"

"مردہ خانے میں پوسٹ مارٹم کے لیے جتنی لاشیں پہنچی ہیں..."

"پر جو پہنچ ہی نہیں پائیں، جنھیں نہر میں بہا دیا گیا، ان کا..."

ٹھنڈے کی بوتلیں، برفی اور سموسے آ گئے۔ بیچ بیچ میں شکوے شکایتیں ہوتی رہیں کہ پریس کو کرفیو پاس دینے میں دیر کی گئی، کرفیو زدہ علاقے کے دورے کے لیے محکمۂ اطلاعات کو دھکا مار جیپ مہیّا کرائی گئی، اسے بھی دلّی پریس لے کر گھومتا رہا، لوکل پریس والے ٹاپتے رہے، وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ شکایتیں ہوئیں تو سموسے اور منگا لیے گئے۔

"دنگا وَنگا تو چلتا رہے گا، پریس کالونی کا کیا ہوا؟ دنگے کی وجہ سے لیٹ تو ہو گیا ہے، لیکن دنگا ختم ہوتے ہی الاٹمنٹ ہو جانا چاہیے۔"

"ہو جائے گا۔ دنگا نہ ہوتا تو اب تک ہو گیا ہوتا۔ زمین تو طے ہو گئی ہے، ایک دم سول لائنز کے بیچ میں ہے۔ بس پلاٹ کٹنا ہے۔ دنگا ختم ہوتے ہی کٹ جائے گا۔"

کچھ صحافیوں نے اب تک پلاٹ کے لیے درخواستیں نہیں دی تھیں۔ انھوں نے شور مچایا کہ انھیں آخری تاریخ کا پتا نہیں چلا۔ انھیں بتایا گیا کہ وہ پچھلی تاریخ میں درخواست دے دیں۔ ان میں سے کئی نے کاغذ پھاڑا اور درخواست لکھنے بیٹھ گئے۔

Scanned with CamScanner

صحافیوں کو حکام نے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر کے سمجھا دیا کہ کیسی رپورٹنگ کرنی ہے۔

منشی ہرپرشاد اور کامریڈ سورج بھان باہر نکل آئے۔ کامریڈ سورج بھان تو زبردستی پریس کانفرنس میں بیٹھ گئے تھے؛ انھیں امن کمیٹی کے اجلاس میں بلایا گیا تھا۔ وہ اُدھر چلے گئے۔ ساتھ میں منشی ہرپرشاد کو لیتے گئے۔ وہاں ابھی دیر تھی۔ زیادہ تر حصہ لینے والے باہر گھوم رہے تھے۔ کوئی پاس بنوانے لگا تھا تو کوئی پریس کانفرنس والے کمرے میں تاک جھانک کر رہا تھا۔ جب تک حکام لوگ امن کمیٹی کے پنڈال میں نہ آجاتے تب تک یہی ہونا تھا۔

دونوں ایک کونے میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ ان کے ارد گرد اور لوگ بھی آ گئے اور پھر بات چیت فساد کی شروعات، مرنے والوں کی تعداد اور نقصانات پر مرکوز ہو گئی۔

"دنگا کسی نے شروع کیا ہو،" کامریڈ سورج بھان غمزدہ لہجے میں بولے، "ایک بات اب بڑی صاف دکھائی دینے لگی ہے۔ آزادی کے وقت بھی دنگے ہوتے تھے تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہوا کرتی تھی جو دنگا کرانے والی طاقتوں کے خلاف کھڑے ہوتے تھے۔ اب ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔"

"اجی، اب تو پڑوسی بھی پڑوسی کو نہیں بچاتا۔ پہلے کم سے کم پڑوسی کا یہ بھروسا رہتا تھا کہ وہ حملہ نہیں کرے گا، لیکن اب تو یہ بھی نہیں رہا۔"

"رام پال سنگھ پرانے کمیونسٹ ہیں۔ پچھلے بیس سال سے کارڈ ہولڈر ہیں۔ ان کا لڑکا دنگے میں مارا گیا۔ میں ماتم پرسی کرنے گیا تو دنگ رہ گیا۔ اتنا بڑا آدمی فرقہ پرست ہو گیا۔ کھلے عام مسلمانوں کے خلاف بول رہے تھے۔ میں نے کہا بھی کہ کامریڈ، تمھیں مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ ان طاقتوں کے خلاف بولنا چاہیے جو فساد کراتی ہیں، لیکن کون سنتا ہے۔ اس وقت تو لگتا ہے پورا شہر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بٹ گیا ہے۔"

منشی ہرپرشاد نے کامریڈ سورج بھان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ان کا درد سمجھ رہے تھے۔ وہ کئی دنوں سے کامریڈ کو رات رات بھر اپنے ساتھیوں سے اُلجھتے دیکھ رہے تھے۔ اکثر رات کو کامریڈ سورج بھان ان کے گھر آتے اور غمزدوں کی طرح آہ و زاری کرنے لگتے۔

"سب کچھ ختم ہو رہا ہے منشی جی، ایسے ایسے ساتھی فرقہ پرست ہو گئے ہیں جو پچھلے بیسیوں

سال سے اس کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔"

منشی جی سنتے اور خاموشی سے سر ہلاتے رہتے۔ وہ خود دیکھ رہے تھے کہ جو لوگ پچھلے دنگوں میں بڑھ چڑھ کر امن مارچ میں حصہ لیتے تھے یا اختلافات کے خلاف اپنے اپنے محلوں میں لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، وہ بھی ہندو یا مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ حال ہی کے دنوں میں ممکن ہوا تھا کہ پڑوسی کا پڑوسی پر سے یقین ہٹنا شروع ہو گیا تھا۔ پہلی بار انہوں نے دیکھا کہ پڑوسیوں نے پڑوسیوں پر حملہ کیا اور ان کے گھروں میں لوٹ پاٹ کی۔ شاید پچھلے کچھ برسوں سے دونوں فرقوں کے درمیان لگاتار بڑھتے ہوئے زہر کا اثر تھا جس نے آخر کار یہاں تک پہنچا دیا تھا۔

افسروں کے پنڈال میں آتے ہی امن کمیٹی کے جو لوگ باہر گھوم رہے تھے، دھیرے دھیرے اندر آنے لگے۔ پریس کانفرنس ختم ہونے کی وجہ سے اخبار والوں میں سے بھی کچھ اس پنڈال میں آ گئے۔

"عزت مآب ضلع مجسٹریٹ، شریمان کپتان صاحب، ہمارے درمیان موجود افسرانِ والا، اس شہر کے معزز شہری بہنو اور بھائیو، جس طرح ہر اجلاس کے لیے صدارت کی ضرورت ہے، میں مکرجی دادا کا نام اس اجلاس کی صدارت کے لیے پیش کرتا ہوں۔"

"ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔"

جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی مکرجی دادا صدارت کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ برسوں سے ان اجلاسوں کی صدارت کر رہے تھے، اس لیے پہلے سے تیار ہو کر آتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی اب اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ صدارت قبول کرنے کے اس تماشے کو ایک ضروری حرکت کے طور پر قبول کرنے لگے تھے۔

مکرجی دادا کے ایک طرف کلکٹر اور دوسری طرف کپتان بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر دو ممبر اسمبلی اور ایک ممبر پارلیمنٹ بھی بیٹھ گئے تھے۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ ان صاحب نے صدارت کے لیے نام پیش کیا تھا وہ، ماجد صاحب، پیشے سے وکیل اور کو توالی کے جلسوں کے مقامی منتظم تھے۔ انہوں نے مائیک ہاتھ میں لیا اور شروعات اپنی تقریر سے کر ڈالی۔ لوگ ان کی اسی عادت سے اُوبتے تھے۔ وہ کسی مقرر کو بلانے سے پہلے کافی لمبی تمہید باندھا کرتے تھے۔ شعروشاعری سے بھری اپنی تمہید کے بعد وہ اگلے مقرر کو بلاتے اور اس کے مائیک پر آتے آتے اسے تین چار بار

وقت کا دھیان رکھنے کی ہدایت کرتے۔ بہت کم مقررین ان کی اس صلاح پر دھیان دیتے۔ اکثر تو مقررین اور ان میں مائیک کی چھینا جھپٹی ہو جاتی۔

آج بھی ماجد صاحب نے کئی شعر سنائے اور بیٹھے ہوؤں کو یاد دلایا کہ چمن کو سُرخ لہو کی نہیں بلکہ سُرخ پھولوں کی ضرورت ہے۔ جب لوگ کافی بور ہو گئے اور آوازے کسنے لگے تب انھوں نے مقررین کو بلانا شروع کیا۔

اسٹیج کے پیچھے قنات لگی تھی۔ اس قنات سے ہٹ کر چار پانچ مجسٹریٹ اور پولیس افسر کرسیوں کو اس طرح ڈالے بیٹھے تھے کہ ان کی کھسر پھسر اسٹیج پر بیٹھے ان کے اعلیٰ افسروں تک نہ پہنچے۔ جب بھی کوئی مقرر پوری سنجیدگی سے شہر کو جلنے سے بچانے کی اپیل گلا پھاڑ پھاڑ کر کرتا، یہ لوگ اس کی ماں بہن کرنے لگتے۔

"سالا یہاں امن کا اُپدیش دے رہا ہے، اپنی گلی میں جا کر چھرے بانٹے گا۔"

"انھیں سالوں کو بند کر دو تو دنگا اپنے آپ رک جائے گا۔"

"پر کیسے کر دیں؟ افسران انھیں داماد کی طرح کوتوالی میں بلا کر چائے سموسا کھلاتے ہیں۔"

"افسران کیا کریں! نہ کھلائیں تو منتری ڈنڈا کر دے گا۔"

ان کی آواز یا ہنسی کبھی تیز ہو کر اسٹیج کی کرسیوں سے ٹکرانے لگتی۔ کوئی اسٹیج پر سے آنکھیں تریر کر دیکھتا اور یہ لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ دبا کر تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی کھلکھلاہٹ یا آواز پھر سے بھنبھنانے لگتی۔

"بھائیو! جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، ہمارے دیش کی نوکرشاہی کو ہماری یاد تبھی آتی ہے جب حالات ان کے کنٹرول سے باہر ہو جاتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جب وقت گلشن کو پڑا لہو ہم نے دیا، اور جب آج بہار آئی ہے تو پوچھتے ہیں، تم کون ہو؟ پہلے ہمیں یہاں بلایا نہیں گیا۔ بہر حال، اب جب بلا ہی لیا گیا ہے تو بتا دیتے ہیں کہ دنگا کیسے کنٹرول ہو گا..."

"ضرور بتاؤ بیٹا! تم نہیں بتاؤ گے تو دنگا کنٹرول کیسے ہو گا!"

پیچھے کی کرسیوں سے کی گئی یہ سرگوشی اتنی تیز تھی کہ مقرر کے سوا سبھی نے سنا۔ اسٹیج پر بیٹھے حکام مسکرائے۔ اگلی قطاروں میں بیٹھے لوگوں میں سے کچھ نے دانت نکال دیے لیکن مقرر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ جو بھائی پولیس اور پی اے سی کے خلاف بول رہے ہیں وہ ہمارے دیش کی قوت توڑ رہے ہیں۔ وہ سی آئی اے اور فلسطین کے ایجنٹ ہیں..."

"فلسطین؟ یہ فلسطین کب سے آگیا دنگا کرانے؟"

"میرا مطلب ہے فلسطین نہیں بلکہ چین... میرا مطلب ہے جاپان..."

"ابے تیرے مطلب سے ہمیں کیا لینا دینا!"

ہنگامہ ہو گیا اور تھوڑی دیر میں سکون ہو گیا۔ اگلا مقرر بلا لیا گیا۔ اس طرح کے جلسوں میں تو ایسے ہنگامے ہوتے ہی رہتے تھے، لہذا کسی نے زیادہ پروا نہیں کی۔

بولنے والے کو چھوڑ کر کسی کو کسی تقریر سے دل چسپی نہیں تھی۔ کبھی کسی شعر یا چٹکلے پر بھلے دوسروں کا دھیان ملتفت ہو جائے، نہیں تو بولنے والے اور سننے والے اپنی اپنی رو میں بہے جا رہے تھے۔

پنڈت ایودھیا ناتھ دیکشت شہر کے ممبر اسمبلی تھے، اسٹیج پر حکام کے ساتھ بیٹھے تھے، لیکن اپنی تقریر ختم کر کے نیچے چلے گئے تھے۔ وہ پریشان تھے کیوں کہ یہ دنگا ان کے سیاسی کریئر کے لیے خطرناک تھا۔ پچھلے چناو کے وقت بھی دنگا ہوا تھا، لیکن اُس وقت دنگا ان کے فائدے میں گیا تھا۔ اِس وقت ان کے پرانے حریف رام کشن جیسوال فساد کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چناو بالکل سر پر تھا۔ انھیں پورا شک تھا کہ دنگا رام کشن جیسوال ہی نے کرایا ہے۔ رام کشن تھا تو پورا ہندووادی لیکن حاجی بدرالدین بیڑی والے سے اس کی پٹتی بھی خوب تھی۔ پورا شہر جانتا تھا کہ جیسوال اور حاجی جب مل کر چاہیں، شہر میں فساد ہو جائے گا۔ چناو کے وقت فساد ہونے سے خطرہ یہی تھا کہ ووٹر ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ مسلمان حاجی بدرالدین کے پیچھے غول بند ہوں گے تو ہندو بھی کسی ہندو نیتا کی تلاش میں جیسوال کی موافقت میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ اِس چکر میں مارے جائیں گے پنڈت ایودھیا ناتھ دیکشت۔

دیکشت جی اسٹیج سے اتر کر ایک کونے میں کھڑے ہو کر اپنے حامیوں سے بات چیت کرنے لگے۔ بات کم کر رہے تھے، رام کشن جیسوال کی تگڑم بازی پر دھیان زیادہ رکھ رہے تھے۔ سالا کیسے کلکٹر سے مسکرا مسکرا کر بات کر رہا ہے۔ اس کلکٹر سے بھی نپٹنا ہے۔ کم بخت نے جیسوال کو نیچے سے بلا کر اسٹیج پر بٹھا لیا۔ چناو کے اعلان سے پہلے ہٹوانا ہے۔ بدمعاش جانتا نہیں کہ

فساد رام کشن جیسوال اور حاجی بدرالدین نے مل کر کروایا ہے۔ میں نے منع کیا تھا کہ ان لوگوں کو امن کمیٹی کے اجلاس میں نہ بلایا جائے۔ پھر بھی نالائق نے نہ صرف دونوں کو بلایا بلکہ اسٹیج پر اپنے پاس بٹھایا ہے۔ اس لیے دیکشت جی نے آج تقریر میں ضلعی انتظامیہ کی کافی کھنچائی کر دی۔ کہیں کوئی رِلیف تقسیم نہیں ہوئی۔ پورا شہر گندگی سے بجبجا رہا ہے اور ضرورت کا سامان نہ ملنے سے فریاد در فریاد کر رہا ہے۔ دیکشت جی یہ بھول کر کہ وہ کسی اجلاس میں شریک ہیں، زور زور سے اپنے حامیوں کے درمیان ضلعی انتظامیہ کو کوسنے لگتے ہیں۔

دیکشت جی کی پریشانی سے رام کشن جیسوال اور حاجی بدرالدین بیرٹھی والے دونوں کو مزہ آ رہا ہے۔ دونوں بیچ بیچ میں ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھ مارتے ہیں۔ دونوں زبردستی مسکرا مسکرا کر کلکٹر سے بات کرتے ہیں۔ دیکشت جی دور سے دیکھ کر دانت پیستے ہیں۔ اس کلکٹر کو تو دنگا ختم ہوتے ہی ہٹوانا ہے۔ کلکٹر بھی اس موقع شناسی کو سمجھ رہا ہے، اس لیے وہ کنکھیوں سے دیکشت جی کو دیکھتے ہی جیسوال اور حاجی دونوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن دونوں زبردستی جھک کر باری باری اس کے کان میں کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے مجبوراً سر ہلانا پڑتا ہے۔

کلکٹر نے اپنی جگہ بدلنی چاہی۔ وہ جیسوال اور حاجی سے دور بیٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اسٹیج کے کنارے پر پولیس کپتان بیٹھا تھا۔ اس نے کپتان کو اشارہ کر کے جگہ بدلنے کی کوشش کی لیکن کپتان نے اس کا اشارہ سمجھنے سے انکار کر دیا۔ دراصل اسے کلکٹر کی پریشانی میں مزہ آ رہا تھا۔ کلکٹر نے پچھلے کئی دن سے اسے دُکھی کر رکھا تھا۔ وزیروں سے اس کی شکایتیں کی تھیں کہ پولیس اسے پورا تعاون نہیں دے رہی ہے۔ اپنے بھروسے کے اخبار نویسوں کے ذریعے اس نے پولیس کے خلاف خبریں پلانٹ کرائی تھیں، اس لیے کپتان نے بھی آج سے اپنے خاص صحافیوں کو بریف کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایودھیاناتھ دیکشت صاحبِ اقتدار ممبر اسمبلی تھے۔ اُن کا استعمال کلکٹر کے خلاف ہو سکتا ہے، یہ کپتان کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے دھیرے سے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر اس کے کان میں کہا کہ دیکشت کو جا کر اس اجلاس کے بعد ملنے کو کہے۔ ماتحت اس کا حکم بجا لایا۔ کلکٹر نے کپتان کی سرگوشی اور ماتحت کا دیکشت تک جانا دیکھا۔ اس نے کپتان سے نپٹنے کے لیے نئی بساط بچھانی شروع کی۔

مقررین کی تقریریں اتنی دیر تک چلیں کہ جو بولنے کو رہ گئے تھے انھیں چھوڑ کر سب کی

قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ جنھوں نے اجلاس بلایا تھا وہ بھی بور ہو گئے۔ اسٹیج پر بیٹھے دو تین لوگوں نے ماجد صاحب کو بلا کر ان کے کان میں کچھ کہا۔ ماجد صاحب نے ہر بار سر ہلایا لیکن ہر بار مائیک خالی ہوتے ہی پہلے اپنے دو تین شعر سنائے، پھر دوسرے مقرر کو بلایا۔ آخر میں کلکٹر نے ماجد صاحب سے سختی سے کچھ کہا اور انھوں نے صدر کو صدارتی تقریر کے لیے مدعو کیا۔ جو لوگ تقریر کرنے سے رہ گئے تھے انھوں نے ہنگامہ کر دیا۔ تھوڑی دیر تک شور شرابے میں کچھ سنائی نہیں دیا۔ اسی افراتفری میں ایک آدھ لوگ آئے اور تقریر کر کے چلے گئے۔ بڑی مشکل سے صدر نے کھڑے ہو کر مائیک پر قبضہ کیا۔

صدر مکرجی دادا کی تقریر لوگ پچھلے کئی برسوں سے سنتے آرہے تھے۔ آج بھی انھیں پتا تھا کہ کہاں وہ لطیفے سنائیں گے، کہاں تالی بجانی ہے اور کہاں "شیم شیم" کی آواز لگانی ہے۔ ایک آدھ جگہ وہ بھول گئے تو حاضرین نے انھیں یاد دلا دیا۔ بہر حال، ان کی تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی لوگ کھڑے ہو گئے اور ان کے آخری الفاظ کرسیوں، قدموں اور لوگوں کی آواز میں دب گئے۔ بغل میں ایک شامیانے میں چائے ناشتے کا انتظام تھا۔ لوگ اس میں دھنس گئے۔

چائے پان کے دوران چاپلوسی اور خوشامد کے دور چلتے رہے۔ نیتا، افسر، صحافی اور سوشل ورکر بغض، حسد اور جلن کے ساتھ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے ہر موقعے کا استعمال کرتے رہے۔ فساد تو ہر دوسرے تیسرے سال ہونا ہی تھا، اس کے بارے میں بہت فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی بھی دھوکا دھڑی کے چھوٹے سے چھوٹے موقعے پر چوکنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے سبھی نے اس موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

۸

تلاشیاں جاری تھیں۔ ہر دو تین برس میں اس کی نوبت آتی تھی، اس لیے سب کچھ کافی حد تک حسبِ معمول سا تھا۔ جس سال فوج آجاتی تھی اس سال فوج کے ذریعے، نہیں تو بی ایس ایف، سی آر پی، جو بھی تعینات ہو، اس کے ذریعے، شہر کے پاکستانی حصے کو گھیر کر سول پولیس اور پی

اے سی کے لوگ تلاشیاں لیتے تھے۔ افسروں کو پورا یقین رہتا تھا کہ فسادِ اسی حصّے کے لوگ کرتے ہیں، اس لیے تلاشیاں انھیں علاقوں کی ہوتی تھیں۔ کسی کسی سال جب مرنے والوں میں یہیں کے لوگ ہوتے تھے تب بھی یہ تلاشیاں صرف انھیں محلوں کی ہوتی تھیں۔ اس بار بھی مرنے والے سبھی لوگ یہیں کے تھے، مگر افسروں نے شہر کے پاکستانی حصے کی تلاشی کے طریقِ کار کا تعین کر کے رات ڈیڑھ بجے سے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

اس دن بھی اس بھری سڑی گرمی کے پسینے میں نہایا ہوا شہر اس وقت ہلکی ٹھنڈی بیار کی خوش فہمی کا شکار ہو چکا تھا۔ صرف وہ لوگ جنھیں دن بھر کمانے کے بعد ہی رات میں کھانا ملتا ہے اور جن کی بھوکی آنتوں کی اینٹھن نے نیند کو ان آنکھوں سے دور بھگا دیا تھا، آدھے سونے آدھے جاگنے کی حالت میں تھے۔ باقی پورے علاقے میں سوتا پڑا ہوا تھا۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک تو ضرور ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعرے ہر طرف بہتے ہوئے گھروں کی چھتوں سے ٹکراتے رہے تھے، مگر ایک گھنٹے سے ان کی رفتار بھی کم ہوتے ہوتے قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ یہ نعرے عجیب طرح کا جوش اور خوف پیدا کرتے تھے اور ہر گھر کے رہنےوالوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پڑوس ہی میں کوئی حملہ آور بھیڑ یہ نعرے لگا رہی ہو۔

ڈیڑھ بجے کے بعد گلیوں کے باہر بڑی سڑکوں پر گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ گاڑیوں کی ہیڈلائٹس سے سڑکوں اور گلیوں کے اندھیرے کونے روشن ہو گئے۔ روشنی کے کچھ جھونکے لوگوں کی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے ہو کر اندر گھروں میں بھی پہنچے۔ خوف زدہ ہاتھوں نے جلدی جلدی پلنے بھیڑ دیے۔ اس کے بعد شروع ہوا بوٹوں کا مترنم شور۔ ٹرکوں سے کود کود کر جوانوں سے پوزیشن لینی شروع کی۔ رات کے سناٹے میں بوٹوں کی آوازیں ایک خاص طرح کی سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ گھروں میں نیم غنودہ لوگ آنے والی مصیبت کے لیے تیار ہونے لگے۔

کھٹ کھٹ کھٹ... "کھول بے! ... ابے کھول دروازہ! سالے کہاں اپنی ماں کی گود میں سوئے بیٹھے ہیں۔ کھولتا ہے دروازہ کہ توڑ دوں؟"

آوازیں، صرف آوازیں پورے ماحول میں بکھر گئیں۔ آوازیں ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے کی تھیں، آوازیں بوٹوں سے دروازوں پر ٹھوکر مارنے کی تھیں، آوازیں بچوں کے رونے اور عورتوں

کے چیخنے کی تھیں، آوازیں کندوں کے پیٹھ یا پیر پر ٹکرانے کی تھیں، آوازوں میں گالیاں، سسکیاں اور گڑگڑاہٹ بھری تھی۔ یہ آوازیں اچانک پیدا ہوئیں اور انھوں نے پورے ماحول کو متھ ڈالا۔

"اتنی دیر تک دروازہ پیٹتے رہے، اب جا کر دروازہ کھولا! اندر اسلحہ چھپا رہے تھے؟"
!—— بہن

"بولتے کیوں نہیں سُسر، اب زبان میں تالا لگ گیا ہے!"

کمرے کے فرش پر بچے نیند میں گم بکھرے تھے اور بالغ افراد دہشت سے حیرت زدہ خاموش بیٹھے تھے۔ دروازہ ٹوٹتے ہی بھڑبھڑا کر ڈھیر سارے لوگ بندوقوں کے ساتھ اندر گھس آئے۔ مردوں نے عادتاً اپنے ہاتھوں سے سر ڈھک لیا۔ انھیں توقع تھی کہ اب ڈنڈوں، بوٹوں اور بندوق کے بٹّوں سے ان کی پٹائی شروع ہو گی۔ پٹائی شروع ہو گئی ہوتی لیکن ایک عورت کی چیخ نے پورے کمرے کی رُکی ہوئی ہوا میں کپکپی پیدا کر دی۔

"ہے مولا! اب بٹیا کی لہاش بوٹن تلے روندی جائے گی!"

کمرے میں گھستے ہوئے لوگ چاروں کونوں میں پھیلنے کے چکر میں نیچے قریب قریب لیٹے ہوئے بچوں کو کچلنے میں مصروف تھے۔ بچوں کے بیچ میں چادر سے ڈھکی ہوئی لاش تھی۔ جیسے ہی کوئی بوٹ اس پر پڑنے کو ہوا، سعیدہ کی چیخ نکل گئی۔

"کیا بکتی ہے! کس کی لاش ہے؟"

سعیدہ نے جواب دیے بنا رونا جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ساس اور نند نے بھی رونا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے بڑی مشکل سے وضاحت کی۔ بڑبڑاتے ہوئے سارے بوٹ باہر نکل گئے۔ دروازہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ بوڑھے نے ٹوٹے ہوئے دروازے کے پلّوں کو بھیڑ کر ان پر ایک ٹوٹی میز ٹکا دی۔ باہر کا منظر ضرور ان ٹوٹے پلّوں سے اوجھل ہو گیا، لیکن آوازیں آتی رہیں۔

"اس بکسے میں کیا ہے؟ کھول... کھول اسے بھی!"

"حضور، مائی باپ، لڑکی کے زیور گریاں ہیں۔ اسی جاڑے میں شادی کرنی ہے۔"

"کھول تو۔ دیکھیں تبھی تو پتا چلے گا کہ زیور ہیں یا بم چھپا کر رکھا ہے۔ تم لوگوں کا کوئی

بھروسا ویسے بھی نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان سے لالا کر بم پستول اکٹھا کرتے ہو۔"

"کھول سالے، ایک ایک گھر میں اتنی دیر کریں گے تو دو ہی گھر میں صبح ہو جائے گی۔"

"سیدھے سے نہیں کھولے گا تو منھ بھی توڑ دیں گے اور تالا بھی۔"

بندوق کا کندا دونوں کو توڑ سکتا ہے ـــــ فرق صرف اتنا ہے کہ تالا ٹوٹتے وقت تیز آواز کرتا ہے اور آدمی کا منھ صرف ادھوری سی "اوہ!" کی فریاد نکال پاتا ہے۔

"حضور! بڑی مشکل سے اکٹھا کیا ہے۔ بیٹی کی شادی نہیں ہو پائے گی۔"

پتلون کی جیب میں پڑے ہوئے ہاتھ پر کمزور ہاتھ تھر تھراتا جھول جاتا ہے۔ کندے کی دوسری چوٹ کسی کو اس لائق نہیں چھوڑتی کہ وہ مضبوط ہاتھ کو پکڑنے کی پھر جرأت کرے۔ جب تک بوٹ باہر نکلتے ہیں، گھر کے سارے مرد عورت رونے چلّانے لگتے ہیں۔ بچے بھی گھبرا کر ذرا زیادہ اونچی آواز میں روتے ہیں، لیکن جانے والوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

تلاشی کا اختتام تقریباً سبھی گھروں میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ آخر میں سیاہ، راکھ پُتے چہرے اگر آنسوؤں سے تر نہیں ہوتے تو بے عزتی اور غم سے بجھے بجھے، جاتے ہوئے بوٹوں کی آواز سنتے رہتے ہیں۔

"ابے دروازہ اتنی دیر میں کیوں کھولا؟"

"سو رہا تھا۔ نیند کھلی تو کھولا۔"

"کیا؟ زبان لڑاتا ہے!" تڑاق... تڑاق...

"مارا کیوں؟ مارنے کا اختیار کس نے دیا تمھیں؟"

"سالا اختیار پوچھتا ہے؟ اِس نے دیا اختیار!"

رائفل کا بٹ آدھا منھ پر اور آدھا دروازے پر پڑتا ہے۔ پچ سے منھ سے خون تھوکا جاتا ہے اور خون کے ساتھ ساتھ دو تین دانت بھی باہر آ گرتے ہیں۔ گھر کے بزرگ عورت مرد آ کر جوان سے چمٹ جاتے ہیں۔ گھر کا بوڑھا مُکھیا خون دیکھ کر جوش میں دھیرے دھیرے کانپنے لگتا ہے۔ سامنے کھڑے مجسٹریٹ سے آواز پر قابو کر کے بات کرنے کی کوشش کرتے کرتے بھی اس کی آواز دھیرے دھیرے تلخ ہونے لگتی ہے۔

"آپ کے سامنے سب کچھ ہو رہا ہے اور آپ چپ چاپ دیکھ رہے ہیں۔ یہی تلاشی کا انداز ہے؟ کس قانون نے آپ کو اختیار دیا ہے مارنے پیٹنے کا؟ میں بھی وکیل رہا ہوں۔ اس ملک میں نظامِ حکومت ہے... قانون ہے... قاعدہ ہے..."

"تو ہمیں قانون قاعدہ سکھائے گا؟ وکیل کی دُم..."

دنیا کا کوئی بوڑھا چہرہ اپنے اوپر بندوق کا کندا سہہ کر چپ چاپ کھڑا نہیں رہ سکتا۔

"سالے کھاتے یہاں کا ہیں، دیکھتے پاکستان کی طرف ہیں۔ غور سے تلاشی لینا۔ اس بدمعاش وکیل کے یہاں تو ٹرانسسٹر بھی ہوگا۔ یہی سالے خبر دیتے ہیں۔ تبھی صبح صبح بی بی سی بولنے لگتا ہے۔"

"پاکستانی..." خون بھرے منھ کو بے ڈھنگے پن سے چبا چبا کر نوجوان چہرہ پھنکارتا ہے، "پہلے تو نہیں کرتے تھے لیکن اب ضرور کریں گے پاکستانی جاسوسی... اس سالے ملک میں اگر ذلت ہی ملنی ہے تو ضرور کریں گے پاکستانی دلالی..."

"کیا کہا؟ کیا کہا؟ پاکستانی جاسوس ہے؟ تب تو پورا ہی بتائے گا کہ کہاں چھپا رکھا ہے ٹرانسسٹر اور بم؟"

بگڑا ہوا منھ تھوڑا اور بگڑ جاتا ہے لیکن عورتیں اس کے اوپر قریب قریب لیٹ جاتی ہیں۔

باپ کے گال کی پھٹی کھال دیکھ کر نوجوان پر بیچ بیچ میں جیسے ہسٹیریا کے دورے پڑتے جا رہے تھے۔ اسے بولنے سے روکنے کے لیے بوڑھے وکیل سمیت گھر کے سبھی افراد اسے گھیر کر بیٹھ گئے۔ کوئی بہلا کر، کوئی پھسلا کر، کوئی ڈپٹ کر، اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے باوجود اس کی آواز تیز ہو جاتی تو کوئی نہ کوئی عورت اس سے تیز آواز میں اسے روک کر اس کی آواز دبانے کی کوشش کرتی۔

تلاشی لینے والوں کی دل چسپی اس میں ختم ہو چکی تھی۔ دو جوانوں کو ان کے پاس کھڑا کر کے باقی سب لوگ تلاشی لینے چلے گئے۔ کافی مالدار لوگوں کا گھر لگتا تھا اس لیے سب تلاشی لینے والے پوری طبیعت سے تلاشی لے رہے تھے۔ جن دو جوانوں کو گھر والوں کے سر پر کھڑا کیا گیا تھا، وہ بھی تھوڑی دیر میں اندر سرک گئے اور تلاشی میں شریک ہو گئے۔ گھر والے باہر کمرے میں دائرہ بنا کر صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کو تسلی دیتے یا چپ کراتے رہے۔ تلاشی

لینے والے جب چلے گئے تو عورتوں نے جھپٹ کر اپنے زیوروں کے بکسوں یا نقدی کے ڈبے کو الٹ پلٹ کر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ مردوں نے انھیں ڈانٹا اور بوڑھے وکیل نے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

قریب قریب سبھی گھروں میں یہی تماشا ہوا۔ صرف حاجی بدرالدین کے یہاں ناٹک کے مکالمے بدل گئے۔ ان کا دو ایکڑ میں پھیلا مکان تھا۔ گھنے خوب صورت پام کے درختوں کے نیچے پھیلے لان میں مدھم نیلی روشنی پھیلی تھی۔ مکان کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں، اس لیے باہر سے اندر کا کوئی منظر دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ مکان کا بڑا دروازہ کھول کر جب ایک ڈپٹی کلکٹر اور ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں پولیس کا گروہ اندر گھسا تو انھیں لگا جیسے تپتے ہوئے ریگستان سے نکل کر وہ کسی سہانے ٹھنڈے نخلستان میں چلے آئے ہوں۔

"یہ کرفیو میں کیسا مجمع لگا رکھا ہے؟" بولنے والے نے اپنی آواز میں کڑک بھرنے کی کوشش کی لیکن اس کی کڑک کا سننے والوں پر کوئی اثر نہیں پڑا کیوں کہ جملہ ختم ہوتے ہوتے وہ پھس سے ہنس پڑا۔

"آئیے حضور ڈپٹی صاحب، کیسا کرفیو اور کہاں کا کرفیو! ہم تو اپنے گھر کے اندر بیٹھے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک آپس میں اس بات پر دوستانہ بحث ہوتی رہی کہ کرفیو گھر کے اندرونی حصوں تک تھا یا باہر کی چار دیواری تک اس کی حد تھی۔ سپاہی لان کے باہر سیڑھیوں پر آرام سے بیٹھ گئے اور افسران گلاب کی باڑیں پھلانگتے ہوئے لان پر پڑی کرسیوں پر جا کر پھیل گئے۔ تھکان اور کئی دنوں کی جاگ نے سب کو بری طرح توڑ ڈالا تھا۔ کمر سیدھی ہوتے ہی زیادہ تر لوگ اونگھنے لگے۔ حاجی کے آدمیوں نے جلدی جلدی ٹھنڈا پانی اور شربت پیش کرنا شروع کر دیا۔

"اور کیا خدمت کریں صاحب؟ ایسا وقت ہے کہ کچھ خدمت بھی نہیں کر پا رہے ہیں۔"

"ارے بہت ہے حاجی جی، آج تو آپ کا ٹھنڈا پانی بھی امرت لگ رہا ہے۔"

"تھوڑا سا اچھا مال بھی رکھا ہے۔ اجازت دیں تو منگواؤں؟"

"نہیں نہیں... اس وقت اچھا برا کچھ نہیں چلے گا۔" افسر نے کنکھیوں سے دور بیٹھے

Scanned with CamScanner

ماتحتوں کی طرف دیکھا۔

"اندر کمرے میں انتظام کرا دیتا ہوں۔ تھوڑا لے لیں۔ تکان دور ہو جائے گی۔"

"رہنے دیں حاجی جی، پھر کسی دن بیٹھیں گے۔"

اچانک ایک افسر نے لان کے ایک کونے میں دیکھا کہ اندھیرے میں رکھی کرسی پر کسی نے کروٹ بدلی۔ کرسی مہندی کی جھاڑیوں کی آڑ میں اس طرح پڑی تھی کہ بہت دھیان دے کر دیکھنے پر ہی صاف دکھائی پڑ سکتی تھی۔ افسر نے چوکنا ہو کر پوچھا، "کون ہے ادھر جھاڑیوں کے پیچھے؟ کون ہے؟"

"ارے جیسوال جی، آجائیں۔ اِدھر ہی آ کر بیٹھیے، نہیں تو صاحب لوگ سوچیں گے کہ میں نے کسی ہندو کو اغوا کر رکھا ہے۔"

رام کرشن جیسوال کچھ سٹپٹائے سے جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر آ گئے۔ جیسوال جی سابق ممبر اسمبلی تھے اور آنے والے چناؤ میں بھی کھڑے ہونے والے تھے۔ حاجی بدرالدین ان کے پرانے حریف تھے۔ مگر اس بار شہر میں افواہ تھی کہ موجودہ ممبر اسمبلی ایودھیا ناتھ دیکشت کے خلاف دونوں نے ہاتھ ملا رکھا تھا۔

"جیسوال جی، کرفیو میں اتنی رات گئے آپ یہاں؟ خیریت تو ہے؟" ایک افسر نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"ہم تو ڈپٹی صاحب، شہر کے اندیشے سے پریشان ہیں۔ حاجی جی سے ڈسکس کرنے گلیوں گلیوں چھپتے آ گئے تھے۔ دنگا کیسے روکا جائے، اسی پر بات کر رہے تھے کہ آپ آ گئے۔"

"سالا کیسی بھولی بات کر رہا ہے! پورا شہر جانتا ہے کہ یہی دونوں دنگا کروا رہے ہیں مگر ان کو پکڑے گا کون!" دور سیڑھیوں پر بیٹھے ایک داروغہ نے دوسرے کے کان میں پھسپھسا کر کہا۔

"چپ رہ یار، کیوں بُرا بنتا ہے! یہ کم بخت تو پردے کے پیچھے رہ کر کام کرتے ہیں اور ان کا پیسا سب کچھ کراتا ہے۔ انھیں کون پکڑے گا اور کیوں؟" دوسرے نے اپنی آواز کو دباتے ہوئے کہا۔

ڈی ایس پی نے ڈپٹی کلکٹر کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا اور دونوں لان کے کونے میں چلے گئے۔

Scanned with CamScanner

"مجھے بھائی صاحب، کچھ گڑبڑ لگ رہا ہے۔ جیسوال کا اس وقت یہاں ہونا شک پیدا کرتا ہے۔ کیسے تو اندر تلاشی لی جائے۔ کچھ مل سکتا ہے۔"

"آپ بھی شرما جی بچوں جیسی بات کرتے ہیں! حاجی کیا اپنے گھر میں اسلحہ رکھے گا؟ یا جیسوال خود چاقو چلائے گا؟ ارے ان کا تو صرف پیسا اور دماغ کام کرتا ہے۔ ان کے یہاں تلاشی لینے سے کیا ملے گا؟ کل ہمارا تبادلہ ضرور ہو جائے گا۔"

دونوں دیر تک کھڑے کھڑے دھیمی آواز میں بات کرتے رہے۔ لان میں بیٹھے حاجی اور جیسوال تھوڑی بے چینی سے ان کی بات چیت ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جیسوال بات چیت کو لمبا کھنچتے دیکھ کر نروس ہونے لگا لیکن حاجی اسے ہاتھ یا آنکھ کے اشارے سے لگاتار مطمئن کرتا رہا۔ دونوں افسر واپس آ کر بیٹھ گئے۔ بات چیت پھر شروع ہو گئی۔ جیسوال نے بتایا کہ حاجی جی نے کس طرح محلے کے غریب ہندوؤں کے لیے لنگر کھول رکھا ہے۔ ان کے آدمیوں کو آسانی سے کرفیو پاس نہیں مل پا رہے ہیں اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی سب تک مدد نہیں پہنچا پا رہے ہیں۔ حاجی نے بھی جیسوال کے ذریعے اپنے پڑوسی مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دینے کی بات افسروں کو سنائی۔ اندر سے اس بیچ چائے بن کر آ گئی۔

"ابھی تو ٹھنڈا پیا ہے۔ اب چاہ کا تکلف کیوں!"

"تکلف کیسا صاحب! میں تو شرمندہ ہوں کہ ایسے موقعے پر آپ تشریف لائے ہیں کہ کچھ خاطر نہیں کر پا رہا ہوں۔"

"کبھی فرصت سے پروگرام بنائیے۔ بیگم صاحب مرغا بہت اچھا پکاتی ہیں۔ حاجی جی، اب کرفیو ہٹے تو صاحب لوگوں کو دعوت دیجیے،" جیسوال نے کہا۔

"میں تو ہمیشہ خدمت کو حاضر ہوں۔ آپ لوگوں کو جب فرصت ہو..."

"دیکھیں گے... دیکھیں گے حاجی جی۔ بس کرفیو سے جلدی آپ لوگ چھٹی دلائیے۔"

"اجی میری اور جیسوال کی طرف سے تو آپ کرفیو کل ہٹاتے ہوں تو آج ہٹا لیجیے۔ ہم تو امن کے لیے کوئی بھی قربانی کر سکتے ہیں۔"

"سو تو ہے... میرا مطلب ہے کہ جو دنگا کرار ہے ہیں وہ فرصت دیں تو دعوت واوت بھی تبھی رکھی جا سکتی ہے۔"

افسر کھڑے ہوئے۔ ماتحتوں نے بھی دھول جھاڑی، اپنی بندوقیں وغیرہ سنبھالتے ہوئے اٹھ گئے۔ آٹھ دس لوگوں کا قافلہ دھیرے دھیرے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ پھاٹک پر کھڑے ہو کر حاجی بدرالدین نے ہاتھ ماتھے تک لا کر سلام کیا۔ "اب اس سے باہر نکلنے کے لیے تو آپ سے پاس لینا پڑے گا۔"

جیسوال اور افسر دھیرے سے ہنسے۔ ایک ایک کر کے گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں اور حاجی نے بڑا دروازہ دھیرے دھیرے بند کر دیا۔ سناٹے میں تھوڑی دیر تک صرف گاڑیوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور ہیڈلائٹس کی روشنی گلیوں کی دیواروں پر ناچتی رہی۔

۹

باہر جب تک دروازوں کے پھٹنے ٹوٹنے، گلیوں میں بوٹوں کے دوڑنے چلنے، یا لوگوں کے چیخنے سسکنے کی آوازیں آتی رہیں، تب تک گھر میں سبھی افراد سہمے ڈرے سے بیٹھے رہے۔ آوازیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ تلاشیاں چل رہی ہیں۔ یہ گھر تلاشی لینے والوں کی مستعدی سے ڈرے ہوئے لوگوں کا گھر تھا۔ تلاشیوں کا دور اتنا لمبا کھنچ رہا تھا کہ ناتمام سا لگنے لگا تھا۔ کسی طرح یہ سلسلہ ختم ہونے کو آیا اور آوازیں دھیرے دھیرے ختم ہو گئیں۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ساتھ بہت سی چھوٹی اور بڑی گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں، اس لیے ان کی آواز حملہ آور شہد کی مکھیوں کی طرح پوری گلی میں چھا گئی۔ بہت ساری گاڑیوں کی ہیڈلائٹس کی روشنی ـــ ایک دم پوری گلی روشنی میں نہاتی چلی گئی۔ جب اس روشنی سے نجات پا کر گلی پھر سے اندھیرے کی تاریکی میں کھو گئی تب گھر کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ تلاشی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد انھوں نے پھر اونگھنا شروع کر دیا۔

پڑوس کے کنبڑے کے مرغ نے غیر فطری طور سے بانگ دی۔ شاید رات بھر کی بے چینی نے اسے غصے سے بھر دیا تھا۔ اس کے کڑکڑانے کی آواز نے سعیدہ کی ساس کو سب سے پہلے جگایا۔ بڑھیا ویسے بھی بہت ہلکی نیند سوتی تھی، آج تو اسے ڈھنگ سے نیند آئی بھی نہیں تھی۔ اس

نے جھپٹ کر کونے میں پڑے اسٹول پر رکھی میز گھڑی میں وقت دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک تو گھڑی بہت چھوٹی تھی، دوسرے اسٹول پر ایک صراحی بھی رکھی ہوئی تھی جس کی آڑ پڑنے کی وجہ سے گھڑی کی سوئی صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بڑھیا نے مدد کے لیے کمرے میں نظر دوڑائی۔ دیوار سے سر ٹکائے لیٹے لوگوں کو دیکھنے سے یہ تو عیاں ہو گیا کہ ان میں سے کچھ آنکھیں موندے جاگ رہے ہیں، لیکن ان میں سے کسی سے بھی مدد کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

بڑھیا خود ہی اٹھی اور اس نے صراحی کو سرکا کر گھڑی کو دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ بڑھیا گھبراہٹ کے مارے بے چین ہو گئی۔ اس نے صراحی کو ہلا کر تھاہ لی۔ صراحی بالکل خالی تھی۔ کل دن بھر اسے بھرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جو کچھ پیندے میں پانی کے قطرے تھے انہیں بھی صراحی کو دو تین بار پورا اُلٹ کر بچوں نے نچوڑ ڈالا تھا۔ بڑھیا نے پیچھے برآمدے میں باورچی خانے میں جا کر دیکھا۔ بالٹی میں قریب دو ڈھائی لوٹے پانی تھا۔ گھر کے اکیلے نل سے سُوں سُوں کی آواز آ رہی تھی۔ مطلب یہ کہ پانی جلد ہی آنے والا تھا۔ اس نے بالٹی نل کے نیچے لگا دی اور نل پورا کھول دی، حالاں کہ نل پورا کھولنا اس گھر میں محاورے سے زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا۔ نل چاہے جتنا بھی کھولا جائے، پانی ہمیشہ ایک پتلی سی دھار کی شکل میں گرتا تھا جس سے بالٹی بھرنے سے پہلے آدمی کا صبر جواب دے جاتا تھا۔

بڑھیا نے بالٹی سے ملے دو لوٹے پانی سے اپنے روزمرہ کے کام نپٹانے شروع کیے۔ جب وہ پاخانے سے باہر نکلی تو نل سے دھیرے دھیرے پانی ٹپکنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ نل کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اونگھتے ہوئے بالٹی کے تھوڑا بہت بھر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ رات بھر کی جاگ نے اسے قریب قریب نیند کی حالت میں پہنچا دیا۔ ہوشیار وہ تب ہوئی جب اس کا سر نل کے پاس کھمبے سے ٹکرایا۔ اس نے ہڑبڑا کر دیکھا، پانی تقریباً ایک چوتھائی بھر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کافی دیر آنکھیں بند کیے پڑی رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ایک لوٹے سے پانی نکالا۔ ایک چھوٹی سی، کافی گھسی ہوئی صابن کی بٹی پڑی تھی۔ اس سے اس نے اپنا ہاتھ مل مل کر دھویا۔ بٹی اتنی چھوٹی تھی کہ کافی رگڑنے کے بعد بھی اس میں جھاگ پیدا نہیں ہوا اور تھوڑا سا زور لگنے پر وہ پھسل کر نالی میں گر گئی۔ اور کوئی دن ہوتا تو بڑھیا اسے نالی سے چھان کر اٹھا لیتی، لیکن آج اس کا من جاگ کی تھکان اور گھر میں پڑی بچی کی لاش سے اتنا بے حال تھا کہ اس نے صابن کے ٹکڑے کی

پروا نہیں کی جسے وہ کم سے کم دو تین دن اَور چلاتی، اور اگر گھر کے کسی اَور بچے یا جوان سے یہ بٹی نالی میں گر گئی ہوتی تو گھنٹوں اس پر چیختی چلاتی۔

ہاتھ اور منھ پر ٹھنڈا پانی پڑنے سے اس کے بدن میں کچھ پھُرتی آئی۔ وہ اپنے کرتے اور شلوار سے اپنا ہاتھ رگڑتے ہوے جلدی جلدی اندر آئی۔ پانی جلد جا سکتا تھا۔ اگر تب تک سب لوگ اپنے کام کرلیں تو لاش کے غسل کا انتظام کیا جائے۔ حالاں کہ اس کا برسوں کا تجربہ یہ بتاتا تھا کہ گھر میں اتنا پانی نہیں آسکتا، لیکن پھر بھی باہر سے پانی بھرنے کا خیال اتنا کڑوا تھا کہ اس نے پورے من سے چاہا کہ لوگ اتنی جلدی جلدی اپنے کام پورے کرلیں کہ باہر جانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ دن بھر پینے کے پانی کی قلت رہے گی، اسے تو بعد میں دیکھ لیں گے۔ قبرستان سے لوٹتے ہوے گھر کے مرد پانی کی سبیل کرلیں گے۔

اندر سبھی لوگ ابھی سوئے ہوے تھے۔ صرف بوڑھا اپنی آنکھیں کھولے ایک ٹک جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔ اس کی بےجان پُتلیوں کو دیکھ کر آسانی سے یہ بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا آنکھیں کھول کر سویا ہے۔ سعیدہ کی گردن دیوار پر ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ اس کے کھلے منھ سے رال ٹپک کر اس کے آنچل سے ہوتی ہوئی اس کے گھٹنے تک چلی گئی تھی۔ رات بھر رہ رہ کر ماتم کرنے اور جاگنے کی وجہ سے اس کا کھلا ہوا منھ بےڈول لگ رہا تھا۔ بڑھیا کا جی چاہا کہ دھیرے سے اس کا منھ بند کر دے اور رال پونچھ کر اسے چپ چاپ تھوڑی دیر سونے دے لیکن عادت سے مجبور اس کے منھ سے نکل ہی گیا، "اری اٹھ کرم جلی، اب کیا دوپہر تک سوتی رہے گی!" حالاں کہ بڑھیا کی آواز روز کی طرح کرخت نہیں ہو پائی تھی پھر بھی اس کی تیزی کی وجہ سے سعیدہ نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے اس کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی ہے، اور اس نے جھپٹ کر اٹھنے کی کوشش کی، لیکن پوری طرح اٹھنے سے پہلے اس کی نگاہ سامنے فرش پر چادر سے ڈھکی اپنی چھوٹی بچی پر پڑی اور ایک بار پھر اس کا رونا شروع ہو گیا۔ پہلے اس نے سسکیاں بھریں، پھر ایک دم گلا پھاڑ کر رونے لگی۔ اس نے پچھلے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا، اس لیے جلد ہی اس کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔

سعیدہ کے رونے نے کمرے میں فرش پر پڑے سب بڑے لوگوں کو جگا دیا۔ بچے اب بھی

سو رہے تھے لیکن بڑوں نے ایک ایک کر کے اپنی جگہ سے اٹھنا شروع کر دیا۔ بڑھیا نے سب کو جلدی جلدی اپنے روز کے کام نپٹانے کے لیے للکارا۔ لوگوں نے ایک ایک کر کے پیچھے برآمدے کی طرف جانا شروع کر دیا۔

نل لگاتار کھلا رہا لیکن بالٹی صرف ایک بھر پائی۔ اس کا پہلے ہی سے بڑھیا کو اندازہ تھا۔ نل سے پانی جب آنا بند ہوا تو بالٹی کی تہہ میں صرف تھوڑا سا پانی اور بچا تھا۔ ابھی سارے بچے باقی تھے۔ اٹھتے ہی انھیں پانی کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے علاوہ سب سے ضروری کام لاش کو نہلانا تھا۔ بچی کو مرے بارہ گھنٹے ہو گئے تھے۔ رات میں یوں موسم بہت گرم نہیں تھا لیکن جلد ہی موسم گرمانے لگے گا اور لاش میں سڑن اور بدبو شروع ہو جائے گی، اس لیے بڑھیا چاہتی تھی کہ جلدی سے پانی کا انتظام ہو جائے تاکہ دفنانے کے لیے گھر سے نکلنے کی سبیل کی جاسکے۔

پانی صرف باہر کے سرکاری نل سے مل سکتا تھا۔ سعیدہ کے شوہر کو پچھلی صبح کا واقعہ ابھی بھولا نہیں تھا۔ بوڑھا کرفیو پاس بنوانے میں جتنا ذلیل ہوا تھا، اس کے بعد اس کی بھی ہمت نہیں تھی کہ باہر نکلے۔ حالاں کہ اب اس کے پاس کرفیو پاس تھا اور اسے لے کر باہر پانی لینے نکلا جاسکتا تھا، لیکن پھر بھی باہر پولیس والوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ انھیں کرفیو پاس پھاڑ کر پھینکنے اور اس کی پٹائی کرنے میں کوئی وقت نہیں لگتا تھا۔ اس کے من کے کسی کونے میں یہ خواہش زور مار رہی تھی کہ بڑھیا ہی پانی لانے باہر چلی جائے۔ اپنے کسی بھی لڑکے کو وہ باہر نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ روز بھی بڑھیا یا گھر کی دوسری عورتیں ہی جاتی تھیں۔ کسی جوان عورت کا باہر جانا کچھ ٹھیک نہیں تھا، لیکن بڑھیا کے جانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آخر میں بڑھیا ہی گئی۔

دونوں ہاتھوں میں ایک ایک خالی بالٹی لٹکائے بڑھیا کو پچاس میٹر کی خالی ویران گلی کو پار کرنے میں پورا ایک یگ لگا۔ بڑی مشکل سے گلی کا وہ موڑ آیا جہاں نل لگا ہوا تھا۔ موڑ کے بائیں ہاتھ پر نل تھا اور موڑ پر پہنچتے ہی دکھائی پڑتا تھا۔ نل لگتا تھا پورا کھلا ہوا ہے کیوں کہ تھوڑی دور ہی سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی تھی۔ روز کا وقت ہوتا تو موڑ سے پہلے ہی زمین پر قطار میں رکھے برتن دکھائی دینے لگتے اور اوجھل نل کا احساس کرانے لگتے۔ آج تو وہ جب موڑ پر پہنچی تب اس نے دیکھا، ایک پولیس والا اپنے دونوں ہاتھوں کو چلو کی طرح بنا کر اس میں پانی روک رہا تھا اور چلو بھرنے پر اس پانی کو اپنے چہرے پر مار کر چہرہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

بڑھیا ایک لمحے کو ٹھٹکی، لیکن اب واپس لوٹنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتی گئی اور پولیس والے کے قریب پہنچ کر سہمی سی کھڑی ہو گئی۔ پولیس والے کی پیٹھ بڑھیا کی طرف تھی۔ جیسے ہی وہ پیچھے کو گھوما، اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ بھر گئی۔

"ارے کہاں صبح صبح آ گئی بڑھیا! جلدی پانی بھر کر بھاگ اپنے گھر۔" وہ تھوڑی دور پر آگے بیٹھے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

بڑھیا کو اتنے کم میں چھٹکارے کی امید نہیں تھی۔ وہ جلدی جلدی دونوں بالٹیاں بھر کر واپس لپکی۔ گھر کے اندر دونوں بالٹیوں میں پانی بھرے جب وہ گھسی تو گھر کے مردوں کے بیچ وہ انتہائی غرور سے بھری تھی۔ اس نے دونوں بالٹیوں کا پانی گھر میں جتنے بھی برتن موجود تھے ان میں بھرا اور ایک بار پھر نل پر جانے کے لیے گھر سے نکلی۔

اس بار بڑھیا کو کامیابی نہیں ہوئی۔ گھر سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھنے پر اسے گالی گلوچ اور زمین پر ڈنڈا پٹکنے کی آواز سنائی دی۔ ہوا یہ کہ گلی میں اس کی آہٹ سن کر کئی لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازوں کھڑکیوں سے اسے پانی لینے جاتے اور پانی لے کر لوٹتے دیکھا۔ لوگوں کو لگا کہ آج اچھا موقع ہے۔ اس گلی میں زیادہ تر لوگوں کو پانی عام نل ہی سے ملتا تھا، اس لیے بڑھیا جب دوسری بار باہر نکلی تب کئی گھروں کے مرد اور عورتیں نل کی طرف پہنچ چکے تھے۔ گرمی میں پانی کی ضرورت اتنی بڑی تھی کہ گالیاں سنتے اور پٹتے ہوئے بھی لوگ نل کے ارد گرد منڈلاتے رہے اور گرتے بھاگتے آدھی پونی جتنی بھی بالٹی بھری ہوتی اسے لے کر اپنے گھر میں گھستے رہے۔ بڑھیا نے چالاک بننے کی کوشش کی اور نل کے ارد گرد پھیلی افراتفری میں دونوں بالٹیاں آدھی سے زیادہ بھر لیں، لیکن واپس مڑتے وقت ایک سپاہی کی لاٹھی اس سے ایسی ٹکرائی کہ دونوں بالٹیوں کے صرف پیندے میں تھوڑا تھوڑا پانی بچا۔ اسی کو لے کر وہ واپس لوٹی۔

کمرے میں واپس گھس کر اس نے پانی نہ لا پانے کی کھسیاہٹ سعیدہ پر نکالی۔ سعیدہ جاگنے کے بعد دیوار سے لگ کر آہ و زاری کر رہی تھی۔ اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بڑھیا نے اپنی آواز کو پوری طرح کرخت بنا کر کہا:

"ابھی تک اٹھی نہیں کرم جلی! سارا کام پڑا ہے۔ یہاں تیری لونڈی کون ہے جو سب کام نپٹائے گی؟ اٹھ... جلدی اٹھ..."

سعیدہ شروع ہی سے اس سے ڈرتی تھی- اس کی ڈانٹ کا اثر یہ ہوا کہ جب تک بڑھیا اندر بالٹی رکھ کر کمرے میں واپس لوٹی تب تک وہ سیدھی کھڑی ہو گئی تھی- بڑھیا کا بڑبڑانا جاری رہا لیکن سعیدہ نے اسے موقع نہیں دیا- وہ لڑکھڑاتی ہوئی اندر چلی گئی-

جب تک سعیدہ واپس آئی اس کی ساس نے کافی حد تک تیاریاں پوری کر لی تھیں- اس وقت وہ پرانی دھلی ہوئی سفید چادر کو سوئی دھاگا لے کر سینے میں لگی تھی- غنیمت تھا کہ کئی بکسوں کو ٹٹولنے کے بعد یہ ایک چادر اسے مل گئی تھی جسے وہ کفن بنانے میں لگی ہوئی تھی- سعیدہ نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کی لیکن چادر کو چھوتے ہی رُلائی سے اس کا گلا بھنچ گیا اور آنکھوں کی پتلیوں پر پانی کی بوندیں پھیل گئیں- ہر چیز دھندلی سی ہو گئی- ساس نے نرمی سے اس کا ہاتھ الگ کر دیا اور اس کے اشارے پر اس کی نند نے سعیدہ کو اپنی باہنوں میں بھر کر پیچھے دیوار تک سرکا دیا- سعیدہ دیوار پر سر ٹکائے پورے سانحے سے سکتے میں پڑ گئی-

تقریباً ایک گھنٹے میں تیاری پوری ہوئی- بچی کو نہلا کر کفن پہنا کر چلنے کی باری آئی تو دن پوری طرح نکل آیا تھا- نماز پڑھی گئی اور تین مردوں کے نکلنے کے لیے دروازہ کھولا گیا- تب تک سعیدہ پست اور آدھ موئی سی ہو چکی تھی، لیکن دروازہ کھلتے ہی وہ پچھاڑ کھا کر گری اور پوری طاقت سے آہ و زاری کرتے ہوئے اس نے دو تین بار اپنا سر زمین پر پٹکا- اس کے شوہر کے ہاتھوں پر بچی کی لاش تھی- جیسے ہی اس کا پہلا پیر گھر سے باہر نکلا، سعیدہ دروازے کی طرف جھپٹی- نہ جانے اس کے ناتواں بدن میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اسے سنبھالتے سنبھالتے اس کی ساس اور نند گر پڑیں-

دروازے کی چوکھٹ پر ایک پیر باہر گلی میں لٹکائے اور ایک پیر موڑ کر اندر کمرے میں ڈالے سعیدہ اپنی ساس اور نند کے ساتھ دیر تک روتی رہی- سر جھکائے چھوٹی سی لاش کو ہاتھوں پر اٹھائے تین مردوں کی صورتیں دن کے اُجالے میں غائب ہو گئیں- اڑوس پڑوس کی کھڑکیاں آدھی پوری کھلیں اور پھر تیزی کے ساتھ بند ہو گئیں- دروازوں اور کھڑکیوں کے پلّوں کے سوراخوں سے آنکھیں سٹائے نہ جانے کتنے سر ان پر ٹکے تھے-

صبح کے سات بجے تھے اور دھوپ پوری شدّت کے ساتھ چمک رہی تھی- چوں کہ بیتی رات بہت تھکا دینے والی اور گہما گہمی سے بھرپور تھی، اس لیے اتنا تو گارنٹی سے کہا جا سکتا ہے کہ

ابھی تک حاجی بدرالدین اور رام کرشن جیسوال کا ناشتہ میزوں پر نہیں لگا ہوگا اور اعلیٰ حکام کے غسل کے لیے رکھا ہوا پانی بھی غسل خانوں میں انتظار ہی کر رہا ہوگا۔

**

اُدے پرکاش

ہندی کے معروف ادیب اور شاعر اُدے پرکاش ۱۹۵۲ میں چھتیس گڑھ آنچل کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جواہرلال نہرو یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ آج کل ٹائمز آف انڈیا پبلی کیشنز کے ہندی رسالے "دِنمان" کے ادارتی عملے میں شامل ہیں۔ انھیں ۱۹۸۱ میں نظم "تبت" پر بھارت بھوشن اگروال ایوارڈ اور کہانیوں کے مجموعے "دریائی گھوڑا" پر اوم پرکاش ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "تِرچھ" کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ نظموں کے مجموعے "سنو کاریگر" اور "ابوتر کبوتر" ہیں۔

"آج" کے شمارہ ۱۸ (ہندی کہانیاں) میں اُدے پرکاش کی دو کہانیاں "رام سجیون کی پریم کہانی" اور "تِرچھ" شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں شمارہ ۱۹ میں ان کی نظموں کا ایک انتخاب بھی پیش کیا گیا تھا۔

آئندہ صفحات میں اُدے پرکاش کی ایک تازہ کہانی "اور انت میں پرارتھنا" کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ہم سہ ماہی "ذہنِ جدید"، نئی دہلی، کے ممنون ہیں۔ اس کہانی کا موضوع ہندوستان میں پچھلے چند برسوں میں نمایاں طور پر بڑھنے والی ہندو بنیاد پرستی کی لہر ہے۔

Scanned with CamScanner

اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: حیدر جعفری سید

اور انت میں پرارتھنا

"کرفیو لگا ہوا ہے، جو کوئی پلاٹ کی تلاش میں نکلے گا، اسے گولی ماردی جائے گی۔"

مارک ٹوین۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر: ایک تعارف

اس کہانی کے واقعات اور کردار فرضی ہیں۔

اب اس کا کیا کیا جائے کہ ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کسی افسانے یا ناول کے کردار نہیں ہیں۔ انھیں کسی افسانہ نگار کے تخیل نے نہیں پیدا کیا ہے۔ ڈاکٹر واکانکر کسی افسانہ نگار یا تخلیق کے ہونے یا نہ ہونے کے باوجود ہیں ـــــ کچھ کچھ اس طرح جیسے ہم اور آپ ہیں۔ کیا ہمیں ہونے کے لیے کسی مصنف یا کسی تخلیق کے ہونے کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کی عمر اڑتالیس برس کی ہے۔ ان کا سر گنجا ہے، جس پر وہ اپنی

بیوی جیوتسنا واکانکر کا بنائی ہوئی جالی دار سُوتی ٹوپی منڈھ لیتے ہیں۔ ان کا جسم بھاری ہے۔ تھل تھل اور گول مٹول بیوی کے علاوہ ان کی چار بیٹیاں ہیں۔ سب ہی کا نام انھوں نے اپنی پسند سے رکھا ہے: پُوجا، اُپاسنا، پرار تھنا اور تپسّیا۔

ڈاکٹر واکانکر بہت مذہبی قسم کے شخص ہیں۔ پیشے سے وہ معالج ہیں۔ انھوں نے پُونے کے میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا ہے۔ بعد میں ایم ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ میڈیکل سائنس کے کچھ بین الاقوامی جریدوں میں ان کے تقریباً پندرہ تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ مدھیہ پردیش اور اُڑیسہ کے آدی واسی علاقوں میں ناکافی اور ناقص غذا، اور آلودہ پانی کے پینے سے پیدا ہونے والے کچھ اب تک غیر واضح جلدی امراض پر انھوں نے مفصّل اور اہم کام کیا ہے۔ ان کی رائے میں یہ امراض مہلک ہو سکتے ہیں اور ان علاقوں کے آدی واسیوں کے لیے کینسر کی طرح ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چوں کہ یہ امراض شہری علاقوں اور غیر آدی واسیوں میں نہیں پائے جاتے اس لیے حکومت یا کوئی اور ادارہ ان پر دھیان نہیں دیتا۔

ڈاکٹر واکانکر نے جتنا زیادہ میڈیکل سائنس کو پڑھا ہے اور امراض پر تحقیق کی ہے اُسی قدر ان کے اندر لاتعلقی، مایوسی، روحانیت اور اپنی بے چارگی کا احساس پروان چڑھتا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میڈیکل سائنس دوسرے علوم کی طرح ہے، اسی طرح جیسے مذہب، فلسفہ، نظریات، سیاست، لسانیات یا علم کیمیا وغیرہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح کسی ملک یا معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے سامنے علم سیاسیات کی کچھ طاقت نہیں ہے، اسی طرح میڈیکل سائنس کی بھی امراض کے سامنے کوئی طاقت نہیں ہے۔ ہر شخص کے جسم اور اس کی زندگی کی حیاتیاتی ترچھی لکیر ہوتی ہے، اسی کی سمت میں وہ بڑھتا ہے۔ کوئی بھی ڈاکٹر اس میں فیصلہ کن مداخلت نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر شخص کے جسم یا زندگی میں دخل اندازی کرنے کا صرف گمان پیدا کرتا ہے۔

بقول ان کے، ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ وہ انسان کے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر اس کے جسم اور زندگی کو الگ کر دے۔ ڈاکٹر واکانکر ہنستے ہیں کہ جو حصہ الگ کاٹا جاتا ہے، وہ مر جاتا ہے اور احمق مریض کو دیکھو جو یہ نہیں سمجھ پاتا کہ یہ مرنے والا حصہ اس کے اپنے ہی جسم کا ایک حصہ ہے، یہ اس کے جسم کی ہی ایک موت ہے۔

اسی لیے ڈاکٹر واکانکر سرجری کو، انسان کے جسم کے کسی مخصوص حصے کا قتل مانتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر واکانکر کے دوسرے متفرق نظریات

اڑتالیس سالہ ڈاکٹر دنیش واکانکر کا عقیدہ ہے کہ جس طرح کچھ مذہبی صحیفوں، فلسفوں یا نظریات کا استعمال دراصل حکومت کاروبار یا انتظامیہ کو چلاتے رہنے کا سبب ہوتا ہے، علم الحرب، علم کیمیا، علم حیاتیات یا ٹیکنالوجی کا زیادہ تر استعمال انسانوں کو ہلاک کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ طبیعیات، الیکٹرانکس، رفتار اور علم خلا یا مادّی معاملات میں لگاتار ہونے والی تحقیقات کے نتیجے میں اب ہم زیادہ جامع، زیادہ متاثر کن اور نسبتاً آسان طریقے سے قتل کرسکتے ہیں۔ میڈیکل سائنس بھی اسی قسم کا ایک علم ہے۔ انسان کا علم آج تک قدرت کو برباد کرنے، اسے نیست ونابود کرنے ہی کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔ ستم ظریفی صرف اتنی سی ہے کہ انسان بھی آخرکار کسی کیڑے، مادے، پیڑ یا ندی کی طرح ایک قدرتی چیز ہی ہے۔

لیکن ڈاکٹر واکانکر ایشور کو مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے کسی وجود یا گمان کا قائم رہنا ضروری ہے۔ ان کی رائے میں ایشور کم زور انسانوں کی بے چارگی اور بے چینی کی بازگشت ہے۔ ایشور افیم یا مارفین تو ہے لیکن اس معنی میں کہ وہ مارے جانے والے انسان کے درد اور اذیّت کو کم تکلیف دہ بناتا ہے۔ ایشور ایسپرین، سکون آور انیستھیزیا کی طرح ہے۔ ایک بھلا اور فیاض ڈاکٹر بھی آخر میں کسی لاعلاج مرض سے مرتے ہوئے مریض کو سکون عطا کرتا ہے۔ انلجین، ایکوی لبریم، کامپی پلام، کامپوز، یا بینڈریکس دراصل ایشور کی ہی گولیاں یا کیپسول ہیں۔ ایشور مریض کے کرب، اذیت، بیخ، اور موت کو عالم بالا کی اصطلاح دے کر اس کی خوش گمانی میں اضافہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کی رائے میں دنیا کے کئی نظریات، فلسفے اور مذہبی صحائف شروع شروع میں ایشور ہی کا جزو ہونے کا بھرم اور دعویٰ پیش کرتے ہیں، لیکن بعد میں جا کر پتا چلتا ہے کہ ان کا استعمال دراصل لوگوں کو مارنے کے لیے کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر واکانکر ہنستے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل میں بات یہ ہے کہ ایشور کو ہر شخص جانتا ہے لیکن ایشور کو شیطان میں تبدیل کر لینا بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں کیوں کہ غلامی صرف شیطان ہی کی کرائی جا سکتی ہے۔ ایشور اور شیطان کے درمیان وہ اپنے لیے

Scanned with CamScanner

شیطان کو اس لیے چُنتے ہیں کہ وہ فرماں بردار ہوتا ہے، آپ کے احکام پر چلتا ہے، آپ کو خوش کرنا اور آپ کی دبائی ہوئی خواہشوں کو سہلانا جانتا ہے، جب کہ ایشور کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے اُسے چنا تو پھر اس سے آپ اپنا کام نہیں کرواسکتے بلکہ آپ کو اس کے احکام کی تعمیل کرنی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر واکانکر مثال دیتے ہیں کہ فرض کر لیجیے کہ پہیا ایشور کے بے شمار رُوپوں میں سے ایک رُوپ ہے۔ اس طرح منطقی طور پر سائیکل ایک حد تک ایشور کے ہی عکس کی تفصیل ہے۔ لیکن اگر آپ پہیے کے اوپر سائیکل کا فریم نہ رکھ کر توپ، مارٹر یا میزائل لانچر رکھ دیں تو اب پہیا (یعنی ایشور) شیطان کی سواری بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ پہیے سے سفر نہیں کر سکتے، صرف ہلاک کر سکتے ہیں۔ یہ ایشور کو شیطان میں بدل دینا ہے۔

ڈاکٹر واکانکر کا کہنا ہے کہ وہ کسی بھی چیز یا خیال کو دیکھ کر دس سیکنڈ میں بتا سکتے ہیں کہ یہ ایشور کا حصہ ہے یا شیطان کی سواری ہے۔

ان کا بچپن اور جیو تسنا کی چڈھی

ڈاکٹر دنیش واکانکر یوں تو مراٹھی ہیں لیکن اب تک وہ صرف دو ہی بار ایل ٹی اے لے کر مہاراشٹر گئے ہیں۔ ان کی بیوی کے کچھ رشتے دار مہاراشٹر میں نراین پور اور بمبئی کے آس پاس رہتے ہیں۔

ان کی ولادت ۸ دسمبر ۱۹۴۳ کو کلت پور، اتر پردیش، میں ہوئی تھی۔ والد گوالیار میں مہاراجا کے معمولی ملازم تھے۔ لیکن ہر باپ کی طرح وہ بھی عظیم تھے اور اُنھیں سے متاثر ہو کر لڑکے واکانکر نے لگاتار پڑھائی لکھائی میں من لگایا، ویدوں، پرانوں اور اُپنشدوں کا مطالعہ کیا، امتحانات میں ہمیشہ اول آتے رہے، مباحثوں اور مضمون نگاری کے مقابلوں میں انعامات حاصل کرتے رہے۔ انھیں ذہین، محنتی، مستقل مزاج اور نظم و نسق کا پرستار تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ اسکول میں پی ٹی کے پیریڈ میں باقاعدگی سے جاتے تھے۔ ان کے ناخن صفائی کے ساتھ ترشے ہوئے ہوتے تھے۔

Scanned with CamScanner

کھانے، سونے، ورزش اور مطالعے کے لیے ان کا متوازن ٹائم ٹیبل تھا۔

بچپن ہی سے وہ ایسے طالب علم تھے جس کی ہر کاپی اور کتاب ہمیشہ مجلد اور پنسل قرینے سے تراشی ہوئی رہتی تھی۔ جیومیٹری باکس میں ہر چیز پوری ہوتی تھی۔ ان کی کوئی چیز کبھی گم نہیں ہوتی تھی۔ ہوم ورک ہمیشہ پورا ہوتا تھا اور حاضری سب سے زیادہ۔ ان کے والد انھیں ہمیشہ اشلوک سناتے رہتے تھے: "کاک چیشٹا، بکودھیانم، شوان نارارد تتھیوچ۔" اسی اشلوک پر لڑکے واکانکر نے اپنی طالب علمی کی زندگی کی بنیاد رکھی۔

لیکن رفتہ رفتہ، کچھ ہی برسوں میں، انھیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ دوسرے طلبا انھیں پسند نہیں کرتے۔ باقی عام لڑکوں کی اپنی الگ الگ دنیائیں تھیں اور ان دنیاؤں کے دروازے واکانکر کے لیے بند تھے۔

کئی بار وہ خود کو بے حد اکیلا محسوس کرتے۔ کبھی کبھی وہ تنہائی میں رونے بھی لگتے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے اس اکیلے پن کے بارے میں سوچنا بھی شروع کیا اور جلد ہی انھیں پتا لگا کہ باقی لڑکوں نے اپنے بچپن کو کسی کھیل کی طرح پوری رفتار، آزادی اور جوش کے ساتھ اپنایا ہے۔ وہ لڑکے اپنے بچپن کو اپنے مستقبل کی ملازمت، کریئر یا کاروبار کا ذائقہ بنانے کے لیے سڑانا نہیں چاہتے تھے۔

جلد ہی لڑکے واکانکر کو لگنے لگا کہ دوسرے بچوں کے بچپن سے جہاں کچے امرود، تازہ کٹے کھیرے اور ابھی ابھی کسی کنوئیں یا ندی سے لائے گئے پانی کی مہک آتی تھی وہاں ان کا بچپن مستقبل میں، برسوں بعد بننے والی کسی چیز کے لیے سڑایا اور گوندھا جا رہا تھا۔ اس میں خمیر اٹھ رہا تھا۔ اس میں فرمینٹشن کے کیڑے رینگ رہے تھے۔

واکانکر کے بچپن میں پیدا ہوئے خمیر کے کیڑوں کو دیکھ کر ان کے والد اور دوسرے بزرگ بہت خوش ہوتے تھے؛ وہ انھیں مبارکباد دیتے اور ایک دوسرے سے ان کے ہونہار ہونے کی بات کرتے۔

لڑکا واکانکر دوسرے لڑکوں کے سامنے اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگا۔ ان لڑکوں کے پاس بچپن کے جوکھم اور جوش بھرے، تمام رنگوں اور شکلوں کے تجربوں کے ڈھیر تھے۔ وہ ایسی ڈھیریاں اکٹھی کرتے، آپس میں ایک دوسرے پر بالو یا پانی کی طرح اچھالتے، آپس میں انھیں

Scanned with CamScanner

بانٹتے؛ کسی ڈھیر سے نکلی کسی چمکدار چیز کے لیے ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کرتے، چیختے چلّاتے اور بالک واکانکر اس دنیا کے بند دروازے کے باہر کھڑے چپ چاپ دیکھتے رہتے۔ امتحانات میں اچھے نمبر لے آنے کے باوجود انھیں لگتا کہ وہ دوسرے لڑکوں کے سامنے کمتر، محروم اور بیمار ہیں۔

ایک لڑکا تھا، نِتن پرتاپ سنگھ۔ وہ پاس ہی کے کسی رجواڑے کے گھرانے کا لڑکا تھا۔ فٹ بال اور بیڈمنٹن بہت اچھا کھیلتا تھا۔ اسے گھڑسواری بھی آتی تھی اور لڑکے بتاتے تھے کہ بندوق کی نشانہ بازی میں وہ کرشمے دکھاتا ہے۔ نتن کی حاضری اسکول میں سب سے کم ہوتی تھی۔ کاپی کے صفحات پھاڑ کر وہ ہوائی جہاز، ٹوپی یا کاغذ کے غبارے بنایا کرتا تھا۔ اس کے گھر کے لوگ رئیس تھے اور وہ دو تین بار ہانگ کانگ اور سنگاپور ہو آیا تھا۔

نتن پرتاپ سنگھ لڑکیاں پٹانے میں بھی استاد تھا۔ لڑکیاں اُس سے خوش رہتی تھیں۔ وہ سب سے زیادہ اسی کے ساتھ رہتی تھیں۔ لیکن لڑکے اور استاد اس سے ناراض رہتے تھے۔ سنسکرت کے ٹیچر شری کرشن پربن شاستری کہتے تھے کہ نتن برباد طالب علم ہے؛ طالب علمانہ زندگی تو گروکُل میں عقیدت سے گزارے ہوئے کچھ برسوں کے حصول علم کا نام ہے۔

سائنس پڑھانے والے بنگالی ٹیچر سُنیل ٹھاکر تا، جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کمیونسٹ ہیں اور روس کے ایجنٹ ہیں، نتن کے بارے میں اُن کے خیالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے۔ ان کی رائے میں نتن زمیندار گھرانے کا زوال پذیر نمائندہ تھا؛ وہ لڑکیوں کو سرمایہ دارانہ نظروں سے دیکھتا تھا۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کے بچپن کے سات دن، جب وہ نِتن پرتاپ سنگھ کے ساتھ اس کے گاؤں گئے تھے، ان کی زندگی کے لیے بہت اہم اور تبدیلی لانے والے ثابت ہوئے۔ نتن کے ساتھ انھیں پہلی بار محسوس ہوا کہ فطرت کی طرح انسان کی زندگی کے بھی کچھ اندرونی قانون ہوتے ہیں۔ ان قوانین کی اپنی رفتار ہوتی ہے جسے کسی بھی چیز سے کنٹرول کرنے، روکنے یا خراب کرنے سے ایک ایسے انسان کی تعمیر ہوتی ہے جو حکومت یا معاشرے کے لیے مفید سانچے میں تو ڈھلا ہوتا ہے لیکن وہ انسان بہت فطری، نارمل اور عملی نہیں ہوتا۔

نتن پرتاپ سنگھ کے گاؤں اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں میں واکانکر کو کئی ایسے فطری

اور عملی لڑکوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان لڑکوں کے پاس کوئی ٹائم ٹیبل نہیں تھا۔ گاؤں میں گھڑیاں بہت کم تھیں۔ کوئی دفتر نہیں تھا۔ البتہ اسکول ضرور تھا جس میں بیشتر بچے نہیں جاتے تھے۔ وقت وہاں ندی کی طرح پورے پھیلاو اور سنجید گی کے ساتھ دھیمی رفتار سے بہتا تھا۔

ڈاکٹر واکانکر شہر ہی میں پلے بڑھے تھے۔ گاؤں کا یہ تجربہ ان کی یادداشت کی گہرائی میں کہیں ثبت ہو گیا تھا۔ نتن پرتاپ سنگھ سے ان کی دوستی گہری ہوتی گئی تھی۔

نتن نے واکانکر کے بچپن میں کچھ انوکھے اور مستقل تجربوں کا اضافہ کیا تھا۔ اس نے ایک بار اسکول کے پرنسپل بی ڈی سریواستو کی گیارھویں میں پڑھنے والی لڑکی پُشپا سریواستو کی فراک اٹھا کر اُس کی جانگھیں دکھائی تھیں۔ پُشپا کے سفید، شکن آلود، تھوڑے سے مٹ میلے جانگھیے کی سِلوٹیں لڑکے واکانکر کی اب تک کی زندگی کی چٹان کے اندر کسی بارود کی طرح دھماکا خیز ثابت ہوئیں۔ وہ حالاں کہ گیارھویں کے بورڈ کے امتحان میں امتیازی نمبر لے کر فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے، لیکن اب دوسرے لڑکوں کی خراب دنیاؤں کی کھڑکیاں اور دروازے ان کے لیے کھلنے لگے تھے۔ وہاں مٹر کی پھلیاں تھیں، چاکلیٹ تھے، بالغوں کے لیے پڑھے جانے والے ناول تھے، عورتوں کی ننگی تصویریں تھیں۔ وہاں سنیما ہال تھے، لڑکیاں تھیں اور کئی پوشیدہ کھیل تھے۔ چھُرے بھالے اور پستول بھی تھے۔

کچھ معاملات کو چھوڑ کر، مجموعی طور پر یہ ایک پاک صاف، بے لوث، پُر تجسس، پُرجوش اور پُراسرار بچپن تھا۔ وہاں کوئی بھی لڑکا اپنے آنے والے مستقبل میں موجود کسی کرسی یا خزانے کے لیے رنگین تتلیوں یا ننھے ننھے خرگوشوں کی جستجو نہیں کرتا تھا۔ وہاں کا ایک الگ دستور تھا۔ اس ممنوعہ دنیا کے باشندے لڑکوں کے سرپرست اور والدین، ان لڑکوں کے مستقبل کی فکر میں مبتلا، آپس میں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے، لیکن آنے والے وقت کے عدم تحفظ اور اندیشوں کے خطرات سے بے خبر یہ لڑکے یوں ہی بڑے ہو رہے تھے۔ لڑکے واکانکر، جو اب جوان ہو چکے تھے، ان دونوں دنیاؤں کے شہری ہو رہے تھے۔

وہ اب مسکراتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اُس دنیا کے زیادہ تر لڑکے کامیاب ہوئے ہیں۔ نتن پرتاپ سنگھ صوبائی وزیر رہ چکا ہے۔ کئی دوسرے لڑکے کاروبار اور جرائم وغیرہ دوسرے سماجی پیشوں میں نکل گئے۔ سب کے پاس زر، زمین ہے۔

Scanned with CamScanner

ان کی بیوی جیوتسنا ضرور آج تک یہ نہیں جان پائیں کہ ڈاکٹر واکانکر کبھی بار انھیں فراک اور سفید مٹ میلا، شکن آلود جانگھیا پہننے کے لیے کیوں کہتے ہیں۔

حد ہے کہ اس عمر میں بھی۔

اعلیٰ تعلیم، ملازمت اور شخصیت کی تعمیر

کالج میں بی ایس سی فرسٹ ایئر کرنے کے بعد ڈاکٹر واکانکر پری میڈیکل ٹیسٹ (پی ایم ٹی) میں شامل ہوئے اور میرٹ میں پوزیشن حاصل کرنے کے ساتھ ہی ان کا داخلہ پونا میڈیکل کالج میں ہو گیا؛ کسی سفارش یا رشوت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ والد اور خاندان والے ان سے خوش تھے، حالاں کہ واکانکر کی زندگی پہلے سے کافی بدلی ہوئی تھی۔

واکانکر اب "اے" سرٹیفکیٹ والی فلمیں بھی دیکھتے تھے۔ لڑکیوں سے بات چیت کرنے میں اب انھیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، لیکن شرم وحیا نے کبھی آگے بڑھنے نہیں دیا۔

کئی بار خواہش ہوئی کہ والد سے کہہ کر اپنے لیے ایک اسکوٹر خرید لیں اور لڑکیوں کو پیچھے بٹھا کر گھومیں، لیکن انھیں گھر کی معاشی حالت کے بارے میں مکمل واقفیت تھی لہذا وہ ایسا نہیں کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ لیبارٹری میں ڈائی سیکشن کے لیے کس لڑکی کی ہیلپ کر کے، کسی کو اپنے نوٹس اور کتابیں دے کر، یا کبھی کبھار کسی لڑکی کی فرمائش پر اس کے کفن سے پراٹھا اور سبزی کھا کر ہی وہ خوش اور رومانٹک ہو لیا کرتے تھے۔ ایم بی بی ایس میں اپنے سے دو سال سینیئر شوبتا گھوڑیکر کے ساتھ فینٹسی میں وہ کئی بار مسوری میں ہنی مون منا چکے تھے؛ اُس کی براکا ہک کھول چکے تھے؛ سفید، مٹ میلے، اور شکن آلود جانگھیے میں اسے اپنے کمرے میں گھنٹوں بٹھا چکے تھے۔ لیکن جلد ہی شوبتا گھوڑیکر نے اپنے سکھ بوائے فرینڈ کے ساتھ شادی کر لی اور واکانکر کے سپنوں کے سامنے "راستا بند، کام چالو ہے" کا بورڈ لگ گیا۔

واکانکر کی دلی خواہش تھی کہ وہ میڈیکل کالج ہی میں مستقبل میں ڈاکٹر بن جانے والی اپنی کسی کلاس فیلو یا جونیئر سے شادی کر لیں، لیکن آخر کار شادی ان کے والد اور خاندان والوں کی مرضی سے

اندور کی ہوم سائنس میں گریجویٹ جیوتسنا نامی لڑکی سے ہوئی جو ہارمونیم پر کچھ فلمی گانوں اور بھجنوں کو گا بجا لیتی تھی۔ وہی جیوتسنا اب ان کی بیوی ہے۔

ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں پہنچنے کے دوران ہی واکانکر کی فکریں کچھ گہری ہونے لگیں۔ اس دوران انھوں نے بودھ دھرم، مارکسزم، گاندھی اور تلک کی کتابیں پڑھیں۔ سوامی کریاتری، دین دیال سرسوتی اور دین دیال اُپادھیائے کی کتابیں بھی ان کے ہاتھ لگ گئیں۔ واکانکر کو تعلیم کے بعد کی زندگی مدھیہ پردیش ہی میں گزارنا پڑی، لیکن مراٹھی نسل کے بنیادی سنکاروں کی وجہ سے کسی اَور کے مقابلے میں انھیں وِیر ساوَرکر، تِلک، گولوالکر، اور ہیڈگےور کے نظریات نے زیادہ متاثر کیا۔ اسی مراٹھی نسل کے غرور کو انھوں نے قومی جذبہ کہنا شروع کیا اور چھترپتی شِواجی ان کے ہیرو بنے۔

یہی دور تھا جب وہ رفتہ رفتہ راشٹریہ سوَیم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کی شاکھا میں باقاعدگی سے جانے لگے۔

۱۹۶۵-۶۶ میں کھرگون کے ایک پسماندہ علاقے میں ابتدائی صحت کے سرکاری مرکز میں ان کا تقرر ہو گیا۔ تب سے وہ سرکاری ڈاکٹر ہی رہے۔

اپنی سرکاری ملازمت کے دوران وہ راشٹریہ سوَیم سیوک سنگھ میں مسلسل سرگرم رہے۔ وہ جس علاقے میں ڈاکٹر بن کر جاتے وہاں کے نوجوانوں کو اس سنگٹھن میں آنے اور قومی خدمت کرنے کے لیے اُکساتے۔ وہ انھیں سمجھاتے کہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں یہودیوں کے علاوہ سب سے زیادہ ظلم ہندوؤں ہی پر ہوا ہے۔ اس قوم کو مٹانے کے لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں متحد رہی ہیں۔ یہودیوں کو تو پھر بھی اپنا ایک ملک اسرائیل مل چکا ہے لیکن ہندوؤں کے پاس اپنا کوئی ملک نہیں ہے۔ دوسروں کی غلامی اور چاکری ان کا مقدر رہی ہے۔ ۱۹۴۷ میں قوموں کے نام پر ملک کو تقسیم کرنے والے لوگ اقتدار پر قابض رہنے کے لیے ہندوؤں کو آپس میں لڑاتے رہے ہیں، اور آج تک اپنے ملک میں ان کی حالت مہاجروں کی سی ہے۔

Scanned with CamScanner

بیداریِ نو کے لیے جدوجہد

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، ہندوؤں کی بیداری نو کے لیے لگاتار کام کرتے رہے۔ وہ ڈاکٹری کے پیشے اور سنگھ کے لیے ہمیشہ ایماندار، وفادار اور عقیدت مند رہے۔ وہ کبھی کسی مریض سے ذاتی فیس نہیں لیتے تھے۔ دوسرے سرکاری ڈاکٹر مرکزِ صحت میں آنے والے مریضوں کو ٹال کر انھیں شام کو اپنے گھر پر آنے کے لیے کہتے تھے اور بعد میں اپنی پرائیویٹ فیس وصول کرتے تھے۔ جبکہ ڈاکٹر واکانکر پوری لگن اور ذمے داری کے ساتھ بے لوث جذبے سے مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج کرتے تھے۔ سرکاری ملازمت کے قوانین میں واضح حکم تھا کہ سرکاری معالج کو پرائیویٹ پریکٹس نہیں کرنی چاہیے، لہذا ڈاکٹر واکانکر دوسرے ڈاکٹروں کے کام کو غیر اخلاقی اور غیر قانونی مانتے تھے۔

کئی بار ان کی بیوی جیوتسنا واکانکر، ان کے کچھ دوست اور عزیز رشتے دار سمجھاتے کہ زمانہ بہت تیزی سے بدل رہا ہے، دوسرے ڈاکٹروں کی طرح انھیں بھی پریکٹیکل اور دنیادار بننا چاہیے۔ لیکن ڈاکٹر واکانکر سختی کے ساتھ سرکاری ملازمت میں پرائیویٹ فیس لینے، پرائیویٹ پریکٹس کرنے اور بالائی آمدنی بٹورنے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان کے لیے یہ قانون اور اخلاق دونوں کے خلاف تھا۔

دوسرے ڈاکٹروں کی شہر یا قصبے میں میڈیکل اسٹورز والوں یا دواساز کمپنیوں کے سیلز ایجنٹوں کے ساتھ ساجھ گانٹھ تھی۔ وہ ڈاکٹر سرکاری ہسپتال میں سبسڈی کے ساتھ یا مفت آنے والی سرکاری دواؤں کو سستے داموں کیمسٹوں کو بیچ دیتے تھے۔ ہسپتال آنے والے مریضوں کو علاج کے لیے اپنی جیب سے پیسا لگا کر وہی دوائیں دکانوں سے اونچے بھاؤ میں خریدنی پڑتیں۔ کئی ڈاکٹروں کو تو ہر مہینے سرکاری تنخواہ کے علاوہ کیمسٹوں اور دوا بنانے والی کچھ کمپنیوں سے ماہانہ بھتا بھی ملتا تھا۔ یہ ڈاکٹر مریضوں کو "خاص" دوکانوں یا "خاص" کمپنیوں کی "خاص" دوائیں خریدنے کے لیے مجبور کرتے تھے۔

صوبے کے پس ماندہ دیہی علاقوں میں تو حالت اور بھی عجیب وغریب تھی۔ وہاں کئی پی ایچ سی (پرائمری ہیلتھ سینٹرز) ایسے تھے جہاں تعینات ہونے والا ڈاکٹر مہینوں نہیں جاتا تھا۔ اوپر کے

افسروں کو پٹا کر وہ اپنی تنخواہ لیتا رہتا اور آرام سے اپنے شہر میں پریکٹس کرتا رہتا۔ کئی ڈاکٹر ایسے بھی تھے جو "ریسرچ" کے نام پر تنخواہ اور وظیفے کے ساتھ چھٹی لے لیتے تھے اور اس درمیان یا تو اپنا تبادلہ اپنی پسندیدہ جگہ پر کرا لیتے تھے یا کسی بڑے شہر کے پرائیویٹ پولی کلینک میں اچھی تنخواہ پر لگ جاتے تھے۔ کئی دبئی، کویت وغیرہ خلیجی ممالک کی جانب پیسا کمانے چلے جاتے تھے۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کو بھی ان کے خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ وہ آئیڈیلسٹ نہ بنیں، اپنی سرکاری ملازمت سے فائدہ اٹھائیں اور اس درمیان گوالیار یا للت پور میں اپنی بیوی کے نام سے کوئی نرسنگ ہوم کھول لیں؛ ان کے جیسے شریف اور ایماندار کے لیے سرمایہ کاری کرنے والے بہت سے مل جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹر واکانکر اس کے مخالف تھے۔

انھوں نے وی شانتارام کی فلم "ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی" دیکھ رکھی تھی۔

معاشرتی علیحدگی

کیا یہ اور واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ سرکاری ملازمت میں ڈاکٹر واکانکر ایک مسئلہ بن گئے تھے؟ ان کی وجہ سے دوسرے ڈاکٹروں ہی کو نہیں، پورے محکمۂ صحت کو دقت ہوتی تھی۔ آخر کیا نہیں تھا وہاں؟ پیسا تھا، عزت تھی، بالائی آمدنی تھی، کلب تھے، نرسیں تھیں۔ ایک دو ڈاکٹروں نے ڈاکٹر واکانکر کو سُدھارنے کی کوشش بھی کی۔ انھیں کلب لے گئے، محفل مے نوشی میں شامل کیا، ایک چالو نرس کو ان کے ساتھ صوفے پر بٹھا کر باہر چلے گئے، لیکن ڈاکٹر واکانکر کا بھاری سا سر، سنجیدگی اور اندیشے سے دھیرے دھیرے کانپتا ہوا، شراب کے نشے میں فلسفی ہوتا چلا گیا۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ جس ہسپتال میں ڈاکٹر واکانکر کی پوسٹنگ تھی وہاں کے انچارج سینیئر ڈاکٹر نے کسی گھٹیا کمپنی کی نقلی سپلائی کی بوتلیں اور کچھ انجکشن خریدے۔ ڈاکٹر واکانکر نے یہ کہتے ہوئے اس خریداری کی مخالفت کی کہ آپ لوگ دافعِ درد دواؤں تک تو ایسی عیاری مکاری کر

Scanned with CamScanner

لیں، لیکن براہ کرم کسی انسان کی نسوں کے اندر داخل کی جانے والے انٹراوینس انجکشن کے ساتھ موت کا ایسا کھیل نہ کھیلیں؛ ایسی حالت میں مریض دیکھتے دیکھتے مر سکتا ہے۔ ان کی اس مخالفت کے بعد تمام ہسپتال میں ان کا بائیکاٹ کیا جانے لگا۔ حالاں کہ وہاں ان کی تائید کرنے والے تعداد میں زیادہ تھے لیکن ڈاکٹر واکانکر کے بارے میں یہ افواہ پھیلادی گئی کہ وہ خواہ مخواہ کے اڑنگے باز، دندی، پھندی، سنکی اور پگلیٹ قسم کے انسان ہیں۔

ڈاکٹر واکانکر کو دوسرے سرکاری افسران اور ڈاکٹر اپنے گھر میں یا نائٹ پارٹیوں میں نہیں بلاتے تھے۔ وہ پھر اکیلے رہ گئے تھے، سب سے الگ تھلگ۔ انھوں نے ڈائری لکھنے کی عادت ڈالی۔

لیکن وہ دوسری سطح پر سب سے زیادہ مصروف بھی تھے۔ وہ لگاتار اپنے پیشے اور مریضوں کی خدمت میں لگے رہے۔ ایسا ہونا فطری بات تھی کہ وہ اپنے علاقے میں ہر دل عزیز ہو جاتے، اور ایسا ہوا بھی۔ وہ چوں کہ امراض اور مریضوں کے بارے میں سنجیدہ تھے، میڈیکل سائنس کی نئی کتابیں اور ریسرچ جرنلز پڑھتے رہتے تھے، اور مریض کی حیثیت، حالت اور مرض کی حالت دیکھ کر دوائیں دیتے تھے، ان کا علاج موثر ثابت ہوتا تھا۔ ہسپتال آنے والے زیادہ تر مریض اصرار کرتے کہ نہیں، ڈاکٹر واکانکر سے اپنا علاج کرانے دیا جائے۔

ایسی حالت میں ہسپتال اور محکمۂ صحت میں ان کے خلاف حسد اور مخالفت کا جذبہ اور گہری جڑیں جمانے لگا۔

ڈاکٹر واکانکر نے اپنے پیشے سے دوسرے لوگوں سے اپنی علیحدگی کو پیش نظر رکھ کر اپنی ڈائری کے ایک صفحے پر لکھا:

"میں شدید تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ رفقا کہتے ہیں میں پریکٹیکل نہیں ہوں، میں آدرش وادی ہوں۔ لیکن در حقیقت مجھے اپنے کام کاج میں کہیں آئیڈیلزم نظر نہیں آتا۔ میں صرف یہ کر رہا ہوں کہ زندہ اور بے قصور لوگوں کو نقلی اور مہلک دوائیں نہیں دے رہا ہوں، سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے لوگوں سے پرائیوٹ فیس نہیں وصول رہا ہوں اور دل لگا کر اپنی ڈیوٹی کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔" انھوں نے آخر میں ایک سوال بھی لکھ دیا تھا:

"میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ کیا جو بے ایمان نہیں ہے وہ پریکٹیکل نہیں ہو سکتا؟"

Scanned with CamScanner

ہرِوَنش پنڈت عرف تھکرا مہاراج سے ملاقات

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر نے اپنی تنہائی کا خلا پُر کرنے کے لیے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی شاکھا میں اپنی سرگرمی میں اور اضافہ کر دیا۔ وہ سنگھٹن کے کام میں لگ گئے۔ ان کے علاج میں فیس نہ لینے، مریضوں سے اپنائیت اور مخلصانہ برتاو اور حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر کئی افراد اور خاندان شاکھا میں آنے لگے۔ سنگھ کے نیتا اور عہدے دار رفتہ رفتہ ان کے کارناموں سے واقف اور متاثر ہونے لگے اور انھیں سنگھ کے مخلص اور ایثار پسند کارکن کے طور پر جاننے لگے۔

وِدھان پور نامی جس چھوٹے سے قصبے کے صوبائی مرکزِ صحت میں ڈاکٹر واکانکر کا تقرر تھا، وہاں سے تقریباً آٹھ کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی ندی باہنی کے پار وِیرپور نامی گاؤں میں ہَرِوَنش پنڈت کا گھر تھا۔

ہرونش پنڈت کو بیشتر لوگ اس نام سے نہیں جانتے تھے بلکہ وہ "تھکرا مہاراج" کے نام سے معروف تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ہرونش پنڈت جب بولتے تھے یا کتھا بانچتے تھے تو ان کے منہ سے تھوک نکلتا تھا۔ وہ ذات سے برہمن تھے، کل سے دُوبے، یعنی دُویدی، اور گوتر سے بھاردواج تھے۔

تھکرا مہاراج غریب برہمن تھے۔ صرف پانچ سات ڈسمل زمین تھی جس سے پنڈتائن ساگ بھاجی، اور اساڑھ ساون میں کھیرا بھٹا بو لیتی تھیں۔ گھر کا زیادہ تر خرچ پنڈتائی اور ججمانی سے چلا کرتا تھا۔ کئی منتوں، سونے کے کشتے کھانے اور شدید محنت ومشقت کے بعد پنڈت پنڈتائن کو ایک ہی اولادِ نرینہ نصیب ہوئی تھی۔ لڑکے کا نام تھکرا مہاراج نے پنڈت بھولاشنکر دویدی رکھا تھا، لیکن گاؤں کے لڑکے انھیں "کیدھا مہاراج" کے نام سے جانتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ بھولاشنکر کا کیدا (پیٹ) بہت بڑا اور تربوز کی طرح پھولا ہوا رہتا تھا۔

ہرونش پنڈت پچھلے کچھ برسوں سے بھیانک معاشی تنگ دستی سے گزر رہے تھے۔ اونچی ذات کے لوگوں میں پوجاپاٹھ، کتھاکیرتن، دھرم کرم میں دل چسپی ختم ہوتی جارہی تھی۔ پنڈت جی نے شاستروں میں پڑھ رکھا تھا کہ ہندوؤں میں چھتری، برہمن اور ویش ہی دوبارہ جنم لینے والی ذاتیں ہیں، اور پروہت کا کام برہمن کو انھیں ذاتوں کے لیے کرنا چاہیے۔ شاستروں میں شودروں کے لیے یگ، ہون، اور جنیو سنسکار وغیرہ ممنوع تھے۔ لیکن ممنوع تو بہت سی چیزیں تھیں؛ تھکرا مہاراج

سب کی تعمیل کرتے تو بھوکوں مرجاتے۔ علاقے کے ٹھاکروں اور بنیوں میں نیا فیشن آگیا تھا۔ ان کے یہاں ججمانی ہی نہیں بلکہ اگراسن، کتھایوجن کا کام ہی بہت کم ہو گیا تھا۔ کوئی سنسکار وغیرہ ہوتا تو شہر سے چمچماتا ہوا پڑھالکھا پنڈت بلایا جاتا۔

اسی لیے ٹھکرا مہاراج نے مجبوری میں کیے جانے والے ممنوعہ کام کے طور پر پنڈتائی اور ججمانی کے کام میں اونچ ذات نیچ ذات کا خیال کرنا بند کر دیا۔ اُن دنوں وہ اکثر یہ کہتے ہوئے سنے جانے لگے کہ ذاتیں جنم سے نہیں بلکہ کرم سے ہوتی ہیں، جیسا کام ویسی ذات۔ ضلعے میں کئی کانیں تھیں، نیچ ذات کے بہت سے لوگ روز کی مزدوری کر رہے تھے اور ڈھائی ہزار روپے ماہانہ تک کمار ہے تھے۔ وہ ٹھکرا مہاراج کے نئے ججمان بنے اور اونچی ذاتوں میں ٹھکرا مہاراج کے بارے میں مشہور ہونے لگا کہ یہ لالچی اور بھوکا بنگالی برہمن آج کل تیلی تنبولی، چمار ڈھیمروں کو جنیو پہناتا گھوم رہا ہے۔

اُنھیں دنوں ڈاکٹر واکانکر سے ہرونش پنڈت عرف ٹھکرا مہاراج کی ملاقات ہوئی اور وہ باقاعدگی سے سنگھ کی شاکھا میں آنے لگے۔ وہاں "بھائی جی لوگ" اور "قابلِ احترام بھائیوں" کے پروچن کے علاوہ لاٹھی ڈنڈا چلانا، لیزم ورزش وغیرہ کے پروگرام بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک بار ایک بھائی جی بھوپال سے آئے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ جواہر لال جی کے نہ رہ جانے اور سوتنتر پارٹی کے ختم ہو جانے سے ہندوستانی سیاست کی بنیادوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اسے پُر کرنے کے لیے جو بگولا ملک کی سیاست میں پیدا ہوگا اس میں سب سے تیز رفتار اور ہمہ گیر بگولا "ہندو وادی" سیاست کا ہوگا؛ سنگھ اقتدار میں آئے گا اور پھر اب تک دبائے گئے ہندوؤں کی شان وشوکت دوبارہ قائم ہوگی۔

ٹھکرا مہاراج نے اُس شام ڈاکٹر واکانکر سے علیحدگی میں پوچھا تھا۔ ان کی آواز نشے اور جوش سے تھر تھرا رہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

"ڈاکٹر صاحب! اگر ایسا ہوا تو میرا دل کہتا ہے کہ گاؤں گاؤں ایک بار پھر یگ، ہون ہونے لگیں گے۔ مونڈن، کان چھیدن، جنیو کی رسم جیسے سنسکار پھر سے رائج ہوں گے۔ گئوہتیا پر پابندی لگ جانے سے گھی دودھ کی ندیاں بہنے لگیں گی۔ برہمن کھیر کھائیں گے، شودر خدمت کریں گے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر واکانکر نے بروتش پنڈت کے یقین کو ٹھیس نہیں پہنچائی- وہ سیاسی افق پر خود ہی اس کے آثار دیکھ رہے تھے- ہندو مفاد، اکھنڈ بھارت اور ہندو راشٹر کی بات کرنے والی پارٹی مرکز میں تیسرے نمبر کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی تھی- بھارت سادھو سماج، ہندو مہاسبھا، رام راجیہ پریشد جیسے سنگٹھنوں کی ندیاں ہندوواد کی خاص سیاسی جل دھارا میں اپنے وجود سے محروم ہونے کے لیے بڑھ رہی تھیں، ختم ہو رہی تھیں-

وقت گزر رہا تھا لیکن ڈاکٹر واکانکر کا وِدھان پور سے تبادلہ نہیں ہو رہا تھا- بروتش پنڈت جیسے سادہ لوح، غریب اور جذباتی کارکنوں کو دیکھ کر سنگھ کی سرگرمیوں کے لیے ان کا جوش وخروش اور بڑھ گیا تھا-

بروتش پنڈت شاکھا کی سرگرمیوں کی کھڑکی کے پار اپنی جمہائی کی حیاتِ نو کا منظر دیکھتے- ان کا من کہتا، "بھائی جیوں" پر یقین کرو-

بمبئی سے آنے والے بھائی جی نے کہا تھا کہ گوتم بدھ نے اور مہاویر سوامی نے ہندو دھرم کو بہت نقصان پہنچایا- اگر شنکر آچاریہ نہ ہوتے تو بھارت سے ہندو دھرم نیست و نابود ہو جاتا- بعد میں راجہ رام موہن رائے، گاندھی اور نہرو جیسے لوگوں نے بھی ہندو دھرم کو نقصان پہنچایا ہے- یہ لوگ مغربی ذہنیت کے انسان تھے-

بھائی جی لوگوں کی باتوں کا شاکھا کے عام ممبروں پر گہرا اثر پڑا- ویدک زمانے سے لے اب تک کی ایک بالکل مختلف تاریخ ان کے ذہنوں میں بہت آسان اور فطری انداز سے ثبت کر دی گئی تھی- شاکھا کے بیشتر ممبروں کے گھروں میں مہارانا پرتاپ، چھترپتی شیواجی، گرو گولوالکر، شیاما پرشاد مکرجی کے فوٹو آویزاں نظر آتے تھے-

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر جالاں کہ اپنے سنسکاروں سے ہندو تھے لیکن مسلسل مطالعے اور غور و فکر سے ان کے اندر رفتہ رفتہ بھگتی اور روحانیت کے عناصر بھی گہرائی میں پیدا ہو رہے تھے- وہ کسی بھی تشدد یا ظلم کو دیکھ کر بے چین ہو اٹھتے تھے- خاص طور پر ایک ہندو مندر کی سیڑھیوں پر اسی سال کے بوڑھے گاندھی کے ایک ہندو مہاسبھائی کے ہاتھوں قتل کو ان کا ضمیر اور دل جائز تسلیم نہیں کر سکتا تھا- کئی بار جب وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تو سنگھ کے دانشور عہدے دار ان کے سامنے سور گیہ شیاما پرشاد مکرجی اور دین دیال اُپادھیائے کی مشکوک موت کی مثال

پیش کرتے ہوے کہتے کہ ہندو راشٹر کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے تشدد کا راستا بالکل نہ اپنانے کی بات نہیں سوچی جا سکتی، خاص طور پر ان حالات میں جبکہ دوسرے فرقے بموں اور بندوقوں سے مسلح ہو رہے ہیں اور انھیں باہری ٹریننگ بھی مل رہی ہے۔ وہ جوش میں کہتے کہ اپنے ہی ملک کی آزادی اور دوسروں کی غلامی اور استحصال سے بچنے کے لیے ہندوؤں کو رامائن، مہابھارت اور ویر نایکوں اور جنگجوؤں جیسا انداز اپنانا ہوگا؛ اپنے تحفظ کے لیے جنگ اور تشدد کا راستا تو شری کرشن نے گیتا میں پہلے ہی دکھا دیا ہے۔

ٹھکرا مہاراج تھے تو پینسٹھ برس کے لیکن ایسا وعظ سنتے ہی ان کی بوڑھی ہڈیوں میں نیا جوش بھر جاتا۔ وہ کسی بوڑھے آدم خور شیر کی طرح ہُنکارے بھرنے لگتے، حالاں کہ وہ پچھلے بیس برسوں سے پرانے دَمے کے مریض تھے۔ وہ لاٹھی چلاتے، لیزم بجاتے، میدان میں تھوڑا بہت دوڑتے اور انھیں لگتا کہ لاٹھی، لیزم اور تشدد کے ذریعے ہندو راشٹر، ورن آشرم حالت اور جسمانی کے مقاصد اپنے جیتے جی ضرور حاصل کرلیں گے۔

الجھن اور تذبذب

شہر کے سب سے بڑے کپڑا بیوپاری شری کومل چند گپت، جو علاقائی شاکھا کے منتظم بھی تھے، کہتے تھے کہ اتنی حسین اور اتنی سائنٹیفک تقسیم تھی ہندو سماج کی؛ اسے مسلمانوں، عیسائیوں، ہوڑوں اور جوان ترک ذاتوں نے برباد کر ڈالا۔ سب کچھ درست اور جوں کا توں کرنے کے لیے ہندوؤں کو اپنے اندر ہٹلر پیدا کرنا ہوگا۔ گرو گولوالکر جی نے بھی بہترین جرمن نسل کی بھلائی کے لیے کی گئی ہٹلر کی کارروائیوں کی تعریف کی تھی۔

ڈاکٹر واکانکر بھرپور عقیدت اور لگن کے ساتھ سنگھ کی پبلسٹی میں لگے تو ضرور تھے لیکن بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے، چیزوں کو گہرائی سے جاننے اور سمجھنے کے ناقابلِ تسخیر تجسس نے ان کے ذہن کو کبھی چین نہیں لینے دیا۔ انھوں نے نیٹشے کو پڑھا، ''مین کاف'' کو دیکھا، گرو جی کی کتاب ''بی آنڈ اور نیشن ہُڈ ڈیفائنڈ'' پڑھی۔ وہ الجھنوں میں گرفتار ہوتے گئے۔

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر واکانکر اگر بہترین اور کمترین انسانی نسلوں نسلوں کے اصول سے ایک بار متفق بھی ہو جاتے تب بھی ان کا ضمیر اسے قبول نہ کرتا۔ ان کی روح کہتی کہ اگر یہ سچ بھی ہو تو کمترین نسلوں کو مارا یا ستایا کیوں جائے؟ اگر یہ مان بھی لیں کہ جرمن نسل کے مقابلے میں یہودی، نیگرو، منگول، میکسیکن یا ہندوستانی نسلیں کمتر اور شودر ہیں تو کیا انھیں اس زمین پر رہنے، جینے، پیار کرنے، اور اپنی دنیا بنانے کا کوئی حق نہیں ہے؟

ڈاکٹر واکانکر تو ڈاکٹری کے پیشے میں آئے ہی اس لیے تھے کہ وہ مرتے ہوئے انسانوں کو نیا جیون دیں۔ ایسے اصول جو جغرافیائی، نسلی، اور جینیٹک اسباب سے کم ترقی یافتہ یا پس ماندہ نسلوں کو زمین سے نیست و نابود کرنے پر آمادہ ہوں، انھیں کچھ کچھ حیوانی اور شیطانی اصول لگتے۔ کیا دھرتی پر صرف جرمن اور یونانی ہی رہیں گے؟ کیا بھارت میں صرف کشمیریوں اور پنجابیوں ہی کو رہنا چاہیے؟ اگر دنیا میں صرف بہترین نسلیں ہی حکومت کریں گی تو پھر لاغر، روئیں دار ٹانگوں، پھولے پچکے پیٹ اور اوسطاً ساڑھے پانچ فٹ والے اونچائی والے، بے ڈھنگے، ہڑیلے، توندیل، کالے کلوٹے ہندوستانی کہاں جائیں گے؟

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر نے اپنی ڈائری میں لکھا:

"زولوجی کا شروع سے طالبِ علم کے ہونے کے ناتے میں نے میڈیل اور ڈارون کے اصولوں اور جان ڈلٹروں کے ارتقا کے بارے میں نظریات کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ میں سروائیول آف فٹیسٹ جیسے سنگ دل اور بھدے اصول سے بھی واقف ہوں۔ لیکن کبھی کبھی اپنے اندر سے ابھرنے والی روح کی آواز سنتا ہوں۔ یہ میرے ہی اندر کسی نامعلوم گوشے سے اتی ہے۔ شاید میری روح یہ چاہتی ہے کہ یہ زمین ایسی رہے جس میں صرف ترقی یافتہ اور طاقتور ذی حیات ہی کی نہیں، کم زور، ملائم اور کم ترقی یافتہ جانداروں کی بھی رہائش ہو؛ ایک ایسی زمین، ہو جس میں تتلی، پتنگے، سانپ، مور، ہرن، خرگوش، ہاتھی، شیر، پیڑ پودے، گھاس پھوس بھی رہیں اور کالے، گورے، پیلے، کلوٹے، رنگ برنگے انسانوں کی سب نسلیں اور ذاتیں بھی۔ یہ تمام فطرت، یہ کل کائنات ایشور کی کائنات ہے۔ یہ سب کچھ جو دیکھا اور اَن دیکھا ہے، کسی کی تخلیق ہے، بھلا اس کی کوئی ایک مخلوق اپنی برتری کے غرور اور صرف اسی دلیل پر باقی تمام مخلوق کو برباد کرنے کا خیال کیسے پروان چڑھا سکتی ہے؟"

یہ سچ تھا کہ ڈاکٹر واکانکر ان موضوعات پر جس قدر زیادہ سوچتے، انھیں اپنے اندر کے کسی تاریک گوشے سے آتی آتما کی آواز دھیرے دھیرے واضح طور سنائی دینے لگتی۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ آواز آتما ہی کی تھی۔ انھوں نے اپنی ڈائری کے اسی صفحے پر ایک جملہ الگ سے لکھا تھا۔ اس جملے کی لکھاوٹ ٹیڑھی میڑھی اور بھونڈی سی تھی؛ شاید اسے لکھتے ہوئے ان کی تمام توانائی کسی گھرے خیال کا کوئی سرا پکڑنے کے لیے کوشاں تھی اور ان کی انگلیاں تھک چکی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے فسطائیت یا کوئی دوسرا خود پسند یا نسلی اصول خدا کے خلاف شیطان کی سازش ہے۔ اوم شانتی! شانتی! شانتی!"

ہرونش پنڈت عرف ٹھکرا مہاراج کی موت یعنی قتل

اُس روز شام کو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ یہ بے وقت کی بوندا باندی تھی۔ دو دن پہلے صبح صبح پالا گرا تھا۔ رات میں درجۂ حرارت چار ڈگری سے بھی نیچے تھا۔ شہروں میں لوگ ہیٹر، قصبوں میں سگڑی اور گاؤں میں چولھوں اور الاؤ کے آس پاس سمٹ کر ٹھنڈ سے بچ رہے تھے۔

رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے ہوں گے جب کسی نے ڈاکٹر واکانکر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اس وقت رضائی میں گھسے ہوئے تھے۔ انھوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر سردی کے علاوہ تیز برفیلی ہوا کے جھونکے بھی تھے۔

ڈاکٹر واکانکر نے برآمدے کی لائٹ جلائی تو جُوٹ کے بورے کو اپنی پیٹھ پر اوڑھے ہوئے وِیرپور گاؤں کا سبھدر اکھار کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ٹھکرا مہاراج کو دَمے کا شدید دورہ پڑا تھا اور جب وہ وہاں سے ڈاکٹر واکانکر کو بلانے کے لیے سائیکل پر چلا تھا اُس وقت ٹھکرا مہاراج سانس لینے کے لیے پھڑپھڑا رہے تھے اور ان کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

ڈاکٹر واکانکر نے تیار ہو کر اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو وہ اسٹارٹ نہیں ہوا۔ انھوں نے سوچا شاید ٹھنڈ سے ایسا ہوا ہو گا۔ اسکوٹر کو باہر نکال کر انھوں نے سبھدر اکھار سے دھکا

لگوایا تب بھی اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ انھوں نے پلگ نکال کر اس کا کاربن صاف کیا۔ اس کے بعد بھی اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ وہ تھوڑا سا گھر گھرا کر بند ہو جاتا تھا۔ ایکسی لیٹر پورا گھمانے یا چوک لینے پر بھی کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر واکانکر سمجھ گئے کہ سائیلنسر میں کاربن بھر گیا ہے اور پائپ اندر سے جام ہے۔ انھوں نے سائیلنسر کھول ڈالا۔ ان کے ہاتھ اور کپڑے کوئلے، موبل اور گریز سے کالے پڑ گئے تھے۔

وہ ابھی سائیلنسر سے کاربن نکالنے ہی والے تھے کہ ان کی بیوی نے آکر بتایا کہ اگر انھیں ہرونش پنڈت کو دیکھنے جانا ہے تو وہ جلدی جائیں کیوں کہ اسکوٹر ٹھیک کرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا ہے۔

سبھدرا کھار کی سائیکل کے چلتے ہوئے کیریئر پر بیٹھ کر بوندا باندی، ٹھنڈی ہوا اور دبیز تاریکی میں گاؤں جانے والی اوبڑ کھابڑ کچی سڑک سے ڈاکٹر واکانکر ویرپور میں شنکر امہاراج کے گھر پہنچے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جب وہ ہرونش پنڈت کو بتائیں گے کہ آج پاکستان فیصلہ کن طور پر دو ٹکڑوں میں ٹوٹ گیا ہے، بنگلادیش آزاد ہو چکا ہے اور دنیا کی تاریخ میں پہلی بار نوے ہزار سے زیادہ پاکستانی فوجیوں نے بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں، تو ہرونش پنڈت کے بیمار پھیپھڑوں میں نئی تازہ ہوا آجائے گی۔

ڈاکٹر واکانکر کو آج صبح اخبار کے پہلے صفحے پر چھپا وہ فوٹو بار بار نظر آرہا تھا جس میں جنرل جے ایس اروڑا کے سامنے شرم سے گردن جھکائے پاکستانی لیفٹیننٹ جنرل نیازی ہتھیار ڈالنے کے کاغذات پر دستخط کر رہا تھا۔ واکانکر سکھوں کی بہادری، قربانی اور اس ملک کے لیے کیے گئے ان کے ایثار پر فدا ہوئے جا رہے تھے۔ سوا لاکھ سے ایک لڑاؤں، تب گووند سنگھ نام کہاؤں۔ دسویں گرو گووند سنگھ نے ہندوؤں کی حفاظت ہی کے لیے تو کھڑگ اختیار کیا تھا۔

لیکن مٹی کے اس چھوٹے سے گھر میں صرف کیروسین کی ایک ڈِبری جل رہی تھی جس کی لو رہ رہ کر کانپ اٹھتی تھی۔ ہرونش پنڈت کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ ایک ایک سانس کے لیے جُوجھ رہے تھے۔ جیسے ہی ایک سانس پورا ہوتا، ہرونش پنڈت کا بوڑھا لاغر جسم اگلے سانس کو جلد از جلد تلاش کرنے کے لیے تڑپ اٹھتا۔

شنکر امہاراج نے جب ڈاکٹر واکانکر کی جانب دیکھا تو ان کی آنکھوں میں زندگی کی امید چھوڑ

Scanned with CamScanner

دینے والی راکھ تھی۔ ان کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں، لیکن ان میں ڈر نہیں بلکہ کسی جنم بھر کے بھوکے، محروم اور مفلس برہمن کی فریاد تھی؛ زندگی کے صرف چند اَور سانسوں کی فریاد۔

ڈاکٹر واکانکر سے ٹھکرا مہاراج کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ انھوں نے انھیں نیند کا انجکشن لگایا اور بیل گاڑی میں لٹا کر ابتدائی مرکزِ صحت، ودھان پور، کے لیے روانہ کر دیا۔ باہر بوندا باندی تیز ہونے لگی تھی۔ رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ ہوا میں برف کی تیز دھار والی چھریاں چھپی تھیں۔ ٹھکرا مہاراج کو بیل گاڑی میں پیال بچھا کر لٹایا گیا تھا اور ان کے اوپر ترپال کا چھاجن بنا دیا گیا تھا تاکہ وہ بھیگ نہ جائیں۔ انجکشن کی وجہ سے وہ گہری نیند میں تھے۔

ڈاکٹر واکانکر پرانے دمے کے مریضوں سے بخوبی واقف تھے؛ جب ان پر دمے کا دورہ پڑتا ہے تو وہ ایسی حالت میں پہنچ جاتے ہیں جیسے بس اب ان کی آخری گھڑی آ گئی ہے، لیکن انھوں نے اپنے برسوں کے تجربوں سے یہ سمجھ لیا تھا کہ دمے کے مریضوں کی اوسط عمر دوسرے مریضوں ہی نہیں صحت مند لوگوں کے مقابلے میں بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انھوں نے دمے کے مریضوں کو اسی نوے سال تک یوں ہی جیتے ہوئے دیکھا تھا۔

ٹھکرا مہاراج گہری نیند یا کسی کوما میں تھے۔ ڈاکٹر واکانکر مطمئن تھے۔ رات کے پونے تین بجے انھوں نے سسٹر یونما سے کہا کہ وہ ہرونش پنڈت کو گلوکوز چڑھا دیں۔ یونما ودھان پور میں صوبائی مرکزِ صحت کے دیے ہوئے دو کمروں کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ بہت دبلی پتلی تھی اور اسے ایگزیما تھا۔ اس کا گھر ہسپتال سے متصل تھا۔

ڈاکٹر واکانکر تقریباً تین چالیس پر گھر لوٹے تھے۔ وہ بری طرح تھک چکے تھے۔ آنکھیں نیند سے بھاری ہو رہی تھیں۔ ٹھنڈ، نمی، موبل اور گریز کی بُو، کالک اور تھکان۔ انھیں یاد آیا کہ انھوں نے رات میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں سو رہی تھیں۔ وہ کسی کو جگائے بغیر کچن میں گھسے۔ سارے برتن دھلے دھلائے رکھے تھے۔ انھوں نے فرج کھول کر دیکھا۔ اس میں دودھ اور چند کیلوں کے سوا پکے ہوئے کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔

وہ لوٹ کر اپنے بستر پر گر گئے تھے اور دس منٹ کے اندر ہی ان کے خراٹے بلند ہونے لگے۔

صبح ساڑھے پانچ بجے ہی کسی نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ جیوتسنا واکانکر نے، جو اس

وقت پھٹے ہوئے پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھیں، اٹھ کر دروازہ کھولا۔ آسمان میں بے وقت کے بادل ابھی چھٹے نہیں تھے۔ باہر سسٹر یونما اُلٹی سیدھی حالت میں کھڑی تھیں۔ ساتھ میں سبھدرا کہار تھا۔ شکرا مہاراج کا لڑکا پنڈت بھولاشنکر دوبے عرف کیدھا مہاراج بھی کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ جیوتسنا واکانکر کا بایاں پستان پھٹے ہوئے بلاؤز سے باہر جھانک رہا تھا اس لیے وہ فوراً مڑ کر اندر آ گئیں۔

ڈاکٹر واکانکر کو بیدار کرنے میں کافی محنت کرنی پڑی؛ وہ بہت گہری نیند میں تھے۔ بیدار ہونے کے بعد ان کی آنکھیں بُری طرح سے لال تھیں جیسے ان میں خون اتر آیا ہو۔ ویسے ایسا بائی بلڈ پریشر یا بلڈ پریشر کے غیر متوازن ہونے سے ہوتا ہے۔

سسٹر یونما نے جب بتایا کہ ہرونش پنڈت کی موت ہو گئی ہے تو ڈاکٹر واکانکر کو سمجھنے میں تھوڑا وقت لگا۔ پھر انھیں تعجب ہوا اور شدید صدمہ بھی محسوس ہوا۔ ان کی نیند کافور ہو گئی۔ وہ اسی حالت میں، ہاتھ منھ دھوئے بغیر، چپل پہن کر لپکتے ہوئے ہسپتال پہنچے۔ پنڈتائن باہر برآمدے میں بیٹھی زور زور سے رو رہی تھیں۔ ساتھ میں گاؤں کی دو ایک عورتیں اور کچھ مرد تھے۔ ہرونش پنڈت کی بہو بھی وہاں تھی۔

ڈاکٹر واکانکر نے ابتدائی مرکز صحت، ودھان پور، کے اِنڈور پیشنٹ نمبر ۱۷، شری ہرونش پنڈت عرف شکرا مہاراج، ساکن ڈیہہ ویرپور، تھانا اور پوسٹ آفس ودھان پور، ضلع رائے گڑھ پن کوڈ ۵۲۰۰۳۰۷، کو دیکھا۔ مُردہ جسم لوہے کے پلنگ پر پڑا تھا۔ ایک ہاتھ چھاتی پر تھا۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، کی نگاہ اسٹینڈ پر لٹکتی گلوکوز کی بوتل کی جانب گئی۔ وہ سمجھ گئے۔ انھیں یہی شک ہوا تھا۔ بوتل کے اندر اس کے صاف شفاف سیال کی سطح پر فنگس کے تھکّے تیر رہے تھے۔ یہ شاید کسی میڈیکل اسٹور سے ایکسپائری کے بعد کی بلیک سپلائی ہے۔ "ہتیارے!" وہ بڑبڑائے۔ انھوں نے لیبل پر پڑی ہوئی ایکسپائری کی تاریخ دیکھی۔ اس جگہ لکھی تاریخ کو چاقو کی نوک سے کھرونچا گیا تھا۔ اس کے باوجود تاریخ سمجھ میں آتی تھی۔

ابتدائی مرکز صحت، ودھان پور، کے چیف ڈاکٹر اور انچارج، ڈاکٹر ڈی این مصرا، نیا بجٹ ملتے ہی ایکسپائری کے بعد کی دوائیں یا نقلی دوائیں فرضی فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے ایجنٹوں یا کیمسٹوں سے کمیشن کی بنیاد پر خرید ا کرتے تھے۔ انھیں کافی آمدنی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر واکانکر نے

اس پر کئی بار اعتراض کیا تھا، جس کے بعد واکانکر کے کئی حقیقی بلوں اور رسیدوں کا بھگتان لمبی مدت تک روک دیا گیا تھا اور ان کی چھٹی کی درخواستیں منظور نہیں کی گئی تھیں۔

چیف میڈیکل آفیسر ڈاکٹر ڈی این مصرا کی مقامی نیتاؤں، تاجروں، تحصیل دار، اور تھانےدار سمیت دوسرے سرکاری افسروں سے خوب پٹتی تھی۔ ان لوگوں نے رات میں شراب پینے اور تاش کھیلنے کے لیے ایک آفیسرز کلب بھی بنا رکھا تھا۔ اس گروپ کے الگ طور طریقے تھے جنھیں بھارتی حکومت نے اپنی طویل تاریخ میں حاصل کیا تھا۔

انھیں میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ کسی غیر ضروری اور ایمان دار ماتحت کو چھوٹے موٹے غیر ظاہر طریقوں سے اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے اتنا تنگ کرو کہ وہ غصے یا دکھ سے پھٹ پڑے اور پھر اسے قانون کے مطابق چارج شیٹ دے کر سزا دو۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پندھنائن کی دہاڑیں مار کر روتی ہوئی بے چین اور بوڑھی آواز پورے مرکزِ صحت کو ہلا رہی تھی۔ ہرونش پنڈت ایکسپائری کے بعد کے گندے، گھٹیا اور نقلی گلوکوز کے نسوں کے اندر انجکٹ کیے جانے سے سرکاری ہسپتال میں مرے تھے۔ ایک طرح سے انھیں قتل کیا گیا تھا۔ ٹھگرا مہاراج راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے ایک باعزت دیہاتی کارکن تھے اور انھیں یقین تھا کہ ان کے جیتے جی ہی جمبانی، ورن آشرم اور ہندوراج قائم ہو جائے گا اور ان کی پندھنائی پھر سے پرکھوں کے زمانے کی طرح چل پڑے گی۔ جمانوں کے نیوتے سے وہ کھیر پوری اپنے گمچھے میں باندھ کر گھر لایا کریں گے۔ اگر وہ کل کے اخباروں میں چھپا لیفٹیننٹ جنرل جے ایس اروڑا اور پاکستانی لیفٹننٹ جنرل نیازی کا فوٹو دیکھتے تو جوش میں کہتے، "ڈاکٹر صاحب، دیکھو ایک روڑا ہٹ گیا، ہندوؤں کی قسمت کی رکاوٹ ہٹ گئی۔ اب اکھنڈ بھارت بن کر رہے گا۔ ست سری اکال اروڑا جی..." اور یہ بات کہتے ہوئے ان کے منہ سے تھوک ضرور نکلنے لگتا۔ اسی لیے ان کے گاؤں کے لوگ انھیں ہرونش پنڈت کے نام سے نہیں بلکہ ٹھگرا مہاراج کے نام سے جانتے تھے۔

ڈاکٹر واکانکر نے وہیں ہسپتال میں اپنے لیٹر ہیڈ پر چیف میڈیکل آفیسر ڈاکٹر ڈی این مصرا کو ایک بہت سخت خط لکھا۔ اس میں انھوں نے صاف صاف لکھا کہ آپ ہرونش پنڈت کے قاتل ہیں۔ آپ جیسے عیار اور لالچی ڈاکٹروں کی وجہ سے ایک نہیں ہزاروں بے قصور مریضوں کی

موتیں ہو رہی ہیں۔ آپ انسانی زندگی کے ساتھ موت کا شیطانی اور مجرمانہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ ہرونش پنڈت اس ملک کے ایک شہری تھے؛ وہ اس ابتدائی مرکزِ صحت میں بھرتی کیے گئے ایک انڈور پیشنٹ تھے؛ وہ ایک برہمن تھے، اور شاستروں میں برہمن کے قتل سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔ آپ جیسے ڈاکٹر تمام معاشرے اور انسانیت کے علاوہ ہندو دھرم کے لیے بھی ایک بدنما داغ ہیں۔ آپ کو میں نے کئی بار مقامی مندر میں پوجا چڑھاوا کرتے اور پرشاد چرن امرت لیتے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو اپنے دھرم سے کوئی عقیدت ہے تو یہ واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ آپ پاپی اور گناہگار ہیں۔ قانون کے نقطہ نظر سے بھی آپ نے جرم کیا ہے اور تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۳۰۴ کے تحت آپ پر ہومی سائڈ کا مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔

ڈاکٹر واکانکر کے اس غضب آلود خط کا آخری پیراگراف تھا:

"میں اپنے ساتھ گلوکوز کی بوتل، شرما میڈیکل اسٹور کو دیا ہوا آپ کا ۸۰ بوتلوں کا آرڈر، اور اسٹاک سے متعلقہ کاغذات لیے جا رہا ہوں۔ نقلی دواؤں، خاص طور پر لائف سیونگ ڈرگز اور مریض کی نسوں کے اندر انجیکٹ کرنے والی انٹراوینس انجکشنوں، کے معاملے میں مہلک اور سنگین بے ایمانی نہ کرنے کی گزارش میں نے آپ سے ایک بار نہیں کئی بار کی ہے، رسمی طور پر بھی اور غیر رسمی طور پر بھی۔ آپ نے میری درخواست پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ ناسمجھی میں یہ جرم نہیں کر رہے کہ بلکہ دراصل آپ پیشہ ور مجرم ہیں۔ میں اپنے دھرم، اپنے پیشے اور ایشور کی قسم کھا کر آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ آپ اپنے کرتوتوں سے باز آئیے، ورنہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کس حد تک جا سکتا ہوں۔"

ہرونش پنڈت کی موت سے ڈاکٹر واکانکر اتنے مغموم، افسردہ اور تناؤزدہ تھے کہ انھوں نے اس خط کو ایک لفافے میں بند کر کے ایک ہفتے کی چھٹی کی ایک درخواست بھی لکھ ڈالی اور دونوں چیزیں سسٹر یونما کو تھما کر اپنے فلیٹ میں لوٹ آئے۔

جیوتسنا واکانکر اور ان کی بیٹی پوجا نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے ان میں خون اتر آیا ہو۔ وہ اپنے بستر پر گر پڑے اور جلد ہی ان کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

ڈاکٹر واکانکر کی آنکھوں کے اس طرح سرخ ہونے اور ناک اور گلے سے نکلتی ایسی خرخراہٹ

سے جیوتسنا واکانکر سمجھ گئیں کہ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے اور غیر متوازن ہے۔

ٹرانسفر کا حکم

دوپہر ڈھائی بجے تک ڈاکٹر واکانکر کے خراٹے گونجتے رہے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ابتدائی مرکزِ صحت کا جونیئر ڈاکٹر سریش گپتا ان سے ملنے آیا تھا۔ اس نے تین سال قبل ہی سرکاری ملازمت جوائن کی تھی۔ وہ پی ڈبلیو ڈی کے ودھان پور آفس میں ایس ڈی او، شری دین دیال گپتا، کا بھانجا تھا۔ "ڈمی ڈمی" کے نام سے مشہور دین دیال گپتا کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ودھان پور میں آنے کے بعد اس نے گزشتہ چار برسوں میں پینتیس چالیس لاکھ روپے کمائے ہیں۔ سڑکوں کی مرمت اور پلوں کی منظور شدہ اسکیموں میں گھپلے اور ٹھیکے داروں اور ملازموں کی ملی بھگت کے دم پر اس نے یہ کمائی کی تھی۔

ڈاکٹر سریش گپتا اسی ڈمی ڈمی کا بھانجا تھا۔

چائے پینے کے بعد ڈاکٹر گپتا نے ڈاکٹر واکانکر سے گزارش کی کہ وہ گلوکوز کی بوتل، ہسپتال کے اسٹاک کے کاغذات اور شرما میڈیکل اسٹور کو ڈاکٹر مصرا کے دیے ہوئے آرڈر کی کاپی ڈاکٹر مصرا کو لوٹا دیں۔ ڈاکٹر مصرا ان سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ واقعی پریشان اور دکھی ہیں۔

ڈاکٹر واکانکر نے جواب دیا کہ ان کا ڈاکٹر مصرا سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔ وہ اگر ان کے گھر آئیں تو انھیں خوش آمدید کہیں گے۔ رہی بات بوتل اور کاغذات لوٹانے کی تو ڈاکٹر وانکر نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوگا کیوں کہ اگر یہ ثبوت انھوں نے ڈاکٹر مصرا کو واپس کر دیے تو ڈاکٹر مصرا انھیں تنگ کر ڈالیں گے۔

ڈاکٹر سریش گپتا سے انھوں نے کہا کہ اپنے پاس یہ ثبوت وہ ڈاکٹر مصرا کو سزا دلانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے تحفظ کے لیے رکھنا چاہتے ہیں۔

اسی رات ساڑھے آٹھ بجے ابتدائی مرکزِ صحت، ودھان پور، کے چیف میڈیکل انچارج ڈاکٹر ڈی این مصرا ان کے گھر تشریف لائے۔ حالاں کہ وہ ڈاکٹر واکانکر کے پاس تھے لیکن ان کے سامنے

Scanned with CamScanner

اس طرح برتاو کر رہے تھے جیسے ڈاکٹر واکانکر ان کے آفیسر ہوں۔

جیوتسنا واکانکر جب چائے دینے آئیں تو ڈاکٹر مصرا نے اٹھ کر انھیں بھابی کہتے ہوے آداب عرض کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ہرونش پنڈت کی ودھوا پنڈتائن کو ویرپور میں دس ہزار روپے نقد دے کر آئے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر واکانکر کی بیوی جیوتسنا سے علیحدگی میں بات کی۔ جیوتسنا واکانکر نے آکر ڈاکٹر واکانکر کو سمجھایا کہ اب جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ڈاکٹر مصرا کے دل میں ہرونش پنڈت کی موت کے لیے گہری ندامت ہے۔ وہ دس ہزار روپے پنڈتائن کو دے ہی چکے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اگر ڈاکٹر واکانکر کہہ دیں تو وہ انھیں اور بھی روپے دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مصرا نے ڈاکٹر واکانکر کی خوب خوب تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ ان جیسے بےلوث اور مثالی ڈاکٹر محکمۂ صحت کی شان ہیں۔

خیر، بعد میں یہ ہوا کہ جیوتسنا واکانکر نے اپنے شوہر سے رضامندی لے کر ڈاکٹر ڈی این مصرا سے ڈاکٹر واکانکر کا لکھا ہوا خط واپس لیا اور انھیں گلوکوز کی بوتل اور تمام کاغذات واپس لوٹا دیے۔ ڈاکٹر سریش گپتا اسی دن سے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا ممبر بن گیا۔ اس نے ڈاکٹر واکانکر کی قدم بوسی کرتے ہوے کہا کہ آج سے وہ بھی ان کی طرح ہسپتال میں دھاندلی کے خلاف جنگ کرے گا۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر اُداس تھے۔ ہرونش پنڈت کی موت دمے سے نہیں ہوئی تھی؛ انھیں قتل کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس رات ڈائری میں لکھا:

"مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر روز ہزاروں قتل ہو رہے ہیں، نقلی دواؤں، زہریلی شراب، غنڈوں اور مجرموں کے منظم گروہوں اور پولیس کے استحصال اور حکومت کی گولاباری سے۔ اس کا کسی مذہب اور فرقے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک مکمل طور پر بگڑا ہوا اور مجرم نظام بن چکا ہے جس کے تشدد اور لُوٹ پاٹ کے سامنے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ سامنے والا ہندو ہے یا مسلمان یا کسی اَور فرقے کا۔ بنگلادیش میں بھی مسلمانوں ہی نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا؛ ہزاروں عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا تھا اور لاکھوں مہاجروں کو ان کے گھر گاؤں سے اُجاڑ کر خانہ بدوش بنا دیا گیا تھا۔

"یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک میں ہندو ہی ہندوؤں کے ہاتھوں ہلاک کیے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر

Scanned with CamScanner

ڈی این مصرا بھی ہندو تھے اور ہرونش پنڈت بھی۔ مہلک دواؤں کے تاجر بھی ہندو ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں سے کئی ہندو راشٹر نظریے کے ہم درد ہیں اور سنگھ کو مالی امداد دیتے رہتے ہیں۔"

ڈاکٹر واکانکر نے ڈائری کے اس صفحے پر آخر میں ایک سوال لکھا تھا:

"یہ سوال بار بار میرے ذہن میں انگڑائیاں لیتا ہے کہ اگر کبھی مستقبل میں ہندو راشٹر بنا تو وہ کس ہندو کا راشٹر ہوگا ___ ڈاکٹر ڈی این مصرا کا یا شنکرا مہاراج کا؟"

ابھی ایک ہفتے کی چھٹی چل رہی تھی۔ ڈاکٹر واکانکر ہسپتال تو نہیں جارہے تھے لیکن شام کو شاکھا میں باقاعدگی سے جاتے تھے۔ وہاں انھیں رام سنیہی بھائی جی نے بتایا کہ ڈاکٹر سریش گپتا ابھی تین دن سے شاکھا میں آرہا ہے لیکن اس نے ابھی سے ان کے بارے میں اناپ شناپ باتیں پھیلانا شروع کر دی ہیں۔ رام سنیہی بھائی جی نے کہا کہ کہیں ڈاکٹر سریش گپتا کو ڈاکٹر مصرا ہی نے تو شاکھا کا ممبر نہیں بنوایا ہے تاکہ وہ وہاں ڈاکٹر واکانکر کی جڑیں کاٹ سکے۔

پانچویں دن ہیڈ آفس کے سرکاری ہسپتال سے ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر، ڈاکٹر این ای اگنی ہوتری، سول سرجن، کے آرڈر نمبر ۲۶ ڈی / ۱۷ / ۱۳ کے تحت ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کا تبادلہ دور دراز آدی واسی علاقے ڈھونگر گاؤں کے ابتدائی مرکزِ صحت میں کر دیا گیا۔ انھیں اڑتالیس گھنٹے کے اندر اپنا تمام کام ڈاکٹر سریش گپتا کے حوالے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اگلے دن ضلع رائے گڑھ سے نکلنے والے ہفتہ وار اخبار "رائے گڑھ وانی" میں ہرونش پنڈت کی ودھوا پنڈتائن کرم وتی کی جانب سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نام ایک خط چھپا تھا جس میں اپنے شوہر کی موت کی ذمے داری انھوں نے ڈاکٹر واکانکر پر عائد کی تھی اور انتظامیہ سے درخواست کی تھی کہ ہرونش پنڈت کی موت کی مکمل تحقیقات کرائی جائے۔

جیوتسنا واکانکر کے لیے یہ بے ایمانی اور سازش ناقابلِ برداشت ثابت ہو رہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ پھر وہ ڈاکٹر ڈی این مصرا سے براہ راست دو ٹوک بات کرنے کے لیے ان کی قیام گاہ کی طرف چلیں۔ ڈاکٹر واکانکر نے منع کیا لیکن بے سود۔ انھوں نے کہا کہ "میں جا کر اس کا منھ نوچ لوں گی۔"

جیوتسنا واکانکر جب ابتدائی مرکزِ صحت، ودھان پور، کے چیف میڈیکل آفیسر اور انچارج، ڈاکٹر ڈی این مصرا، کے بنگلے پر پہنچیں تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پتا چلا کہ مصرا اپنی فیملی کے ساتھ ایل

ٹی اے لے کر پندرہ دن کی چھٹی منانے دہرہ دون چلے گئے ہیں۔

کالے پانی کی سزا

ودھان پور سے ڈھینگر گاؤں میں آئے ہوئے ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کو تقریباً چودہ سال ہو گئے۔ نہ ان کا پروموشن ہوا، نہ تبادلہ۔ صرف تنخواہ میں سالانہ انکریمنٹ لگتا رہا۔

ڈھینگر گاؤں میں ڈاکٹر واکانکر خوش تھے، حالاں کہ انھیں وہاں بطورِ سزا بھیجا گیا تھا۔ کتابیں اور جرنلز وہاں دیر سے پہنچتے تھے، لیکن اس آدی واسیوں کی اکثریت کے علاقے میں جھنجھٹ کم تھے۔

ڈھینگر گاؤں ست پڑا کے پہاڑی سلسلے کے ایک پہاڑ کی چوٹی سے لے کر وادی تک بسا ہوا ایک تصویر جیسا خوبصورت قصبہ تھا۔ البتہ وہاں کی سڑکیں ٹھیک نہیں تھیں، ذرائع آمدورفت کم تھے اور شہر میں ملنے والی نت نئی استعمال کی اشیا وہاں کی دکانوں پر نظر نہیں آتی تھیں۔ مثلاً وہاں لیمن سوڈا، لسی اور شربت کے علاوہ قسم قسم کے سافٹ ڈرنکس نہیں ملتے تھے۔ ککنگ گیس کا نام ونشان نہ تھا۔ ایک دو لوگوں نے سرکاری وظیفے کے ملنے کی وجہ سے گوبر گیس یا بایو گیس کی ٹنکیاں بنوا رکھی تھی لیکن وہ ٹنکیاں ایسے ہی بے کار پڑی تھیں۔

ڈھینگر گاؤں میں رہتے ہوئے بھی ڈاکٹر واکانکر نے سنگھ کا نام جاری رکھا۔ وہاں رہتے ہوئے انھیں یہ گہرا احساس ہوا کہ سنگھ اور ہندووادی سیاست سے پسماندہ ذاتوں اور آدی واسیوں کو بہت کم دل چسپی ہے۔ اگر وہ ڈاکٹر واکانکر سے متاثر ہو کر شاکھا میں آنے بھی لگتے تھے تو کچھ دنوں بعد ان کی دل چسپی ختم ہو جاتی تھی۔ نھوں نے مشاہدہ کیا کہ سنگھ میں تاجر، ٹھیکے دار، اونچی ذات کے لوگ اور سرکاری ملازم ہی زیادہ دل چسپی لیتے ہیں۔

ڈاکٹر واکانکر نے اپنی ڈائری میں لکھا:

"میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا سوامی رام تیرتھ، ویویکانند، رام کرشن پرم ہنس جیسے مفکرین اور وسطی زمانے کے سنتوں کا راستا یہ ہی ہے؟ مجھے شک ہوتا ہے کہ سنگھ کا انقلاب ہندو

سماج کی بیداریِ نو کے لیے ہے یا سنگھٹن اور اس کے حمایتی گروپوں کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے چل رہا ہے۔"

ڈھینگر گاؤں ایک بڑا علاقہ تھا۔ گزشتہ دس برسوں میں آبادی میں اضافے کی وجہ سے یہ اسمبلی کا ایک الگ حلقہ بن گیا تھا، آدی واسی قبائل کے لیے محفوظ اسمبلی کا حلقہ، لیکن الیکشن اور سیاست کے تمام مُہرے غیر آدی واسی لوگوں ہی کے ہاتھ میں تھے۔ شری بھلّی سادھو یہاں کے منتخب شدہ ایم ایل اے تھے، لیکن اس آدی واسی ایم ایل اے کے بارے میں ہر ایک جانتا تھا کہ وہ ضلع کے مافیا کِنگ تربھون سنگھ کے ملازم ہیں۔

تو ڈاکٹر واکانکر ڈھینگر گاؤں میں سزا کاٹ رہے تھے۔ کوئی بھی سرکاری ملازم یا افسر ڈھینگر گاؤں نہیں آنا چاہتا تھا۔ سرکاری دفاتر میں جب کوئی آفیسر اپنے ماتحتوں پر ناراض ہوتا تھا تو دھمکی دیتا تھا کہ "اگر آئیں بائیں کیا تو سالے، ڈھینگر گاؤں بھیج دوں گا!"

ڈھینگر گاؤں میں ڈاکٹر واکانکر سرکاری فلیٹ میں اکیلے رہتے تھے۔ وہاں کوئی کالج نہیں تھا، اس لیے انھیں اپنی فیملی کو للت پور بھیجنا پڑتا تھا۔ ودھان پور میں ان کی ایک ہی اولاد تھی۔ اِن چودہ برسوں میں تین کا اضافہ اور ہو گیا تھا: اُپاسنا، پرارتھنا، اور تپسیا۔

یہاں رہتے ہوئے انھوں نے اراؤں، گونڈ، کول، دھنوبار وغیرہ قبائل کی طرزِ زندگی، کھانے پینے کی عادتوں اور روایتی دواؤں کے بارے میں گہری تحقیق کی۔ آدی واسیوں کے موسمی امراض کا مطالعہ کیا۔ ان کے چار ریسرچ پیپر بین الاقوامی جرنلز میں شائع ہوئے۔ انھیں دو بار جرمنی اور ایک بار انگلینڈ بلایا گیا، لیکن ان کے محکمے نے ایک تو انھیں دیر میں مطلع کیا، دوسرے ان کے جانے میں کچھ رکاوٹیں بھی حائل کیں، اس لیے وہ نہیں گئے۔ ڈھینگر گاؤں ہی ان کا علاقہ بن کر رہ گیا۔

مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ قصبے کے سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر واکانکر کی آمد سے قبل کوئی آدی واسی نہیں آتا تھا۔ وہ لوگ وہاں جانے سے ڈرتے تھے۔ ان کا عام عقیدہ یہ تھا کہ جب پولیس چوکی کا داروغہ خاکی وردی اتار کر کوٹ پینٹ پہن لیتا ہے تو وہ ڈاکٹر بن جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص ہسپتال میں جاتا ہے تو وہ اس کا انڈا اور کلیجا چرا لیتا ہے؛ آدی واسیوں کے کلیجے اور انڈے سے چاکلیٹ بنتا ہے جسے دلّی کی عورتیں کھاتی ہیں۔

ٹی وی ڈھینگر گاؤں میں چھ سال پہلے آ گیا تھا، لیکن ٹی وی کے پردے پر دکھائی جانے والی

اشیا وہاں نہیں آئی تھیں۔ میگی نوڈلز وہاں نہیں تھے، سمیرائی اور اناری کے وِڈیو گیمز وہاں نہیں تھے، پاموِلو کا "کیسز" سوپ نہیں تھا، وہاں گارڈن وریلی کی ساڑھی کے ذریعے اپنی چھاتی، پیٹھ، کمر اور بغلوں کا چکنا ننگاپن دکھاتی مہیلائیں نہیں تھیں، وہ لڑکیاں نہیں تھیں جو لرل یا پونڈز لیوینڈر سوپ کے جھاگ میں آبشار یا شاور کے نیچے لوگوں کے سامنے ننگی نہاتی تھیں۔

لیکن ڈھینگر گاؤں میں تُرئی، امرود، کٹھرا، لوکی، پالک جیسی تمام سبزیاں بالکل تازہ ملتی تھیں۔ دودھ اور گھی مہنگا تھا لیکن خالص ہوتا تھا۔ چاول کی تمام اقسام تھیں اور بھات بہت لذیذ بنتا تھا۔

وہاں کے دیہی علاقوں میں جرائم نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک خاص طرح کی سُست، پرسکون اور بہت فطری زندگی تھی۔

وزیر اعظم کے دورے کا اعلان

اعلان ہوا کہ بھارت کے وزیر اعظم ڈھینگر گاؤں کے دورے پر آنے والے ہیں۔ ان کا ٹھہرانہ پہاڑ کے اوپر بنے انگریزوں کے زمانے کے کٹھ بنگلے، یعنی ڈھینگر گاؤں کے پی ڈبلیو ڈی کے سرکٹ ہاؤس میں ہوگا۔ کھانے کے بعد سہ پہر تین بجے وہ وادی کے میدان میں آدی واسی عوام کے سامنے تقریر کریں گے۔ وادی کی آبادی سے ساڑھے تین کلومیٹر دور لال گنج کے پلانٹیشن سائٹ پر ان کا ہیلی کاپٹر اترے گا۔

یہ بات حیرت انگیز تھی۔ کہاں بھارت کے وزیر اعظم اور کہاں ڈھینگر گاؤں، آزاد ہندوستان کی دیسی حکومت کا انڈمان نکوبار، کالے پانی کا جزیرہ برائے سزا۔ ڈھینگر گاؤں کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ ہونے جا رہا تھا۔

جیپیں دوڑنے لگیں، ٹرک فراٹے بھرنے لگے۔ سرکاری عمارتوں پر ہی نہیں بلکہ ڈھینگر گاؤں بازار کی خاص سڑک کے اغل بغل کی دوکانوں پر بھی چونا، سنو سیم پوتا جانے لگا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر، لال گنج سے ڈھینگر گاؤں تک، گیرو اور چونے میں رنگی اینٹوں کی قطار سجائی

گئی- تھوڑے تھوڑے فاصلے پر استقبالیہ گیٹ بنائے گئے: "ڈھینگر گاؤں اسمبلی حلقے کے عوام وزیراعظم کا استقبال کرتے ہیں۔"

لال گنج کے پلانٹیشن سائٹ کو، جہاں وزیراعظم کا ہیلی کاپٹر اترنا تھا، لوہے کے خاردار تاروں سے گھیر دیا گیا- وادی کے میدان کی حدود میں کھمبے نصب کیے گئے، تار تانے گئے، ہر کھمبے پر اسپیکر فٹ کیا گیا- میدان کے بیچوں بیچ پہلے اینٹ اور سیمنٹ کا چبوترا اور اس کے اوپر چوبی تختوں کا اسٹیج، اس کے اوپر ضلعی صدر مقام سے اور صوبے کے دارالحکومت سے لائی گئی کرسیاں۔

اسی چبوترے سے وزیراعظم گاؤں کے عوام سے خطاب کریں گے اور اسپیکر سے ان کی آواز پہاڑ، وادی اور جنگلوں تک جائے گی- غریبی ہٹاؤ... ترقی... عوام کے مسائل... سرکار نے عہد کیا ہے... سنہرا مستقبل... جے ہند... گل پوشی، زندہ باد، دست بستہ، مسکراتا چہرہ، سر پر بیگاؤں اراوں والا مُرٹھا- پتا چلا کہ وزیراعظم آدی واسیوں کا کرما سیلا ناچ دیکھیں گے اور اگر ناچ اچھا ہوا تو مہوے کا ٹھرا پی کر خود بھی ناچیں گے۔

ڈھینگر گاؤں میں جگہ جگہ تذکرہ تھا کہ وزیراعظم مرٹھا باندھ کر کرما ناچیں گے اور ٹھرا پییں گے- کلکٹر صاحب نے سوہنا بیگا کو خالص مہوے کی راسی بنانے کا آرڈر دیا ہے؛ ایسا ٹھرا کہ دیوار پر ہاتھ رگڑ دو تو بھک سے آگ لگ جائے- پتا چلا کہ وزیراعظم کے ساتھ دلی دربار کے کئی افسر اور اخبار والے بھی آ رہے ہیں؛ وہ بھی ٹھرا پییں گے- ٹی وی والے بھی آئیں گے۔

اور سرکٹ ہاؤس ـــــ پہاڑ کی چوٹی کی ہموار سطح پر بنا انگریزی زمانے کا کٹھ بنگلا- پہلے یہاں انگریز افسر اور ریوا، سرگوجا کے راجا لوگ آ کر ٹھہرا کرتے تھے- خوب شکار، ہانکا ہوتا تھا- پکنک منائی جاتی تھی- کٹھ بنگلا دور سے نظر آتا تھا- لوہے کے اونچے اونچے کھمبے کوربا سے ٹرک پر لاد کر لائے گئے- پہاڑ کی چوٹی پر مرکری لائٹ، رات میں بھی دن جیسا اُجالا- کیا پتا کہیں وزیراعظم کا ہیلی کاپٹر خراب ہو جائے اور انھیں رات کٹھ بنگلے میں گزارنی پڑ جائے، اسی لیے۔

وادی سے لے کر چوٹی تک سڑک کے ادھر اُدھر رنگین اینٹیں، نیچے سے اوپر تک بلب ہی بلب، جگمگ جگمگ، پتنگی کاغذ کے بے شمار ننھے ننھے تکونے سُتلی کی ڈوری میں چاروں طرف ہلتے ہوئے، جھنڈیاں، ہری، نیلی، پیلی، بینگنی، رنگ برنگی۔

کلکٹر شری این ایس کھرے ڈھینگر گاؤں ہی میں ڈیرا ڈالے پڑے تھے- پینتیس چھتیس کی

عمر، جوان۔ راؤز کوچنگ سینٹر سے رٹا مار کر آئی اے ایس پاس کیا تھا۔ گھڑسواری، برج، بلو فلموں اور رشوت کے شوقین۔ شترو گھن سنہا کی طرح ڈائیلاگ بولنے کا انداز۔

ایس پی، ڈی آئی جی، کمشنر، تحصیل دار، بی ڈی او، سب کے سب ڈھینگر گاؤں میں پڑے تھے۔ ہر ایک دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ محکمہ تعلقات عامہ اور آدی واسی ویلفیئر ڈپارٹمنٹ کے افسران عورتوں مردوں کو صحیح طریقے سے ناچنے کی ٹریننگ دے رہے تھے۔ پی ایم کے سامنے ناچنا ہے۔ صحیح ناچو گے تو دِلی گھمائیں گے، بخشش ملے گی۔ آدی واسی عورتوں کو سخت ہدایت کہ کوئی بلاوز نہیں پہنے گی، ایسے ہی آنچل سے دودھ کو موند لینا ہے۔ جس کی چھاتی زیادہ لٹک گئی ہے اسے پیچھے رہنا ہے۔ وزیر اعظم کے دورے کی تیاری میں ڈھینگر گاؤں ٹائروں اور جوتوں تلے روندا جا رہا تھا۔ ساٹھ لاکھ خرچہ بیٹھا تھا۔ سب جٹے ہوئے تھے۔ ہر ایک دوڑ رہا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی کے ٹھیکے دار اگروال جی، ترپاٹھی جی، آل انڈیا ٹرانسپورٹ کمپنی کے ڈیڑھ سو ٹرکوں کے مالک کھنا صاحب، کوئلہ کانوں سے بلیک اور چوری سے کوئلہ اور پرمٹ بیچنے والے کول مافیا کنگ تربھون سنگھ، ضلع کے مشہور غنڈے کالے پہلوان، اندربھان سنگھ، دارو کے ٹھیکے دار جواہر جین جی جن کے باندے سے لائے گئے غنڈوں اور ایکسائز کے ملازموں کی دہشت سے تمام آدی واسی علاقہ تھرّاتا تھا۔

کئی پٹرول پمپوں کے مالک اور موبل آئل میں پٹرول اور مٹی کا تیل ملا کر ڈیزل کے نام سے بیچنے والے کیڈیا جی، چونا سیمنٹ فیکٹری کے جاڑبجا صاحب، کاغذ کے کوٹے کو بلیک میں بیچ کر سرکاری افسروں اور وزیروں کی چمچا گیری کر کے لاکھوں کما لینے والے "لوک وانی" کے ایڈیٹر نشورلال نشور جو ٹی وی کے کوی سمیلن میں ہمیشہ دکھائے جاتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔

ڈھینگر گاؤں سرکاری لوگوں سے بھر گیا تھا۔ انتظامات ہو رہے تھے۔ پولیس، سی آر پی، پی اے سی۔ تمبو ہی تمبو، چھاؤنی ہی چھاؤنی، وردی ہی وردی۔ جیپ، ٹرک، کار، موٹر سائیکل۔

لیکن ڈھینگر گاؤں کے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے گاؤوں میں سناٹا تھا۔ ہاٹ بازار کے علاوہ آدی واسی شہر اور قصبے کی طرف کم ہی رخ کرتے تھے۔ سرکار کے نام پر وہ صرف پولیس، پٹواری اور آبکاری والوں کو جانتے تھے جو اُن کے گھروں میں گھس کر مرغیاں پکڑ لے جاتے تھے، ٹھرا بنانے والے مٹکے پھوڑ دیتے تھے، عورتوں لڑکیوں کے پیٹ میں اپنا بیج ڈال جاتے تھے، اور مارتے پیٹتے تھے۔ سندواری، بوڑاری، پونڈی، کھاڑا، بکیلی، نونیاں وغیرہ کی آرزو تھی کہ اِدھر اُدھر

نہ جانا پڑتا تو اچھا رہتا۔ بوڑاری گاؤں کے مکھیا بیگا نے تو ٹھکردئی میں جا کر مُرغوں کا چڑھاوا دیا تھا کہ وزیرِ اعظم گاؤں نہ آئیں۔

لیکن پی ایم کی آمد کی تاریخ اور وقت تو طے تھے۔ تمام سرکاری لوگ گاؤں گاؤں گھسنے لگے۔ پٹواری آکر اعلان کر گئے تھے کہ ڈھینگر گاؤں نہیں جاؤ گے تو زمین چھن جائے گی، اور جانے والے کو وزیرِ اعظم خود اپنے دستِ مبارک سے پٹا عطا کریں گے۔ بی ڈی او بتا گیا تھا کہ وزیرِ اعظم ڈھینگر گاؤں میں کنواں کھودنے اور مویشی خریدنے کے لیے روپے بانٹیں گے؛ یہ ہوگا تو قرضہ لیکن بعد میں معاف کر دیا جائے گا۔

تھانے دار اور پولیس کے سپاہیوں نے کہا تھا کہ اگر ڈھینگر گاؤں نہیں جاؤ گے تو گھر گھر میں ڈنڈا چلے گا؛ پھر نہ آنا نالش فریاد کرنے۔ اونچی ذات کے کسان زمیندار اور سیٹھ ساہوکار کہہ رہے تھے: ”سسُر رہ گئے بیل کے بیل، جنگلی سالے! ڈھینگر گاؤں کے اسمبلی الیکشن علاقے کی شان بڑھ رہی ہے، وزیرِ اعظم آ رہے ہیں، اور یہ سسر جنگل میں چھپ کر ہگنے میں مصروف ہیں۔ پسماندہ رہ جانے کے ذمے دار یہ آدی واسی خود ہیں۔“

ہر پٹواری، حلقے، اسکول اور تھانے کے علاقے سے لوگوں کو لانے کا کوٹا بھی باندھ دیا گیا تھا۔ ہر سرکاری ملازم اپنے اپنے علاقے سے زیادہ سے زیادہ کول، بیگا، گونڈ، بھریا، اگریا، ڈھیمر، ہریجن، دھنوبار لانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ حکامِ بالا خوش ہو جائیں۔ ٹھیکے دار، غنڈے، نیتا، اور دارو بھٹے والے بھی اپنی اور سرکاری گاڑیوں سے گلی گلی دوڑ رہے تھے۔

سرکار آدی واسیوں کو ان کے گھروں اور جنگلوں سے نکال کر وزیرِ اعظم کے سامنے کھڑا کر دینے کے لیے اپنے عہد کی پابند تھی۔

وبائی مرض اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

”کبھی کبھی یہ سوال بھی مجھے سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اقتدار اور عوام کے باہمی تعلقات میں گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں میں کتنی تبدیلی لائی گئی ہے۔ ڈھینگر گاؤں کے قرب وجوار کے دیہات

کے بوڑھے آدی واسیوں سے بات کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انھیں پرانا زمانہ پسند تھا۔ اس کی دو خاص وجہیں تھیں: ایک تو یہ کہ اُس وقت جنگل اتنے نہیں اُجڑے تھے، اور دوسرے یہ آدی واسی سماج میں اس وقت حکومت کی اتنی دخل اندازی نہیں تھی۔ آدی واسیوں کا خیال ہے کہ سرکار نے سڑکیں جنگل کاٹ کر لکڑی ڈھونے اور کانوں سے معدنیات نکالنے کے لیے، آدی واسیوں کی آزادی چھین کر انھیں ماتحت اور غلام بنانے کے لیے، بنائی ہیں۔"

ڈاکٹر واکانکر نے انھیں دنوں اپنی ڈائری میں یہ لکھا تھا۔ آخر میں انھوں نے اپنی جانب سے نتیجہ بھی اخذ کیا تھا:

"مجھے ان کے نظریات میں سچائی نظر آتی ہے۔ اگر سڑکیں آدی واسیوں کے لیے بنائی گئی ہوتیں تو ان کے پاس سڑک پر چلنے والی کوئی نہ کوئی چیز ضرور ہوتی۔ ایسا نہیں ہے۔"

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کو اطلاع ملی کہ پوڑی اور کھاڑا گاؤں میں گیسٹرو اینٹرائٹس کے کچھ کیس ہوئے ہیں۔ انھوں نے سول سرجن، ضلعی صدر مقام، کو حسبِ دستور اس کی اطلاع بھیج دی تھی، لیکن ابھی تک اس کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ دریں اثنا معلوم ہوا کہ مزید چار موتیں ہو گئی ہیں۔ انھوں نے سی ایس کو ریمائنڈر بھیجا۔ جواب پھر نہ آیا۔ تین دن بعد معلوم ہوا کہ کچھ آدی واسی، جن میں تین بچے اور دو عورتیں شامل تھیں، اور مر گئے ہیں۔ اب تک مرنے والے سولہ لوگوں میں نو بچے تھے۔

ڈاکٹر واکانکر اسکوٹر پر بیٹھ کے متاثرہ دیہات میں پہنچے۔ مئی کا مہینا تھا۔ شدت کی گرمی تھی اور غالباً پانچ چھ گاؤوں کے درمیان پانی کے لیے جو ایک ہی تالاب تھا اس کا پانی گندا ہو گیا تھا۔ اگر فوری طور پر کوئی بندوبست نہ کیا جاتا تو وبا اور زیادہ پھیل سکتی تھی۔

آدی واسیوں سے بات چیت کرنے پر انھیں معلوم ہوا کہ ۱۹۴۲ کے قحط کے بعد اس علاقے میں پہلی بار ہیضہ پھیلا ہے۔ اُس وقت انگریز سرکار تھی اور یہاں کے کلکٹر مسٹر فلپس نے وبا کی روک تھام کے لیے ضروری اقدامات کیے تھے اور زیادہ تر لوگ وبا سے متاثر ہونے سے بچا لیے گئے تھے۔ حیرت تھی کہ اُس زمانے میں کوئی ابتدائی مرکزِ صحت نہیں تھا اور یہاں سرکاری ڈاکٹر بھی نہیں تھے۔ سڑکیں تو دراصل آزادی کے سات آٹھ سال بعد جنگل کی کٹائی، تیندو پتے اور لاکھ کا کاروبار اور اس علاقے میں پائے جانے والے باکسائٹ ڈھونے کے لیے بنائی گئی تھیں۔

Scanned with CamScanner

اگلی صبح ساڑھے دس بجے ڈاکٹر واکانکر کو اطلاع ملی کہ پوڑنمی گاؤں میں دو بچے اور مر گئے ہیں۔ ڈاکٹر واکانکر کو پتا تھا کہ اس وقت کلکٹر، شری این ایس کھرے، آئی اے ایس، ڈھینگر گاؤں کے محکمۂ آبپاشی کے ریسٹ ہاؤس میں قیام پذیر ہیں۔ انھوں نے اپنا اسکوٹر اٹھایا اور وہاں پہنچ گئے۔

ریسٹ ہاؤس میں بھیڑ تھی۔ ایس پی، ڈپٹی کلکٹر، تحصیل دار، داروغہ سمیت، وہاں ضلعے کے بدنام مجرم اندر بھان سنگھ اور کول مافیا کنگ تربھون سنگھ وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کلکٹر اندر دارو بھٹے کے ٹھیکے دار جین سے وزیراعظم کے دورے کے انتظامات کے بارے میں کچھ اہم گفتگو میں مصروف تھے۔ بمشکل تمام ڈاکٹر واکانکر کلکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کر سکے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ این ایس کھرے نے ان سے کہا کہ وہ دو منٹ میں اپنی بات انھیں بتا دیں کیوں کہ ان کے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ ڈاکٹر واکانکر نے انھیں پانچ دیہات میں ہیضہ پھیلنے اور اب تک ہوئی ۱۶ موتوں کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ضلعی انتظامیہ کو فوری کارروائی کرے ورنہ مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

کلکٹر کھرے نے ہنستے ہوئے کہا، "ارے ڈاکٹر صاحب، لوگوں نے آپ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا آپ ویسے ہی نکلے۔ دیکھیے آخر کار آپ بھی ہمارے ہی گروپ کے آدمی ہیں۔ اس وقت اپنی پالیٹکس نہ چلائیے۔ ہو سکے تو ایڈمنسٹریشن کی مدد کیجیے تاکہ پی ایم کا دورہ بخوبی نمٹ جائے۔ بعد میں ہم لوگ اس سچویشن کو ٹھیک کر لیں گے۔"

ڈاکٹر واکانکر نے ایمانداری اور سنجیدگی سے کہا کہ اس میں ان کی کوئی پالیٹکس نہیں ہے۔ گیسٹرو انٹرائٹس درحقیقت بہت تیزی سے پھیل رہی ہے اور خطرہ ہے کہ آس پاس کے دیہات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اگر ایسا ہوا تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ مرنے والوں میں سب سے زیادہ تعداد بچوں کی ہو گی۔ ان کی اس بات پر کلکٹر نے کہا کہ "آپ دو دن اور رک جائیے۔ اس کے بعد میں اسے پرائرٹی دے کر دیکھوں گا۔"

ہار کر ڈاکٹر واکانکر نے کہا، "لیکن یہ بہتر ہو گا کہ آج مجھے دو تین گھنٹے کے لیے جیپ دے دی جائے تاکہ کم از کم اس تالاب کے گندے پانی میں جراثیم کش دوائیں ڈال کر پینے کے لائق بنایا جا سکے اور جو لوگ اس وقت کریٹیکل حالت میں بیمار ہیں، انھیں ڈھینگر گاؤں کے ہسپتال لایا جا

سکے۔"

کلکٹر نے بی ڈی او اور ایس پی سے پوچھا تو ان کا کہنا تھا کہ آج کا شیڈول تو بہت ٹائٹ ہے، گاڑیاں جہاں جہاں جاتی ہیں وہاں پہلے سے اپائنٹمنٹ ہے۔ آج تو قطعاً ممکن نہیں ہے، ہاں اگر ڈاکٹر واکانکر کل صبح معلوم کرلیں تو بہتر ہوگا۔

ڈاکٹر واکانکر اس رات ٹھیک سے سو نہیں سکے، جاگتے رہے۔ انھوں نے ڈائری میں لکھا:

"ان کی آنکھوں میں کہیں فکر یا رحم کے آثار نہیں تھے۔ اگر ان میں سے کسی کا اپنا بچہ مر رہا ہوتا کیا وہ یہی برتاو کرتے؟

"کیا میں سچ مچ آئیڈیلسٹ ہوں؟ لیکن ایسا تو نہیں لگتا۔ اگر دو گھنٹے کے لیے مجھے جیپ مل جاتی اور میں کچھ لوگوں کو مرنے سے بچا لیتا تو اس سے سرکار اور انتظامیہ کا کیا نقصان ہوتا؟

"کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جو نظام یہاں رائج ہے وہ اپنے آپ میں ایک متوازن نظام ہے، وہ صرف اپنی ہی دنیا کے اندیشوں میں مصروف ہے؟ شاید اس کا مفاد اسی میں پوشیدہ ہو کہ لوگ بھوک، غریبی اور وبا سے مریں۔ کہیں ہمارے ملک میں جمہوریت کا حقیقی مفہوم عوام کے ہاتھوں ان کی دشمن انتظامیہ کا انتخاب تو نہیں ہے؟"

صبح جب ڈاکٹر واکانکر جیپ کے لیے ریسٹ ہاوس پہنچے اس وقت تک ایک سات آٹھ سال کے گونڈ بچے کے مرنے کی اطلاع اور مل چکی تھی۔ انھیں ریسٹ ہاوس میں کلکٹر سے ملنے کا موقع نہیں دیا جا رہا تھا، جبکہ دوسرے لوگ، جن میں کول مافیا کنگ تربھون سنگھ اور "لوک وانی" کے جعلساز ایڈیٹر اور دوردرشن کے کوی سمیلنوں کے مستقل شاعر نٹور لال نٹور وغیرہ شامل تھے، ان سے ملاقات کرکے آ جا رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شری این ایس کھرے باہر نکلے تو ڈاکٹر واکانکر نے گاڑی کا انتظام کرنے والی کل کی بات یاد دلائی۔ کلکٹر تمام اہم کاموں میں مصروف تھے۔ انھوں نے قریب قریب چیخ کر اپنی گھڑی کو ٹھونکتے ہوئے کہا، "آپ کا دماغ تو اپنی جگہ پر ہے ڈاکٹر؟ دیکھیے گھڑی دیکھیے۔ پی ایم کے آنے میں چوبیس گھنٹے بھی نہیں رہ گئے ہیں۔ آپ، پلیز، اپنی پالیٹکس اپنے پاس ہی رکھیے۔"

ڈاکٹر واکانکر نے انھیں ٹوکا۔ "دیکھیے آپ نے کل بھی یہی بات کہی تھی۔ میں واضح طور پر

Scanned with CamScanner

کہہ رہا ہوں کہ اس میں میری کوئی پالیٹکس نہیں ہے۔ سوال آپ کے بندوبست کا ہے۔''

کلکٹر کھرے کو غصہ آ گیا۔ بھوپال، دلّی کی ہاٹ لائن لگی تھی۔ بار بار ان سے معلومات حاصل کی جا رہی تھیں اور ہدایات دی جا رہی تھیں۔ پی ایم کی سکیورٹی کا نازک معاملہ تھا۔ اس علاقے میں نکسل واد پنپ رہا تھا۔ عیسائی مشنریوں کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھا جا رہا تھا۔ کلکٹر نے کہا، ''جیپ! جیپ! آپ کل سے رٹ رہے ہیں۔ آپ کو نظر نہیں آتا کہ ہم لوگ کتنی ارجنٹ چیزوں میں بزی ہیں؟'' وہ قریب قریب ڈانٹنے اور چیخنے کے انداز میں بول رہے تھے۔

اتنے لوگوں کے سامنے کلکٹر کا اس طرح حقارت آمیز لہجے میں چیخنا ڈاکٹر واکانکر کو اچھا نہیں لگا۔ انھوں نے غضب آلود نگاہ سے کلکٹر کھرے کو دیکھا اور بلند آواز میں خود کچھ کہنے کی کوشش کی تو کلکٹر پھٹ پڑے۔ ''جائیے نہیں کرتا میں جیپ کا انتظام! تم میرا کیا اکھاڑ لو گے؟ آئیں، کیا اکھاڑ لو گے؟''

سب لوگ ہنسنے لگے۔ ڈاکٹر واکانکر اچانک ڈی ایم کھرے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بھاری، دور تک سنائی دینے والی، آواز میں انھوں نے کہا:

''صوبائی حکومت کے آرڈر نمبر 3K/1958/M-1124 کے مطابق میں نے اپنے پی ایچ سی ایریا میں ایپی ڈیمک کی اطلاع ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر میں سی ایس کو ایک ہفتے پہلے بتاریخ ۷ مئی کو بھیج دی تھی۔ حسب دستور اس کی ایک کاپی آپ کے دفتر کو بھی رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجی تھی۔ چار دن بعد ۱۱ مئی کو میں نے سی ایس کو ریمائنڈر اور قاعدے کے مطابق ریمائنڈر کی کاپی آپ کو ارسال کی تھی۔ مجھے افسوس ہے ابھی تک دونوں جگہوں سے کوئی جواب نہیں ملا ہے۔ صوبائی حکومت کے آرڈر نمبر 3K/1958/M-1124 میں واضح طور پر ہدایت ہے کہ کسی علاقے میں وبا پھیلنے کی صورت میں ڈی ایم کو گاڑیوں اور دیگر ذرائع کا بندوبست، اس علاقے کے اسپیشل ڈاکٹر کے مطالبہ اور درخواست کی بنیاد پر، پرائرٹی دے کر ضرور کرنا چاہیے۔ اگر ڈی ایم یہ کام نہیں کرتا ہے۔ تو وہ اپنی ذمے داری سے گریز کر رہا ہے اور وہ سزا کا مستحق ہے۔''

ایک سانس میں اتنی بات کہہ کر ڈاکٹر واکانکر مسکرائے۔ پھر انھوں نے کہا، ''مسٹر کھرے، آپ صرف ہاں یا نہ میں جواب دیجیے۔ آپ جیپ کا بندوبست کریں گے یا نہیں؟''

ڈاکٹر واکانکر کی اس بات پر کلکٹر این ایس کھرے، جس نے راؤز کوچنگ سینٹر سے گزشتہ

پانچ سالوں کے پیپرز کا رٹا لگا کر سرکاری انتظامیہ میں شریک ہونے میں کامیابی حاصل کی تھی، ایک منٹ کے لیے ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد اس نے چلاتے ہوئے ایس پی سے کہا، "مسٹر ڈبرال، اس پاگل کو آپ میرے سامنے سے ہٹا لیجیے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

ایس پی ڈبرال نے ڈاکٹر واکانکر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہیں ریسٹ ہاؤس سے باہر لے گئے۔ ایس پی ڈبرال کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں، صرف شراب پینے پر کبھی کبھی بہکتے ہیں؛ ۴۶ برس کی عمر میں بھی انہیں اپنے خوبرو اور نوجوان ہونے پر یقین ہے، اور وہ دوسروں کی بیویوں اور لڑکیوں کے سامنے وردی کے باوجود متذبذب بلی کی طرح پیش آتے ہیں۔

ڈبرال کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ اپنے حکامِ بالا کے احکامات کی کسی تذبذب کے بغیر تعمیل کرتے ہیں، کرفیو لگانے، گولی چلانے تک۔

ایس پی ڈبرال نے ریسٹ ہاؤس کے باہر نکل کر ڈاکٹر واکانکر کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا۔

ڈاکٹر واکانکر بہت ذلیل ہو کر لوٹے تھے۔ ڈھینگر گاؤں میں دکانداروں اور سرکاری ملازموں کے درمیان یہ بات پھیل گئی تھی کہ کلکٹر صاحب نے ڈاکٹر واکانکر کو اچھی ڈوز دی؛ بس اتنی کسر رہ گئی کہ جوتوں سے پٹائی نہیں کی۔

خبر یہ بھی تھی کہ ایس پی ڈبرال نے ڈاکٹر واکانکر کو بتا دیا ہے کہ ان کے آر ایس ایس سے وابستہ ہونے کی بات سرکار کو معلوم ہے اور اگر انھوں نے زیادہ چیں چیں کی تو پی ایم کے آنے سے پہلے ہی انہیں امن درہم برہم ہونے کے اندیشے میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر واکانکر نے ابتدائی مرکزِ صحت میں موجود اکلوتی جراثیم کش دوا پوٹاشیم پرمیگنیٹ کا پیکٹ اٹھایا، کمپاؤنڈر گوپی ناتھ یادو کو ساتھ لیا، اور اسکوٹر پر پندرہ کلو میٹر دور کھانڑا پوڑھی گاؤں کے قریب آلودگی زدہ تالاب کی طرف چل پڑے۔

شام کی سیاہی جنگل سے اترتی ہوئی تالاب کے پانی میں گھل رہی تھی۔ پانی بالکل پرسکون تھا۔ کائی، مچھلیوں اور سڑتی ہوئی پتیوں کی بدبو پھیل رہی تھی۔ ڈاکٹر واکانکر نے پوٹاشیم پرمیگنیٹ کے پیکٹ کی طرف دیکھا ـــــ مشکل سے پچاس گرام۔

ان کی آنکھیں شکست، لاچاری اور اکیلے پن سے نم تھیں۔ میرے ساتھ ہمیشہ یہی کیوں ہوتا

ہے؟ میں ہی الگ سا کیوں کھڑا ہو جاتا ہوں؟ میرا جرم کیا ہے؟ کیا میں واقعی پریکٹیکل انسان نہیں ہوں؟ کیا مجھے دو تین دن تک وبا کی بات نہیں اٹھانی چاہیے تھی؟ سِک لِیو لے کر خاموشی سے گھر میں سو جانا چاہیے تھا؟ کیا یہی سب کچھ پریکٹیکل ہوتا؟

وہ بالکل چپ، تالاب کے ایک معمولی سے کونے میں جراثیم کش کے پیکٹ کو پانی میں ڈبو کر پلا رہے تھے۔ اے ایشور، تُو جو تمام نباتات میں رس بن کر ظاہر ہے، تُو جو تمام مادّوں کے اندر، نازک سے نازک ایٹم کے بھی اندر حرکت بن کر ظاہر ہے، تُو جو بے شمار شکلوں اور بے شمار طریقوں میں خود کو ظاہر اور پوشیدہ کر رہا ہے، تُو جو فتح بھی ہے اور شکست بھی، تُو جو...

کمپاؤنڈر ڈاکٹر گوپی ناتھ چپ چاپ ڈاکٹر واکانکر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انھیں بخوبی سمجھتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

جب ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر اپنے فلیٹ میں لوٹے تو رات ہو گئی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی پر بنا کٹھ بنگلا بے شمار مرکری بلبوں کی وجہ سے دور سے ہی جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ پورے قصبے ہی کی کایا کلپ ہو گئی تھی۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ مچھروں، سگڑی کے دھوئیں، لو وولٹیج کی بیمار روشنی اور خراب ٹوٹی پھوٹی سڑکوں والا، اپنی پست اور پسماندہ زندگی میں سانس لینے والا، یہی قصبہ ڈھینگر گاؤں ہے، بھارت سرکار کا کالے پانی کا بدنام زمینی ٹکڑا۔

ڈاکٹر واکانکر کا خاندان للت پور میں تھا۔ وہ اپنے فلیٹ میں اکیلے تھے۔ کھانا وہ خود بناتے تھے۔ آج انھیں بھوک بالکل نہیں تھی۔

سونے سے پہلے انھیں اپنی بیوی جیوتسنا واکانکر کی خوب یاد آئی۔ انھوں نے دیکھا ہلکے نیلے رنگ کی فراک اور سفید جانگیہ میں ملبوس، دو چوٹیاں نکالے، ہنستی ہوئی جیوتسنا واکانکر ان کی آغوش میں بیٹھ گئیں۔ ان کے جسم سے بچپن کی تازہ مہک پھوٹ رہی تھی۔

جیوتسنا نے ان کے چہرے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بے تحاشا انھیں چومنے لگیں۔ ڈاکٹر واکانکر نے دیکھا وہ رو رہی تھیں۔ "تمھیں ہائی بلڈ پریشر ہے۔ وہ بھی کبھی اسٹیبل نہیں رہتا۔ تمھیں پتا ہے ایسے میں کوئی بھی ٹینشن کس قدر خطرناک ہوتا ہے۔ ذرا اپنی آنکھیں دیکھو، کیسی سرخ ہو رہی ہیں۔" نیند کے اندھیرے میں جیوتسنا کی جانگھیں جیسے ہلکے فاسفورس میں جل رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

"تم ہی اکیلے تو اس لیے نہیں بنے ہو کہ دنیا بھر کے مصائب اپنے اوپر لادتے پھرو۔ تمہارا کام تھا ایڈمنسٹریشن کو بیسنے کے بارے میں مطلع کرنا، وہ تم نے کر دیا۔ اب اگر کوئی کچھ نہیں کر رہا ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور؟ چین سے بیٹھو۔ پلیز، اپنا خیال رکھو۔"

ڈاکٹر واکانکر کی انگلیاں فاسفورس کی مدھم روشنی میں جلتی جانگھوں پر گھومتی ہوئی کانپ رہی تھیں۔ جیوتسنا واکانکر، یا شاید بچپن کی پشپا سریواستو، کی سانس ان کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ ہوس کے تیز طوفان میں ڈاکٹر واکانکر کا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔

"میں کیا کروں! یہ میری ڈیوٹی تھی۔ جن دیہاتوں میں گیسٹرو انٹرائٹس ہے وہ میرے پی ایچ سی ایریا کے اندر آتے ہیں۔" اس کے بعد ڈاکٹر واکانکر نے ذرا اونچی آواز میں کہا، "بتاؤ، تم ہی بتاؤ پشپا، کیا میں چھوٹے چھوٹے معصوم آدی واسی بچوں اور عورتوں کو یوں ہی کنٹے مینیٹڈ پانی پی کر مرنے دیتا؟"

ڈاکٹر واکانکر اچانک چونک گئے۔ وہ جانگھیں جیوتسنا واکانکر کی نہیں تھیں۔

پشپا سریواستو نے اندھیرے میں غائب ہونے سے پہلے ایک بار اپنی فراک اوپر اٹھا دی اور اس کے حلق سے نکلتی بچپن کی ہنسی کمرے میں پھیل گئی۔ ڈاکٹر واکانکر کی ناک بج رہی تھی۔

وزیر اعظم کی فوڈ ٹیسٹنگ اور چرن امرت

صبح ڈاکٹر واکانکر مرکز صحت میں جلدی پہنچ گئے اور انھوں نے سی ایس کو وبا کے بارے میں ایک ریمائنڈر اور کلکٹر کے دفتر کو اس کی نقل بھیجی۔ بعد ازاں انھوں نے ایک سخت خط الگ سے کلکٹر این ایس کھرے کو لکھا۔ اس میں وبائی امراض کے بارے میں حکومت ہند اور صوبائی حکومت کے مختلف احکامات اور اس کی مختلف دفعات کے سلسلہ وار حوالے دیے گئے تھے۔ اسی خط میں انھوں نے کلکٹر کھرے کو ڈھینگر گاؤں کے ریسٹ ہاؤس میں کیے گئے ان کے غیر مہذب اور فحش برتاؤ کی یاد دلائی تھی۔ انھوں نے لکھا کہ جیسا برتاؤ ڈی ایم، این ایس کھرے، نے کیا ہے وہ شرمناک ہے اور غیر مہذب دائرے میں آتا ہے۔ بھارتی انتظامیہ میں صرف آئی

اے ایس ہو جانے سے کوئی شخص یا افسر ہر قسم کی بے راہ روی اور بد تمیزی کا حقدار نہیں بن جاتا ہے۔ ڈاکٹروں، ٹیچروں، انجنیروں، ٹیکنیشینوں، ادیبوں، فنکاروں، صحافیوں وغیرہ کی اپنی ذاتی اور پیشہ ورانہ عزت ہوتی ہے۔ اس عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہوشیار اور ذہین افسران کے احترام کو قائم رکھتے ہوئے ہی ان سے بہتر تعاون اور کام لیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر واکانکر نے اپنے خط میں واضح کیا تھا کہ وہ کلکٹر سے ذاتی کام کے لیے گاڑی اور وسائل مانگنے ریسٹ ہاوس نہیں گئے تھے؛ صوبائی حکومت کے سونپے ہوئے عوامی فرائض کی تکمیل کرنے کے لیے انھوں نے یہ مطالبہ کیا تھا۔

خط کے آخری حصے میں انھوں نے لکھا کہ کلکٹر کے نامناسب اور بد تمیزی کے برتاو کا معاملہ وہ میڈیکل آفیسرز ایسوسی ایشن کی اگلی نشست میں پیش کریں گے اور کوشش کریں گے کہ کلکٹر کے معافی مانگنے تک ضلع کے سب مراکزِ صحت کے معالج اور محکمۂ صحت کے ملازم ہڑتال پر رہیں۔

خط ختم ہوا ہی تھا کہ مرکزِ صحت میں صوبائی حکومت کی ایم پی زیڈ نمبر پلیٹ والی جیپ آ رکی۔ ڈی ایم کی اس جیپ میں جلساز ایڈیٹر اور دوردرشن کے کوی، نٹور لال نٹور، اور بی ڈی او، شری گپتا، بیٹھے ہوئے تھے۔

بی ڈی او نے سول سرجن اور کلکٹر کا دستخط شدہ حکم نامہ ڈاکٹر واکانکر کے حوالے کیا۔ اس حکم کے مطابق ڈاکٹر وکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، کی ڈیوٹی پی ڈبلیو ڈی کے سرکٹ ہاوس (یعنی کٹھ بنگلے) میں وزیر اعظم کے کھانے کے معائنے (فوڈ ٹیسٹنگ) کے لیے لگا دی گئی تھی۔

بی ڈی او گپتا نے مسکراتے ہوئے کہا، "کلکٹر صاحب نے کہا ہے کہ آپ ابھی سے سرکٹ ہاوس پہنچ جائیں۔"

کٹھ بنگلے میں وزیر اعظم کے لنچ کے لیے سامان منگوایا گیا تھا۔ اس میں تقریباً ۳۶ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ وزیر اعظم کو ہندوستانی کھانا پسند تھا، اس لیے کانٹی نینٹل ڈشز تیار کرنے کے لیے صوبائی دار الحکومت بھوپال کے تھری اسٹار ہوٹل "شاہ نما" کے خانساماں لائے گئے تھے۔ لیکن چوں کہ وزیر اعظم ہندوستان کے وزیر اعظم تھے، اب علاقائی روایت کا سوال اٹھتا ہے۔ ڈھینگر گاوں کے بیشتر آدی واسی چاول کا ہیج یا ماڑ پیتے تھے۔ وزیر اعظم کو ماڑ تو پلایا نہیں جا سکتا تھا اس لیے دوسرا طریقہ تلاش کیا گیا۔ ڈھینگر گاوں میں بٹیر بہت ہوتے تھے۔ یہاں کے آدی واسی دھنوبار، اور

سیونتا لوگ جنگل سے تیتر، بٹیر اور پنڈک جال کے ذریعے پکڑ کر اپنی روزی روٹی چلاتے تھے۔ حالاں کہ مشہور ماہرِ طیور سالم علی کی کتاب "بھارت کے پرندے" کے مطابق تیتر اور بٹیر ملک کی معدوم ہوتی ہوئی پرندوں کی اقسام میں شامل تھے، لیکن وزیر اعظم کے لنچ کے اہتمام کے لیے انتظامیہ نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بٹیر کا شوربہ بہت ہی لذیذ ہوتا ہے۔ ڈھینگر گاؤں کے اس خالص علاقائی کھانے کو بنانے کے لیے سر گوجا کے مہاراجا کے پیلیس کا مسلمان خانساماں بلایا گیا تھا۔

اور دامنِ کوہ سے لے کر چوبی احاطے کے بنگلے تک عورتیں، لڑکیاں، ایک سے بڑھ کر ایک۔ یہ افسروں، نیتاؤں، ٹھیکے داروں، تاجروں اور مجرموں کے خاندانوں کی عورتیں تھیں۔ مسلسل بولنے والی، گوری چٹی، تھوڑا سا چلنے پھرنے سے ہانپ جانے والی، انگریزی، ہندی کی غیر خالص اور بھدّی زبان میں بولنے والی۔ یہ سب اپنے محبوب وزیر اعظم کو دیکھنے اور اپنے آپ کو انھیں دکھانے آئی تھیں۔

ڈاکٹر واکانکر کا دل اور اداس ہو گیا تھا۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے، جب سورج آسمان کے بالکل اوپر بیچوں بیچ چل رہا تھا، اچانک آسمان میں گھرگھراہٹ شروع ہو گئی۔ ڈھینگر گاؤں کی وادی سے شور اٹھا۔ گرتے پڑتے، چیختے چلاتے لوگ بھاگ رہے تھے۔ پی ایم آ گئے! وزیر اعظم آ گئے! وہ رہا ہیلی کاپٹر! آسمان میں اڑتا لوہے کا شاندار ٹڈا۔

ہیلی کاپٹر لال گنج کی پلانٹیشن سائٹ پر اترا۔ پنکھے کی ہوا سے خوب دُھول اُڑی۔ خاردار باڑھ کے اُدھر لوگ ہیلی کاپٹر کو اترتا ہوا دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ہیلی کاپٹر کو اتنے قریب سے دیکھا تھا، اور وہ بھی زمین پر اترتے ہوئے۔

ڈھینگر گاؤں اسمبلی الیکشن کے ریزرو حلقے کی عزت افزائی ہو گئی۔ اس علاقے کی تاریخ میں پہلی بار وزیر اعظم رونق افروز ہوئے۔

بیگا گاؤں، اراؤں، کول، گونڈ، پاسی، ڈھیمرا، سنسوتا، دھنوبار، اگریا ــــ تمام کے تمام آدی واسی مردوں، عورتوں اور بچوں کی آنکھیں پھٹی اور منھ کھلے رہ گئے۔ وہ بدحواسی کے عالم میں

Scanned with CamScanner

آسمان میں گھر گھراتی اس شاندار آسمانی مخلوق کو دیکھتے ہوئے، اس کے نیچے نیچے اس کی پرچھائیں کو چھونے کے لیے دوڑ رہے تھے۔ انگریز آگیا! انگریز آگیا! راجا آگیا!

ڈھونگر گاؤں کے انسانوں ہی نے نہیں، جنگل کے جانوروں، پرندوں اور مویشیوں نے بھی پہلی بار ہیلی کاپٹر کا تجربہ کیا تھا۔

زندہ باد! زندہ باد! جے ہو! وہ دیکھ... وہ پی ایم! پیچھے پیچھے ہوم منسٹر! وہ رہا ہیلی کاپٹر چلانے والا ڈرائیور۔ دھت! ڈرائیور نہیں بولتے، ڈرائیور تو ٹرک یا ریل گاڑی چلاتا ہے! اور جو بیل گاڑی چلاتا ہے اسے کیا بولتے ہیں؟ وزیراعظم کے انتظار میں کمانڈر اور حفاظتی دستے تعینات تھے۔ گاڑیوں، موٹروں کی قطار تھی۔ دیکھتے دیکھتے وزیراعظم پل بھر میں کسی کار میں غائب ہو گئے۔ اور اسٹین گن لوگوں کی اور تانے پولیس، کمانڈو اور حفاظتی دستے کی گاڑیوں کے درمیان گھری ان کی کار سرسے سرکٹ ہاؤس یعنی کٹھ بنگلے کی طرف روانہ ہو گئی۔

پی ایم کاروں جیپوں کے قافلے کے درمیان کی کسی کار میں تھے ــــ سیاہ، بُلٹ پروف کانچ کے پیچھے۔ بھیڑ پیچھے پیچھے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اگر پولیس اور سی آر پی والے نہ روکتے تو بھیڑ کٹھ بنگلے تک پہنچ جاتی۔

"وہ دیکھو، وہ رہی پی ایم کی کار!"

"وہ نہیں، پی ایم تو پیچھے والی میں ہیں۔"

"ہٹ! پی ایم ایمبیسیڈر میں چلیں گے؟ کوئی لوکل لیڈر ہوگا۔"

لاؤڈاسپیکر سے اعلان ہو رہا تھا: عوام سے گزارش ہے کہ آپ لوگ لال گنج کے میدان میں جمع ہوں۔ وزیراعظم ٹھیک تین بجے عوام سے خطاب کریں گے۔ عوامی جلسے کو کامیاب بنائیے۔"

سرکٹ ہاؤس کے مین گیٹ سے صرف دو کاروں کو اندر جانے دیا گیا۔ ایک میں وزیراعظم تھے۔ دوسری میں وزیرداخلہ؛ ایک فلمی ہیرو اور ایک تانترک ٹائپ کا آدمی ان کے ہمراہ تھا۔

وہ ڈاکٹر واکانکر کی زندگی کا حیرت انگیز، اولین اور سنسنی خیز لمحہ تھا جب انھوں نے سامنے سے گزرتے ہوئے بھارت کے وزیراعظم کو ایک بیتا کے فاصلے سے دیکھا۔ وزیراعظم ان کے اتنے قریب سے گزر رہے تھے کہ اگر وہ زور سے سانس چھوڑتے تو ان کی گردن کے رُوئیں کانپ جاتے۔

یہ کسی فینٹسی کا عملی نمونہ تھا۔ پچاس کے آس پاس کا تھل تھل، تھکا ہوا آدمی بھارت ورش کا

وزیراعظم ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک عظیم تہذیب کو اپنے میں سمیٹے؛ مختلف زبانوں، ذاتوں، قومیتوں، ذیلی قومیتوں، پہاڑوں، ندیوں، شہروں سے بھری ایک شاندار سرزمین کے لگ بھگ ایک ارب کی آبادی کا ہیرو! وزیراعظم کے گورے چٹے جسم پر چربی چڑھتی جارہی تھی۔ آنکھیں مُندتی جارہی تھیں۔ ہر قدم پر توند تھوڑی سی ہلتی تھی۔ چہرے پر تھکان اور کچھ کچھ چڑنے جیسا تاثر۔

ڈاکٹر واکانکر اچانک چونک گئے۔ انہیں اپنے اوپر شک ہوا، لیکن میڈیکل سائنس کا اتنا طویل تجربہ غلط تو نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ شخص تو پرانے قبض کا مریض ہے ___ اولڈ کانسٹی پیشن۔ اسے پائلز یا فِسٹیولا کی بھی شکایت ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر واکانکر کے سامنے کسی راز کے پردے کھلتے جارہے تھے۔ وزیراعظم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ فوراً فیصلہ کرنے والے شخص ہیں؛ لمبی لمبی میٹنگیں اور بحثیں پسند نہیں کرتے۔ چار گھنٹے کی سکریٹیریل یا منسٹیریل میٹنگ ایک گھنٹے میں ختم کردیتے ہیں۔ ڈاکٹر واکانکر سمجھ گئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پائلز دُکھتے ہوں گے، بواسیر یا فِسٹیولا دیر تک بیٹھنے نہیں دیتا ہوگا۔ تو اس شخص کی اس چُستی پھرتی کے پیچھے بواسیر کا ہاتھ ہے!

ڈاکٹر واکانکر نے دیش کی طرف سے پائلز اور قبض کا شکریہ ادا کیا۔

کلکٹر این ایس کھرے بدحواس سے، ڈاکٹر واکانکر کو دھکیلتے ہوئے، وزیراعظم کے پیچھے لپکتی افسروں کی بِھیڑ میں گھسنے کی کوشش کررہے تھے۔ مقامی نیتاؤں ہی کو نہیں، صوبائی حکومت کے وزیروں تک کو پھاٹک کے اندر نہیں جانے دیا جارہا تھا۔ سرکٹ ہاؤس میں جن کی ڈیوٹی تھی، اُن کے علاوہ بہت کم اشخاص کو تلاشی کے بعد ہی اندر جانے دیا گیا۔

پی ایم، تانترک اور ہیرو کے ساتھ، کمرے میں ریلیکس کررہے تھے۔ وہاں نیا ایرکنڈیشنر لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر واکانکر کی ٹیسٹنگ کے بعد ہی انہیں ٹھنڈا پانی پلایا گیا تھا۔

پی ایم ڈھینگر گاؤں اس لیے آئے تھے کہ یہاں ایشیا کے سب سے بڑے، امریکا کے تعاون، ورلڈ بینک کے قرض اور کارپوریٹ کِنگ فیروز لال ملکانی کی پونجی سے بننے والے، کاغذ کے کارخانے کا افتتاح کریں۔

پیپرمل کے تین سال میں بن کر تیار ہوجانے پر ڈھینگر گاؤں ملک کے صنعتی نقشے میں آ

جائے گا۔ یہاں کے عوام کو روزگار کی سہولت فراہم ہو گی۔ علاقے کی ترقی ہو گی۔ کاغذ کا کارخانہ کاغذ کی پیداوار کرنے کے لیے ڈھینگر گاؤں کے تمام درختوں کو کھا جائے گا۔ جنگل اس کے لیے خام مال ہیں۔ آس پاس کے تمام جنگل ختم ہو جائیں گے۔ پیپل، ساگوان، شیشم، سرئی، کھوا، مہوا، کوسم، چھٹنولا، کوئی بھی نہیں بچے گا۔ جنگلات پر انحصار کرنے والے آدی واسی شہروں میں بننے والی عمارتوں یا اسی قسم کی دوسری اسکیموں میں سستی دیہاڑی اور فرضی مسٹررول پر کام کرنے والے مزدور بن جائیں گے۔ اگریا، بنسور، ممّا، ڈھینگر وغیرہ ذاتوں کی روایتی دستکاری کی گھریلو صنعت ختم ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ حقیقی اور بہت قدیم باشندوں کے کھیت کھلیان بھی کارخانے کے لیے حاصل کر لیے جائیں گے۔ پیپر مل کا ویسٹ پروڈکٹ، یعنی ربڑ، کچرا، کاسٹک سوڈا، تیزاب وغیرہ، سے آلودہ زہریلا دھواں چاروں طرف پھیل جائے گا۔ دھرتی پر، آکاش میں، تیتر، بٹیر، سانبھر، جھینگر، ریچھ، خرگوش، نہیں رہیں گے۔ جنگلوں کے باسی ختم ہو جائیں گے۔ صرف گنتی کے چند سیار بچیں گے جو ڈھینگر گاؤں شہر کے پچھواڑے روئیں گے۔

لیکن کاغذ کی پیداوار اور کارخانے کو چالو رکھنے کے لیے مزید کچا مال چاہیے اور پیڑ چاہییں۔ اس لیے جلدی جلدی تیار ہونے والے یوکلپٹس یا سفیدے کے پیڑوں کا پلانٹیشن ہو گا۔ نرسریاں کھولی جائیں گی جہاں غیر ملکی پیڑوں کے ننھے ننھے بچے لاکھوں کی تعداد میں اگائے جائیں گے۔ سفیدے کا جنگل تیار ہو گا۔ کاغذ بنے گا۔ لوگ بھول جائیں گے کہ یہاں کون کون سے درخت ہوتے تھے۔ یوکلپٹس کے جنگل زیادہ پانی جذب کریں گے۔ ڈھینگر گاؤں کی دھرتی کی پانی کی سطح نیچے گرتی جائے گی۔ کنوئیں میں پانی نہیں رہے گا اور گہری بورنگ ہو گی۔ پھر اَور گہری۔ کھیت نیچا، زمین پرتی ہوتی جائے گی۔ نباتات اور موسموں کے درمیان اب تک قائم رہنے والا توازن بگڑ جائے گا۔ برسات نہیں ہو گی۔ گرمی میں یہاں بھی کوُلر کے بغیر رہنا مشکل ہو جائے گا۔ لوگوں کے پھیپھڑے کاسٹک سوڈا اور دوسرے کیمیاوی اجزا سے آلودہ ہوا کو کھینچتے کھینچتے بیمار ہونے لگیں گے۔ مٹی کمزور ہونے کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ سیونتار ندی میں برسات میں باڑھ آیا کرے گی اور گرمیوں میں وہ سوکھ جایا کرے گی۔ ہر طرف ریت ہی ریت اور کنکر پتھر۔ آدی واسیوں، پسماندہ ذاتوں کی قدیم جڑی بوٹیاں، جن پر ڈاکٹر واکانکر نے تحقیق کی تھی اور جس موضوع پر ان کا ریسرچ پیپر فرانس کے میڈیکل جرنل میں چھپا تھا؛ وہ نایاب پودے جن کا ذکر دامن داس بسو کی کمیاب

تحقیقی کتاب میں ملتا ہے، ختم ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر سالم علی کی کتاب "دی انڈین برڈز" میں اس علاقے کے جن نایاب پرندوں کا تذکرہ ہے، ان کی صرف تصویریں اس کارخانے کے کاغذ سے بنی کتابوں میں ملیں گی۔ سیونتار ندی میں پیپر مل کا ویسٹ، گلدی اور اجزا پھینک دیے جائیں گے۔ مچھلیاں مر جائیں گی۔ مویشیوں میں قسم قسم کی بیماریاں پھیلیں گی۔ وہ بھی مر جائیں گے۔ جنگلی جانوروں کے شکار اور ندی کی مچھلیوں پر انحصار کرنے والی سیونتا، دھنوبار جیسی ذاتیں غائب ہو جائیں گی۔

شکریہ وزیراعظم صاحب! تھینک یو ویری مچ مسٹر پرائم منسٹر! شکریہ بواسیر، تھینک یو ویری مچ فسٹیولا! کیا نام نہاد صنعت نوازی اور ترقی کی کوئی نکسل وادی تعریف نہیں ہو سکتی؟ ایسی ترقی سے کون سی نسلیں مٹتی ہیں اور کن میں اضافہ ہوتا ہے؟ ڈاکٹر واکانکر نے سوچا۔

لیکن انھوں نے یہ بھی سوچا کہ کیا وہ ترقی کی، شہریانے کی، صنعتیانے کی، مخالفت کر رہے ہیں؟ انھیں شک ہوا کہ ان کے دماغ میں کوئی امریکی ایجنٹ تو نہیں چھپ کر بیٹھ گیا ہے جو اس ملک کو ایک پسماندہ، غیر صنعتی، اور غیر جدید معاشرہ ہی بنائے رکھنا چاہتا ہے؟ ہینڈز آف امریکا! ہیل، ہیل پرائم منسٹر!

ملک کے مشہور و معروف صنعت کار اور ڈھینگر گاؤں میں کھلنے والے ایشیا کے سب سے بڑے کارخانے کے ہونے والے مالک فیروز لال ملکانی، دی کارپوریٹ کنگ، وزیراعظم سے ملنے کے بعد باہر نکل رہے تھے۔ ہائی بلڈ پریشر! ایکسیس فیٹ اور ہائی کولسٹرول!

لنچ تیار تھا۔ پی ایم کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے فوڈ ٹیسٹنگ ہونی تھی، ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، کے ذریعے۔

ڈاکٹر واکانکر نے ایک بڑی سی پلیٹ میں تمام فوڈ سیمپلز جمع کیے۔ پی ایم کے سکریٹری وشویشرن بولے:

"آئی تھنک، دی آنر ٹو ہیو ٹیسٹیڈ دس گریٹ لنچ مسٹ فرسٹ گو ٹو دی ہوسٹ، مسٹر کھرے، یس یس۔" (I think the honour to have tasted this great lunch must first go to the host, Mr Khare. Yes, yes!) وشویشرن سر ہلاتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ "کال ہم، کال ہم! ویر از ہی ہائیڈنگ؟" (Call him, call him.

Where is he hiding?)

پیچھے سے، افسروں اور حفاظتی افسروں کے درمیان سے، راستا بناتے کلکٹر این ایس کھرے، آئی اے ایس، رینگتے ہوئے آرہے تھے۔ "آئی ایم ہیر، سر!" (I'm here, sir!)

"کینیپوے،" ڈاکٹر واکانکر نے پھسپھسا کر کہا۔ پھر انھوں نے وشوشورن کی طرف دیکھ کر مذاق کیا۔

"شُڈ وی ایکسپلین ٹو ہم دیٹ ہی از ناٹ ٹو ٹیل آس اباؤٹ دی سویٹ اینڈ سار۔ وی آر کنسرنڈ وِد سم اَدر کویسچنز دین دی ٹیسٹ!" (Should we explain to him that he is not to tell us about the sweet and sour. We are concerned with some other questions than the taste.)

"یس، یس!" جنوبی ہند کے وشوشورن کی گنجی چندیا پھر سے ہلنے لگی۔ "ہاں... ہاں! مسٹر کھرے اِز اور پور لیمب! گنی پگ!" (Mr Khare is our poor lamb! Guinea pig!)

"ہیں ہیں، سر؟" کلکٹر کھرے کی سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آرہا تھا۔ وہ پلیٹ پکڑے کھڑے تھے، ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے۔

"بی کوئک، مسٹر کھرے! پی ایم آنے والے ہوں گے۔ مجھے ٹیسٹنگ کے لیے پندرہ منٹ چاہییں۔ آئی ہیو ٹو آبزرو یور سمپٹمز! بی کوئک!" (I have to observe your symptoms. Be quick!)

کلکٹر کھرے کو جلدی جلدی پلیٹ خالی کرنی پڑی۔ وہ ویجیٹیرین تھے، لیکن جلد بازی میں بٹیر کا شوربہ بھی پی گئے۔ انھیں ڈاکٹر واکانکر کا حکم ماننا تھا کیوں کہ وہ وزیراعظم کے لنچ کے میڈیکل سُپرویژن کے لیے تعینات تھے۔

وزیراعظم کے سامنے میز پر کھانوں کی فراوانی تھی۔ وہ پس و پیش میں تھے۔ ڈاکٹر واکانکر مسلسل ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ پرانا قبض، پائلز۔

"سر، میرا مشورہ ہے کہ آپ رائتہ، مونگ کی دال اور ایک دو پُھلکے لے لیں۔"

وزیراعظم نے آنکھ اٹھا کر واکانکر کی جانب دیکھا۔ آنکھیں ٹکرائیں۔ وزیراعظم کی آنکھیں

Scanned with CamScanner

مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ مریض کو معلوم ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر نے تشخیص کر لی ہے۔
کٹھ بنگلے میں افسروں اور نیتاؤں نے تعجب سے دیکھا کہ بھارت کا وزیر اعظم ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کا تجویز کیا ہوا کھانا ہی کھا رہا تھا — مونگ کی دل، بیتھر کا شوربہ، رائتہ اور دو پھلکے۔
کلکٹر این ایس کھرے کا چہرہ فق تھا۔ وہ ڈاکٹر واکانکر سے آنکھیں ملانے سے کترا رہے تھے۔

تین بجے وزیر اعظم کو لال گنج کے میدان میں عام جلسے میں تقریر کرنی تھی۔ دریں اثنا انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ جلسے سے پہلے گاؤں کے مندر ٹھکردئی میں جا کر چرن امرت لیں۔ ٹھکردئی سے آدی واسیوں، پسماندہ ذاتوں اور مقامی دیہاتیوں کو بہت عقیدت تھی۔ اگر وزیر اعظم یہ کام کریں گے تو عوام کا دل جیت لیں گے۔

بیگا مُرسٹھا (پگڑی) میں سجے وزیر اعظم ٹھکردئی پہنچے۔ وہاں بھی بہترین انتظام تھا۔ ٹھکردئی کے دیوتا ٹھاکر کہے جاتے تھے۔ پتھر کا شاندار مجسمہ۔ تعجب تھا کہ مورتی بدھ کی تھی۔ ڈھینگر گاؤں کے آس پاس کے علاقوں میں کئی طرزوں اور صدیوں کی مورتیاں بکھری پڑی تھیں۔ یہیں سے قدیم کلنگ حکومت کی حدود شروع ہوتی تھیں، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کا سرحدی علاقہ۔ آدی واسیوں کو نہیں معلوم تھا کہ یہ گوتم بدھ کی مورتی ہے۔ وہ انھیں ٹھاکر کہتے تھے، اور دارو اور مرغا چڑھاتے تھے۔ غیر آدی واسی پھول پتے چڑھا کر چرن امرت لیتے تھے۔ سب کو یقین تھا کہ ہر ایک کی منّت پوری ہو جاتی ہے۔

تو کپل وستو کے راجہ شدھودھن کے لڑکے سدھارتھ، یعنی گوتم بدھ، کا اس آدی واسی علاقے میں ایسا روپ بدل گیا تھا۔ دنیا بھر میں بودھ دھرم کا بانی یہاں آکلٹ (جھاڑ پھونک) اور دیوی پوجا، ارچنا کا مرکز بن گیا تھا؛ دارو پی کر اور مرغ کھا کر لوگوں کی مرادیں پوری کرنے والا۔
دوسری طرف، ڈاکٹر واکانکر نے سوچا، پچاس کی عمر کا بالکل عام سا شخص، جس کے جسم پر چربی چڑھ رہی تھی، جو ہائی بلڈ پریشر، پرانے قبض، بواسیر اور فسٹیولا کا مریض تھا، جو ایک مضحکہ خیز تانترک اور تیسرے درجے کے بمبیّا ایکٹر کے ساتھ خود کو نارمل محسوس کر رہا تھا، جو بھارتی انتظامیہ کے بے ایمان، نکمے، رشوت خور افسروں سے ہنسی مذاق کر رہا تھا، جسے اسمگلروں، دلالوں، بے ایمان ٹھیکے داروں، مافیا گروہوں کے قاتل سرغنوں، شراب بھٹی کے ٹھیکے داروں اور جعل ساز

صحافیوں نے گھیر رکھا تھا، جو ڈھینگر گاؤں کے سرسبز شاداب آدی واسی علاقے کو کارخانوں کے اُجاڑ میدان میں بدل دینے کے لیے آیا ہوا تھا، اس آدمی کی بھی بھارت کے پردھان منتری کے روپ میں حیرت انگیز کایا کلپ ہوئی تھی۔

ڈاکٹر واکانکر کو ہنسی آرہی تھی۔ بیگا مُرتھا سے مزین یہ شخص مسلسل مسکرانے کی اداکاری کر رہا تھا۔ تیز تیز چل کر لوگوں کو اپنی چستی پھرتی سے متاثر کر رہا تھا۔ اس نے کوٹے کے کرتے کے اوپر ایک انگوچھا ڈال رکھا تھا؛ اسی قسم کا انگوچھا یہاں کے پانچ آدی واسی گاؤوں کے مانجھی (مکھیا) ڈالتے تھے۔ یعنی یہ شخص، جو فیروز لال ملکانی کے پیپر مل کا افتتاح کرنے ڈھینگر گاؤں آیا ہوا تھا اور جو اس علاقے کے حقیقی باشندوں یعنی آدی واسیوں کو ان کے گھر زمین سے اجاڑ کر انھیں دوسری نسلوں کی کبھی ختم نہ ہونے والی غلامی میں ہمیشہ کے لیے جھونک دینے کا مہرہ تھا، وہ شخص انگوچھے، پگڑی، اور اپنی مسکراہٹ سے آدی واسیوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتا تھا کہ جیسے وہ بھی ان کا مانجھی ہے؛ ان کا مکھیا جو اُن کے بھلے برے، نفع نقصان کی بات سوچتا ہے، انھیں تمام مصیبتوں سے نجات دلاتا ہے۔

ٹھاکردئی میں ٹھاکر کی مورتی مراقبے کی حالت میں تھی۔ رولی، عبیر اور تیل سے مورتی کے کئی اعضا لال ہو گئے تھے۔ ایک طرف پنڈت بڑگیا مہاراج تھے، دوسری طرف سدھو بیگا۔ بڑگیا مہاراج قصبے والوں کے پجاری تھے ــــ ناریل، پھول پتے، منتر، مٹھائی سے پوجا کرنے والے۔ سدھو بیگا آدی واسیوں کا "اوجھا" تھا ــــ چکارا بجا کر، مہوے کا ٹھرا اور مرغا دیوتا کو چڑھا کر، گا گا کر مرادیں پوری کرانے والا اوجھا۔

ٹھاکر دیوتا کی دونوں طرح کی پوجا چل رہی تھی۔ اچانک ٹھاکردئی چاروں طرف مشہور ہو گیا تھا۔ آخر بھارت کا پردھان منتری ٹھاکر دیوتا کی قدم بوسی کرنے آیا تھا۔ لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ ٹھاکر دیو کی جے! پردھان منتری زندہ باد! اسکولی بچے گا رہے تھے: "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا!"

پردھان منتری نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ایک کے اوپر ایک رکھ کر انجری بنائی۔ بڑگیا مہاراج نے گائتری کا پاٹھ شروع کیا: "اوم بھو بھرو سو..." سدھو بیگا زور زور سے کمانی کو چکارے پر ریت ریت کرروں رُوں کر رہا تھا۔ "آجما نو نرسنگھ بٹھے سر..."

پنڈت برگیا مہاراج نے وزیراعظم کی انجری میں چرن امرت ٹپکایا۔ ٹھاکر دیو کی جے! وزیراعظم زندہ باد! رُوں رُوں روں...

وزیراعظم انجری کو اپنی پیشانی کی طرف لے گئے اور پھر آنکھیں موند کر اس کو نوش کرنے جا ہی رہے تھے کہ اچانک ایک تیز آواز آئی جیسے کوئی دھماکا ہوا ہو۔

"اسٹاپ اِٹ! اسٹاپ! آئی سے ڈونٹ ڈرنک اٹ!" (Stop it! Stop! I say don't drink it!)

ہجوم کو چیرتا ہوا ایک ہاتھ ان کی جانب بڑھا، پھر اس نے وزیراعظم کی کلائی کو تھام لیا۔ کمانڈو اور حفاظتی عملہ حیرت زدہ تھا۔

چکارا رک گیا تھا۔ شور کی اچانک موت ہو گئی تھی۔

وہ ہاتھ ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، کا تھا۔

"What's the matter? بات کیا ہے؟" گھبرایا ہوا بواسیر کا مریض ڈاکٹر سے پوچھ رہا تھا۔

"سر، وہ چرن امرت زہریلے پانی کا ہے۔ ڈھینگر گاؤں کے اس علاقے میں جہاں ٹھاکر دئی کا مندر بنا ہے، پانی کا ایک ہی تالاب ہے۔ وہ پانی گندا ہے۔ سر، اس میں خطرناک بیکٹیریا ہے۔ اس کا پانی پی کر پچھلے ہفتے بائیس سے زیادہ آدمی واسی مر چکے ہیں۔ آس پاس کے علاقے میں وبا پھیل گئی ہے۔ ہیضہ! لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح مر رہے ہیں۔"

اپنی انجری میں ٹھاکر دیو کا چرن امرت لیے ہوئے خوف زدہ اور متذبذب وزیراعظم کانپ رہا تھا۔

"آئی تھنک یو شڈ تھرو اٹ اَوے! آفٹر آل ہی از یور فوڈ سپروائزر!" (I think you should throw it away. After all, he is your food superviser!) کالا چشمہ لگائے بمبیا ایکٹر نے وزیراعظم سے کہا۔

"دیکھ، وہی ایکٹر ہے جو خون کی للکار میں مادھوری دیکشت کو ریپ کرتا ہے!" کسی لالا کا لڑکا اپنے نوجوان دوست کو بتا رہا تھا۔

وزیراعظم کی مسکراہٹ پھر لوٹ آئی۔ انجری اوپر گئی اور چران امرت بیگا مُرشا پر گر گیا۔

آدی واسی انگوچھے سے وزیر اعظم نے ہاتھ پونچھے اور ڈاکٹر واکانکر کی طرف دیکھ کر احسان مندی سے کہا:

تھینک یو! یو ہیو اسٹیپڈ ان ایٹ دَ رائٹ ٹائم۔" (Thank you. You have stepped in at the right time.)

ڈاکٹر واکانکر مسکرائے۔ "سر، میں پانچ چھ دن سے لگاتار ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کو وارن کر رہا ہوں کہ ہمیں جلد از جلد کوئی اسٹیپ اٹھانا چاہیے۔ بٹ دے ہیو نوٹ لِسنڈ ٹو اینی تھنگ ایکسیپٹ پی ایمز ٹور!" (But they have'nt listened to anything but the PM's tour!)

"اینڈ دے وڈ ہیو ہاریبلی کلڈ دی پی ایم!" (And they would have horribly killed the PM!) ادھوری ڈیکشٹ کو ریپ کرنے والا، سیاہ چشمہ لگائے اداکار غصے میں تھا۔ گیروے لباس اور رودراکش کی مالا پہنے ہوئے تانترک سامنے آ گیا۔ "یہاں کا کلکٹر کون ہے؟ آسک ہم ٹو رپورٹ ٹو می رائٹ ناؤ!" (Ask him to report to me right now!)

ڈی ایم، این ایس کھرے، قریب ہی تھے۔ ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ انھیں سب کے سامنے اپنی اوقات کا احساس ہو رہا تھا۔ ان کے ساتھ تو ضلعی سطح کے ٹھیکے دار، غنڈے اور صحافی تھے، جب کہ وزیر اعظم کے ساتھ بین الاقوامی سطح کے کارپوریٹ گنگ، صنعت کار، بچولیے، اسمگلر اور اعلیٰ حکام تھے۔ ہندوستانی انتظامیہ کا یہ معمولی آئی اے ایس افسر ایک شاندار نظام کا نہایت حقیر پُرزہ ہی تو تھا، نٹ اور بولٹ بھی نہیں، ربڑ کا ایک معمولی واشر جو گرفت مضبوط بنائے رکھنے کے لیے دونوں طرف سے پستا ہے۔

"آپ کو کیا یہ اطلاع نہیں تھی کہ اس علاقے میں ایپی ڈیمک ہے؟ لوگوں کی ڈیتھ ہو رہی ہے؟" پردھان منتری کے ساتھ آنے والا تانترک، جو بین الاقوامی سطح کا ہتھیاروں کی خرید و فروخت کا دلال بھی تھا، کہہ رہا تھا۔

"نہیں سر، بات یہ تھی کہ میں گزشتہ ایک ہفتے سے آفس جا ہی نہیں سکا۔ یہیں ڈھینگر گاؤں میں پی ایم کی وزٹ کے انتظام میں لگا تھا۔" این ایس کھرے کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اینڈ یو ور بلائنڈ! (And you were blind!) یہاں آپ کو ہیضہ دکھائی نہیں پڑا۔

آپ کو پتا نہیں چلا کہ ڈھینگر گاؤں میں بائیس سے زیادہ آدی واسی مر چکے ہیں؟" یہ پردھان منتری کی آواز تھی، تھکان، قبض اور بواسیر کے درد میں سے نکلتی ہوئی۔

ڈاکٹر واکانکر چپ چاپ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اس ڈرامے کے اس ہیجان انگیز منظر نامے کو انھوں نے لکھا تھا؛ وہی ڈائرکٹر تھے اور وہی مرتب۔ یہ ایک ایبسرڈ ناٹک تھا: آدی واسیوں، بیسپرل، تانترک، وزیراعظم، مجرم، اسمگلروں، دلالوں، افسروں، نیتاؤں، حفاظتی دستوں، صحافیوں، صنعت کاروں کے کرداروں سے بھرا ایک اُول جلول ڈراما۔

اس رات وزیراعظم کے لوٹ جانے کے بعد ڈاکٹر واکانکر نے اپنی ڈائری میں لکھا:

"وہ سارا معاملہ گڈمڈ تھا، لیکن وہی حقیقت تھا۔ ایبسرڈ ریئیلٹی! ہم اسی حقیقت میں رہ رہے ہیں۔ اس حقیقت کی اوریجنیلٹی غیر مشکوک ہے اور اس کی خوفنا کی تخیل پر مبنی ہے۔

"وزیراعظم کے ساتھ آنے والے پریس ایڈوائزر نے ڈھینگر گاؤں کے میدان کے عوامی جلسے کے لیے دوسری تقریر لکھی اور آدھے پون گھنٹے تک وزیراعظم کو نئی تقریر کی تیاری کرنی پڑی۔ انھوں نے اپنی رنج والم میں ڈوبی آواز میں بیٹھنے سے مَرے آدی واسیوں کے خاندانوں کے لیے وزیراعظم فنڈ سے دس دس ہزار روپے کے عطیات کا اعلان کیا؛ ڈھینگر گاؤں کے آس پاس کے علاقوں میں پینے کے پانی کی سہولت فراہم کرنے کے لیے اسکیموں پر بلاتاخیر عمل کرانے کا یقین دلایا؛ عوامی جلسے میں ہزاروں لوگوں کے سامنے انھوں نے کلکٹر اور دوسرے سرکاری افسروں کو ڈانٹ پلائی، اور آخر میں چالاکی کے ساتھ اس علاقے کی ترقی کے لیے کاغذ کے کارخانے کی تعمیر کی بات کی۔"

اس صفحے کے آخر میں کچھ غیر متعلقہ سے جملے اور بھی تھے: "میں نے اس کے چہرے پر موت کی پرچھائیں کا ہلکا دھندلکا دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے جانتا ہے۔ دیش سے یہ بات پوشیدہ رکھی گئی ہے، لیکن اسے دل کے ایک دو دورے ضرور پڑ چکے ہیں۔

"وہ اپنی زندگی کی غیر یقینی حالت سے واقف ہے۔ اس کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ وقت گزار رہا ہے۔ مستقبل میں جینے والوں کے بارے میں وہ مکمل طور پر جواب دہ نہیں ہے۔ وہ ایک نہایت معمولی آدمی ہے۔ اسے قبض اور بواسیر ہے۔ یہ مرض ہی اس کے زندہ ہونے کی علامتیں ہیں۔ اس کی تھوڑی بہت فعالیت بیماریوں کی وجہ سے ہے۔ اس کا زیادہ دن زندہ رہنا

Scanned with CamScanner

مشکوک ہے۔"

وزیرِ اعظم کی واپسی کے تیسرے ہی دن ریاستی حکومت کی جانب سے ڈھونگر گاؤں میں وبا کی روک تھام کے لیے مہم شروع ہوئی۔ ایمرجنسی ہیلتھ کیمپ کھولے گئے۔ تالابوں، کنوؤں میں دافعِ جراثیم دوائیں ڈالی گئیں۔ بچوں کے ٹیکے لگائے گئے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا آپریشن کیمپ بھی لگایا گیا۔ جیپیں دوڑتی رہیں۔

لیکن شعبۂ صحت کی اس پوری مہم میں ڈاکٹر واکانکر کا کوئی رول نہیں تھا۔ انھیں حکومتی مشینری نے اس فلاحی تحریک سے پوری طرح الگ کر رکھا تھا۔

افواہ تھی کہ ان کے بارے میں سی آئی ڈی رپورٹ یہی تھی کہ وہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے بہت پرانے کٹر کارکن ہیں۔ اس بات میں سچائی بھی تھی۔

ریاستی حکومت کے ذریعے چلائی گئی اس تحریک کے انچارج تھے ڈاکٹر ڈی این مصرا، ودھان پور پرائمری ہیلتھ سینٹر کے سابق معالجِ خصوصی، جنھوں نے ڈاکٹر واکانکر کا تبادلہ ودھان پور سے ڈھونگر گاؤں کروایا تھا اور جن کی فرضی خرید کے گلوکوز چڑھانے سے ہرونش پنڈت عرف ٹھکرا مہاراج کی موت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ڈی این مصرا کئی ترقیوں کے بعد اب راجدھانی کے انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کے ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔

ڈاکٹر واکانکر کو اس روز ودھان پور میں گزارے ہوئے دنوں کی خوب یاد آئی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دیکھا کہ سنگھ کی شاکھا میں کسی اسکول کے کھیل کے میدان میں لاٹھی اور لیزم کے ساتھ ٹھکرا مہاراج اکیلے چلے جا رہے ہیں۔ وہ گا رہے ہیں: "سجلام سفلام، ملیج شیتلام، ماترم، بندے ماترم!" پھر انھیں دمے کا تیز دورہ پڑا۔ وہ ہانپنے لگے۔ لاٹھی گر گئی، لیکن انھوں نے لیزم کو اپنے سینے سے چپکائے رکھا۔ ان کے پھیپھڑے ایک سانس کو حاصل کرنے کے لیے پھڑپھڑا رہے تھے اور بھیانک مشینی انداز میں پھولتی پچکتی ان کی چھاتی کے پنجر کے ساتھ لیزم بج رہا تھا۔

ڈاکٹر واکانکر نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ جو منظر انھوں نے ابھی ابھی دیکھا تھا وہ بھی غالباً اسی اُول جلول حقیقت کا حصہ تھا ـــ اسی حقیقت کا ماضی۔

ڈاکٹر واکانکر سو نہیں سکے۔ انھوں نے تلک کی کتاب "گیتا رہسیہ" اٹھائی اور پڑھتے رہے۔

کوتما: ایک نیا شہر

کوتما ایک چھوٹا سا شہر تھا — یا شاید ایک بڑا سا قصبہ۔ ٹرین یہاں آتی تھی۔ بسیں آتی تھیں۔ ٹرانسپورٹ کا بہت کام تھا۔ چونے، سیمنٹ اور اناج کے تھوک تاجر یہاں تھے۔ یہاں ایک انٹر کالج، لڑکے اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ دو ہائی اسکول، "نالتی" اور "کرن" نام کے دو ٹاکیز تھے۔ دو تین ویڈیو ہال تھے جہاں زیادہ تر ابھی تک ریلیز نہ ہوئی فلمیں اور بلو فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

کوتما کے آس پاس کئی کانیں تھیں۔ ان کوئلہ کانوں ہی نے ایک دہائی کے اندر اندر اس علاقے کا حلیہ بدل دیا تھا۔ آس پاس کے دیہات کے زیادہ تر نوجوان انھیں کانوں میں کام کرتے تھے۔ کان کا ایک عام مزدور بھی اوور شفٹ کر کے ڈھائی تین ہزار روپے ماہانہ کما لیتا تھا۔ یہ سچ بھی تھا کہ کان کے مزدور کی کمائی پرائمری اسکول کے ماسٹروں، ہسپتال کی نرسوں، کمپاؤنڈروں اور گرام سیوکوں ہی سے نہیں، گاؤں کے متوسط کسانوں سے بھی زیادہ تھی۔ جن لوگوں کے پاس پانچ چھ ایکڑ زمین بھی ہوتی تھی وہ کھیتی کے بجائے کان میں کام کرنا پسند کرتے تھے۔ زمین ریتیلی تھی، آبپاشی کے ذرائع نہ تھے، آسمان کے بھروسے پر فصلیں پکتی تھیں، اور فصلیں بھی کیا — زیادہ تر زمین ایک فصلی تھی، صرف دھان یہاں ہوتا تھا۔

چونے، سمینٹ کی تھوک تجارت اور کوئلہ کانوں کی بدولت کوتما میں بھی روپیا بولنے لگا تھا۔ روپیا آنا چاہیے، چاہے جس طرح سے۔ روپیوں کے آنے ہی کا یہ ثبوت تھا کہ دلی سے ایک ہزار پانچ سو کلومیٹر سے بھی زیادہ دور، مدھیہ پردیش کے ایک بے حد پسماندہ علاقے کے اس قصبے میں بھی، "ماروتی"، "ٹاٹا"، "سبرو" جیسی کاریں، جاپانی تکنیک سے بنی موٹر سائیکلیں، واک مین، کیسیٹ ریکارڈر دکھائی دینے لگے تھے۔ اب ایسی جدیدیت آرہی تھی جس کا تعلق علاقے کی ترقی یا پسماندگی سے نہیں بلکہ روپیوں سے تھا۔ جس کے پاس روپیا تھا وہ جدید ہو رہا تھا۔ جس کے پاس نہیں تھا وہ پچھڑ رہا تھا۔ کوتما کی کانوں کے مزدور، جن کے لیے اسی صدی میں عظیم فلسفیوں نے اعلان کیا تھا کہ یہ وہ طبقہ ہے جس کی محنت کی بنیاد پر تہذیب کا تمام ڈھانچا ٹکا ہوا ہے اور جو آنے والے دنوں میں جب اپنے آپ کو استحصال اور جہالت کی زنجیر سے آزاد کرے گا تو ایک نئی

تہذیب اور معاشرتی بندوبست کا چہرہ اُبھرے گا، وہی کوتما کان کا مزدور اوور شفٹ میں پیسا کما رہا تھا، دارو پی رہا تھا، وی سی آر کرائے پر لے کر بلو اور بمبیا فلمیں دیکھ رہا تھا، اور مست تھا۔ شہر کے باہر جنگلی نالے کے پار چھوٹے چھوٹے ڈھابے کھلے ہوئے تھے جہاں شراب ملتی تھی اور اسنو پاوڈر پوتنے والی آدی واسی لڑکیاں گاہکوں کے ساتھ "بیٹھتی" تھیں۔

اس کے باوجود شہر میں بے روزگاروں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ انھیں دن بھر اور رات بھر، درویشوں کی طرح کسی مشکوک سفر میں مشغول، یہاں سے وہاں آتے جاتے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ کسی پُلیا پر دس پانچ کے جُھنڈ میں بیٹھے نظر آتے، کسی ڈھابے میں چائے کے "کٹ" پر گھنٹوں گزارتے، بیڑی سگریٹ پھونکتے دکھائی دیتے، یا یوں ہی بس اڈے اور پلیٹ فارم پر اپنے جتھے کے ساتھ اس طرح بے پروائی اور اکڑفوں میں ٹہلتے جیسے ایک دن اس زمین پر انھیں کا راج ہوگا۔ ان کے چہرے ایک جیسے اداس، سخت اور نامانوس تھے۔ حقارت، بےدلی اور سماجی غیر افادیت نے انھیں ایک تشدد آمیز تکبر سے بھر دیا تھا۔ وہ بہت معمولی سی بات پر مارپیٹ کرسکتے تھے، قتل کرسکتے تھے، اور ایسا کرتے ہوئے انھیں یہ اطمینان ہوسکتا تھا کہ اب بھی ان کا وجود اس دنیا میں ہے اور وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ تشدد، فساد، جھگڑا، بلاتکار (زنا بالجبر) ان کے لیے اپنی سماجی جلاوطنی اور ذہنی لاچاری سے کسی طرح آزاد ہونے کی ایک چھٹپٹاتی ہوئی مزاحمت تھی جسے سماج جرم مانتا ہے۔ وہ اکثر پُلیا پر بیٹھے کسی ٹرک، بینک یا دکان کو لُوٹنے کی فینٹسی کرتے؛ دو چار پولیس کانسٹبلوں کے ساتھ بیٹھ کر گانجے، چرس یا افیم کی نیپالی بازار سے اسمگلنگ کر کے مالامال ہو جانے کی ترکیبیں سوچتے؛ اس علاقے میں کس سیٹھ کے پاس سونا چاندی ہے، کہاں گانجا چرس ملتی ہے، کس کس محلّے میں کون کون سی لڑکیاں چالو ہیں، تھانے کا کون سا انسپکٹر اور کون سا کانسٹبل رشوت میں کیا کیا پسند کرتا ہے، انھیں ساری معلومات رہتی تھیں۔ وہ ٹی وی میں قسم قسم کی اشیا کے اشتہار دیکھتے، ان کے دل میں ان اشیا کو حاصل کرنے کی للک پیدا ہوتی، لیکن ان کے پاس روپیا نہیں تھا۔ روپیا کسی ملازمت، کسی کاروبار، کسی کام ہی سے مل سکتا تھا، اور وہ ان کے پاس نہیں تھا۔ ہونے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اسی لیے دس پانچ روپے ملنے پر ہی وہ سٹا کھیلتے یا لاٹری کا ٹکٹ خریدتے۔ یہ پیسا کمانے کا اتنا ہی غیر حقیقی، ہوائی اور غیر یقینی طریقہ تھا جتنی ان کی زندگی اور ان کی حالت۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کو کوتما آئے تین سال ہو گئے تھے۔ ڈھینگر گاؤں سے ان کا تبادلہ

Scanned with CamScanner

سی آئی ڈی کی رپورٹ کے بعد کیا گیا تھا۔ انھیں صوبے کے سنگھ سنچالک نے بتایا تھا کہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ سی آئی ڈی نے ان کے بارے میں لکھا تھا: ان کی ڈھینگر گاؤں میں موجودگی سے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ ہی کو نہیں، نکسل وادی تحریک کو بھی بڑھاوا مل سکتا ہے۔ اس اطلاع نے ڈاکٹر واکانکر کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ سنگھی ضرور تھے، اور گزشتہ کئی برسوں سے اس میں فعال بھی تھے؛ اس فعالیت ہی کا نتیجہ تھا کہ اب وہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے دانشور اعلیٰ اور میڈیکل آفیسرز ایسوسی ایشن کے صدر بن گئے تھے۔ لیکن ان کی کن کارروائیوں سے نکسل واد کی ہمت افزائی ہو رہی تھی، یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بعد میں، کافی غور و فکر کرنے پر، انھیں لگا تھا کہ دراصل سرکاری نوکرشاہی جس شخص کے خلاف کوئی ٹھوس مجرمانہ کیس نہ بنا سکتی ہو لیکن جس کی حرکات و سکنات سے خود کو پریشانی میں محسوس کرتی ہو، اس کے لیے اس نے نکسل وادی کی کیٹگری بنا رکھی تھی؛ اسے اسی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جب کہ ڈاکٹر واکانکر نکسل واد کے نظریات اور اس کے طریقِ کار سے غیر متفق تھے۔ وہ عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے۔ وہ تشدد کے کسی بھی انداز کو ناپسند کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ سنگھ کی شاکھا میں ہندو راشٹر کے قیام کے لیے سویم سیوکوں اور کارکنوں سے پوری ہمدردی اور اخلاص سے لوگوں کا دل جیتنے کی بات کرتے تھے۔ ایسے میں ان کی دوسرے معزز بندھوؤں یا "بھائی جیسوں" کے ساتھ کھٹ پٹ بھی ہو جاتی تھی۔

کوتما میں بھی ڈاکٹر واکانکر نے شہر اور آس پاس کے دیہات کے لوگوں کے دلوں میں اچھی جگہ بنا لی تھی۔ لوگ ان پر اپنا پورا اختیار مانتے۔ کوئی بھی بیمار ہوتا تو ڈاکٹر واکانکر اگر ہسپتال میں نہ ہوں تو انھیں گھر جا کر گھیر لیا جاتا؛ یہ دیکھے بغیر کہ رات ہے یا دن۔ ڈاکٹر واکانکر کی خاندانی زندگی اس سے منتشر ہو جاتی لیکن وہ یہ بات کسی پر ظاہر نہ کرتے۔ وہ کوتما کے آس پاس کے علاقے میں بھی ایک بھلے، ہمدرد اور ماہر معالج کے طور پر مشہور ہونے لگے تھے ـــ ایک ایسا ڈاکٹر جس کا علاج موثر تھا اور جو مریضوں کو لوٹتا نہیں تھا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر واکانکر کے آنے کے بعد کوتما کے سنگھ کی شاکھا میں بھی نئی فعالیت آئی اور اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے والے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی۔

لیکن ڈاکٹر واکانکر دیکھتے کہ ان سب کے باوجود سنگھ کی سرگرمیاں تاجروں اور اعلیٰ ذاتوں کے دائرے تک ہی محدود ہیں۔ ان کا بہت جی چاہتا کہ قرب و جوار کے دیہات کے عام لوگ، آدی

واسی اور دوسری ذاتوں کے افراد اس میں شامل ہوں، لیکن سنگھ کی تنظیم کچھ ایسی تھی کہ اس میں نہ تو اتنے لوگوں کی شمولیت کے امکانات تھے اور نہ خود اُن لوگوں کو اس سلسلے میں کوئی دل چسپی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر واکانکر نے اوپر صوبائی سطح تک خط و کتابت بھی کی لیکن ان کے خطوط کا بہت ہی مختصر، رسمی سا جواب دے دیا جاتا۔

ڈاکٹر واکانکر کو کئی بار شک ہونے لگتا کہ کیا واقعی راشٹریہ سویم سیوک سنگھ ملک بھر میں ہندو دھرم کے ماننے والوں کے اندر کسی قسم کی فرقہ وارانہ خاندانی ذہنیت پیدا کرنے یا ان میں بیداریِ نو پیدا کرنے، اپنی رسومات کو ترک کرنے اور ویدوں، اپنشدوں، پرانوں میں بیان کردہ مذہب کی اصل روح کو اپنانے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے یا اس کا کوئی دوسرا مقصد ہے جسے یہ بخوبی پورا کر رہی ہے ـــ اس بات کو سب سنگھ سنچالک اور دوسرے لوگ جانتے ہیں، اس لیے وہ اتنے ہی سے مطمئن ہیں۔ ڈاکٹر واکانکر جتنا سوچتے ان کے اندر بے چینی اور بے اطمینانی اُتنی ہی بڑھتی جاتی۔ وہ سنگھ کو اپنا مانتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے قریب قریب پچیس برس اسے سونپے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ خود اپنے کو سنگھ سے بے تعلق اور مایوس بنا لیتے؟

بیٹیاں بڑی ہو گئی تھیں۔ جہیز کا مسئلہ سامنے تھا۔ حالاں کہ ڈاکٹر واکانکر کو یقین تھا کہ پڑھائی میں تینوں لڑکیاں جتنی تیز تھیں اس سے آگے چل کر انھیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن جیوتسنا واکانکر فکرمند رہتی تھیں۔ وہ تھک چکی تھیں۔ ڈاکٹر واکانکر کی ایمانداری، لگن اور اقدار پرستی کا بوجھ ان کو ڈھونا پڑا تھا۔ وہ بارہا اپنی قسمت کو کوستیں۔ اگر ان کی شادی کسی عام، عملی اور دنیادار قسم کے ڈاکٹر سے ہوتی تو زندگی میں مسرت اور شادمانی کے پل آتے، گھر کی چولیں ہر وقت درکتی ٹوٹتی نہ رہتیں، محرومیاں اور مصیبتیں ہر وقت گھر کے اوپر آکاش میں پر پھیلائے منڈلاتی نہ رہتیں۔

جد و جہد کی بھی ایک حد ہوتی ہے، ایک عمر ہوتی ہے۔ وہ ڈاکٹر واکانکر کو دیکھ کر لرز جاتیں۔ جھریوں میں گھرتا ہوا اُن کا چہرہ، لگاتار کم اور سفید ہوتے بالوں میں سے جھانکتا ان کا شکست خوردہ اور معصوم گنجاپن، تھکا ہوا، بوڑھا ہوتا ان کا جسم، بلڈ پریشر اور داڑھوں میں درد۔

جیوتسنا کا جی چاہتا کہ اپنے شوہر کو پکڑ کر انھیں ہلائے، ان سے لپٹ کر کہے کہ اب بس کرو، مان جاؤ۔ مشکل سے زندگی کے دس بارہ برس اور بچے ہیں... دیکھو... ہم دونوں اور ہمارا خاندان

دھیرے دھیرے کسی گہرے اندھیرے کنویں میں اتر رہا ہے۔ ہر قدم پر موت اور بے بسی کی تاریکی دبیز ہوتی جا رہی ہے۔ اپنی ان تینوں بیٹیوں کی طرف دیکھو۔ یہ عمر ایسا بجھا اور بدحواس چہرہ ڈھونے کے لیے نہیں ہے۔ تمھارے جہاد اور بلند نصب العین نے ان کے اندر ایک ایسا گہرا عدم تحفظ پیدا کر دیا ہے کہ وہ ہر وقت کسی ناگہانی کے ہونے کا خوفناک انتظار کرتی رہتی ہیں۔

جیوتسنا واکانکر رونے لگی تھیں۔ ان کے دل میں پہلی بار ایسی ناراضی پیدا ہو رہی تھی جو دھیرے دھیرے اپنے شوہر کے لیے نفرت میں بدلتی جا رہی تھی۔ اگر اس شخص کو یہی کرنا تھا تو اس نے شادی کیوں کی؟ اسے اتنے لوگوں کی زندگی برباد کرنے کا کیا حق ہے؟

جیوتسنا واکانکر کو لگا کہ اپنے شوہر کی جو تعریف تمام لوگوں سے سنتی رہتی ہے، وہ سب درحقیقت ان کا مذاق اڑانے کے لیے ہے۔ انھیں لگا کہ اپنی حماقت اور ضد میں ڈاکٹر واکانکر نے اپنے پورے خاندان کو سماجی تجربہ گاہ میں بدل ڈالا ہے جسے ہر ایک بہت ذوق وشوق اور حیرت سے دیکھ رہا ہے کہ دیکھو اس خاندان کا خاتمہ کیسے ہوتا ہے! یہ لوگ اجتماعی خودکشی کرتے ہیں یا کہیں بھاگ جاتے ہیں یا کوئی مضبوط سماجی یا غیر سماجی قوت انھیں نگل جاتی ہے۔

جیوتسنا واکانکر ڈر گئیں۔ انھیں لگا کہ وہ پتا نہیں کتنے برسوں سے ایک خطرناک اور منحوس تاناشاہ (ڈکٹیٹر) کی قید میں ہیں جو اوپر اوپر سے بچوں جیسا سادہ لوح اور سنتوں جیسا زاہد دکھائی دیتا ہے، لیکن اس تاناشاہ کی تمام طاقت ختم ہو چکی ہے اور کسی بھی وقت اس کے خلاف کوئی خوفناک بغاوت ہو سکتی ہے۔

آہ! اُس دوپہر کے تین گھنٹے

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کے برتاؤ میں کچھ واضح تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ اب بھی صبح جلدی اٹھتے، ہلکی سی ورزش کرتے، شاکھا جاتے، وہاں اجتماعی ورزش ہوتی؛ لوٹ کر اخبار پڑھتے، ناشتہ کرتے اور پھر دس بجے تک ہسپتال چلے جاتے۔ کوتما میں ان کی سرکاری قیام گاہ ہسپتال سے تقریباً دو کلومیٹر دور ریلوے لائن کے دوسری طرف تھی۔

Scanned with CamScanner

ابھی تک وہی پرانا اسکوٹر ان کے ساتھ تھا۔ وہ چلنے کے دوران ایک خاص قسم کی آواز نکالتا؛ یہ کئی دہائیوں پرانی آواز تھی، ایک ایسے انجن کی زبان جو اب نایاب تھا۔ وقت کے ساتھ مشین کی آواز اور اس کی نسل بھی بدلتی ہے۔ ڈاکٹر واکانکر کو لگتا کہ یہ اسکوٹر پٹرول بھی بہت پیتا تھا لیکن ڈاکٹر واکانکر کے دل میں اسے بیچنے کا کبھی خیال نہ آتا۔ اس لوہے کی خاموش مشین سے انھیں ایک انسانی لگاو سا ہو گیا تھا۔

ان کے اسکوٹر کی آواز سے کوئی دیکھے بغیر ہی جان سکتا تھا کہ یہ ڈاکٹر واکانکر کی آمد ہے۔ ڈاکٹر واکانکر کو شک ہوتا کہ ان کے برتاو اور زندگی سے بھی ایسی ہی، کئی برسوں پرانے کسی انجن کی، آواز آتی ہے اور لوگ اسے جانتے ہیں۔ وہ خاموش رہتے ہیں، احترام کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اس احترام کے پیچھے ایک سرد مذاق یا استعجاب پوشیدہ رہتا ہے: دیکھو اس عجیب شخص کو...

کہیں مَیں نفسیاتی طور پر بیمار تو نہیں ہو رہا ہوں؟ ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی ایس، ایم ڈی، نے سوچا۔ انھوں نے اپنی زندگی اور شخصیت پر اس طرح نظر ڈالنی شروع کی جیسے کوئی کسی خریدی جانے والی شے کو دیکھتا ہے۔ اُن سے فیصلے کرنے میں، امراض کی تشخیص میں، کوئی اہم بھول یا گڑبڑ نہیں ہوتی، دواؤں کا انتخاب بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ ڈھینگر گاؤں اور کوتما کے درمیانی برسوں میں ریسرچ پیپرز بھی مستند بین الاقوامی جرنلز میں چھپے ہیں۔ لوگ ان پر بھروسا کرتے ہیں۔ یہ بھروسا اگر نہ ہوتا تو ہسپتال اور گھر میں ان کے پاس اتنے لوگوں کا تانتا کیوں لگا رہتا۔ اگر سنگھ نے انھیں ضلعی دانشورِ اعلیٰ اور میڈیکل آفیسرز ایسوسی ایشن نے انھیں صدر بنایا ہے تو اس سے اس بات کا واضح طور پر پتا چلتا ہے کہ ان میں کسی انجمن کو منظم کرنے کی صلاحیت ہے۔

تو پھر ایسا کیوں ہے؟ وہ اس نظام کے ذریعے ہٹائے جانے اور رد کیے جانے کی کوششوں کو کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ انھیں لگتا ہے کہ وہ سرکاری نظام کے جسم میں داخل ہو جانے والے کوئی ایسا بیرونی عنصر ہیں جسے یہ نظام اُلٹی کر کے باہر نکالنا چاہتا ہے۔

اچانک ڈاکٹر واکانکر کو یاد آیا کہ انھوں نے گزشتہ سات مہینوں سے کوئی چھٹی نہیں لی ہے۔ شاید یہ موزوں وقت ہے جب ایک طویل چھٹی کی ضرورت ہے۔

وہ ساڑھے دس بجے ہی اپنی سرکاری قیام گاہ یعنی گھر میں لوٹ آئے۔ تینوں لڑکیاں اسکول اور کالج چلی گئی تھیں۔ انھیں چار بجے تک لوٹنا تھا۔ جیوتسنا سبزی کاٹنے میں لگی ہوئی تھی۔

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر واکانکر نے گھر کو اچھی طرح دیکھا۔ وہاں ہوا ٹھہری ہوئی سی تھی۔ شہر اور دفتر کی تیز آوازوں کا شور شرابا نہیں تھا۔ ایک تازگی، مستی اور آرام کا ماحول۔ پچھواڑے کی گھاس میں ساڑھے دس بجنے کے باوجود نمی تھی۔ امرود کا اکلوتا پیڑ ابھی جوان ہوا تھا اور اس کی ٹہنیوں میں کچاپن تھا۔

ڈاکٹر واکانکر نے پہلے احاطے کا مین گیٹ بند کیا۔ اسکوٹر کو لے جاکر پچھواڑے رکھا تاکہ لوگوں کو یہ پتا نہ لگے کہ آج وہ گھر پر ہی ہیں۔ پھر انھوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اتنے برسوں بعد انھوں نے الماری سے پرانا ریکارڈ پلیئر نکالا ــــ ایچ ایم وی کا "فیسٹا پاپولر"۔ اسے تقریباً پندرہ برس پہلے انھوں نے اُس وقت خریدا تھا جب مہنگائی الاؤنس کی کئی بقایا قسطوں کی ادائیگی یک مشت ہوئی تھی۔ ریکارڈ پلیئر اب بھی بالکل نیا لگتا تھا لیکن اب ڈسک بننے بند ہو گئے تھے۔ بازار میں کیسٹ پلیئر اور آڈیو کیسٹس کا زمانہ آگیا تھا۔ تمام ریکارڈ خود ان کی اپنی پسند کے تھے۔

"ہم بھی ہیں، تم بھی ہو... دونوں ہیں آمنے سامنے...
دیکھ لو، کیا اثر، کر دیا پیار کے نام نے..."
"ہو میں نے پیار کیا، ہائے ہائے کیا جرم کیا
کہ آنکھوں کا رنگ ہو گیا گلابی گلابی..."

گانے اس تازہ مستی آمیز آزاد فضا میں تیرنے لگے۔ ڈاکٹر واکانکر بیچ بیچ میں اپنی آواز گانوں سے ملا دیتے تھے۔ جیوتسنا واکانکر نے سبزی میں چھونک لگا دی تھی اور وہ چھینکنے لگی تھیں۔ ان کی چھینک نے ڈاکٹر واکانکر کے دل میں گہرا پیار اور ہمدردی پیدا کی ــــ شاید تھوڑی سی محبت اور ہوس بھی۔

جیوتسنا واکانکر کو ایک چھینک اَور آئی تو ڈاکٹر واکانکر کو ہنسی آ گئی۔ وہ اٹھ کر کچن تک گئے۔ انھوں نے دروازے پر کھڑے ہو کر جیوتسنا کو دیکھا۔ زیرے اور مرچ کی جھار سے ان کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ لوکی کی سبزی بن رہی تھی۔

"اب کڑاہی کو ڈھک دو اور چل کر اس کمرے میں تھوڑی دیر بیٹھ لو،" ڈاکٹر واکانکر نے پیار سے کہا۔ جیوتسنا واکانکر نے انھیں افسردگی سے دیکھا۔ پھر انھوں نے کڑاہی کو تھالی سے ڈھانک دیا۔

Scanned with CamScanner

جیوتسنا واکانکر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سفیدی جگہ جگہ سے جھانک رہی تھی۔ گورے جسم میں ڈھیلاپن آ گیا تھا اور ان کے چہرے پر تھکان اور اضمحلال کے نقوش جیسے ثبت ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر واکانکر نے ان کے سر کو سہلایا۔ ہتھیلی کے لمس ہی میں کچھ ایسا تھا کہ جیوتسنا واکانکر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "کنگھی کہاں رکھی ہے؟" ڈاکٹر واکانکر نے پوچھا۔ "یا پھر چلو، پہلے نہا لیتے ہیں۔"

نہاتے ہوئے ڈاکٹر واکانکر نے جیوتسنا واکانکر کے بدن کو دیکھا۔ یہ دونوں جسم جو اَب تھک چکے تھے، تھکان اور جدوجہد نے جن میں قبل از وقت عمر رسیدگی اور ڈھیلاپن بھر دیا تھا، اب بھی ان میں زندگی کی آن بان تھی۔ جیوتسنا کے بدن پر پڑتی پانی کی دھار کو دیکھ کر اب بھی لگتا تھا کہ وہ ایک ٹھوس، جاندار اور بھرے بھرے جسم پر گر رہی ہے۔ ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر جیوتسنا واکانکر کے بدن پر صابن کا جھاگ بناتے ہوئے اس تھکے اور دُکھی جسم کے اندر کے اندھیرے میں چھپے شباب اور زندگی کی ازلی حرارت کو اپنی ہتھیلیوں میں جاگتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ "ہٹو!" اچانک جیوتسنا نے کہا۔ وہ بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ "گدگدی لگتی ہے۔"

ڈاکٹر واکانکر کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ پشپا سریواستو کی ہنسی تھی جو جیوتسنا واکانکر کے گلے سے نکل رہی تھی — بچپنے سے بھری ہوئی، امنگ، ہیجان اور ہوس سے بھری ہوئی، ایک کھلی ہوئی معصوم کلکاری۔ ڈاکٹر واکانکر نے جیوتسنا کی باہنوں کو اٹھا کر ان کی بغل کو چوم لیا۔ صابن کا جھاگ ان کے منہ میں بھر گیا اور وہ خود ہنسنے لگے۔ جیوتسنا کا بدن اچانک کئی برس پیچھے کے ماضی میں چلا گیا تھا — شباب کی ایک گرما گرم اور اچھوتی دوشیزگی کے اجنبی پن سے بھرا بدن، جس میں اب بھی کئی رازوں کی دلکشی باقی تھی۔ پانی کی ننھی ننھی بوندوں میں وہ جسم لرز رہا تھا۔

الماری سے خود ڈاکٹر واکانکر نے سفید فراک نکالی۔ اسے جیوتسنا نے برسوں سے پہنا نہیں تھا۔ اس سوتی فراک کے سفید رنگ پر وقت کا پیلاپن چڑھ چکا تھا لیکن جانگیہ اب بھی سفید تھی؛ ایک ایسا سفید رنگ جو جیتا جاگتا اور فطری لگتا ہے، ہر روز نیا ہوتا ہوا، زندگی اور تازگی سے بھرپور۔

جیوتسنا واکانکر شروع میں شرما رہی تھیں اور ان میں ہلکی سی بے دلی بھی تھی، لیکن دھیرے دھیرے وہ ڈاکٹر واکانکر کے ساتھ وقت سے پرے لے جانے والے اس جادوئی کھیل میں شامل ہو گئی تھیں۔ انھوں نے دو چوٹیاں نکال لی تھیں۔ سرخ ربن کے دو پھول ان کی پیٹھ اور شانوں پر

تتلیوں کی طرح منڈلانے لگے تھے۔ سفید فراک اور جانگیہ میں بندھ کر، اس کساؤ میں ان کا جسم خود ان کے لیے ایک انجانے ہیجان سے بھر گیا تھا۔

ریکارڈ پلیئر میں اب پنالال گھوش کی بانسری بج رہی تھی۔ بانسری کی آواز اسپیکر سے نہیں خود ان دو جسموں کے اندرونی اسرار اور اندھکار سے اٹھتی ہوئی باہر آرہی تھی۔

ڈاکٹر واکانکر نے جیوتسنا کی کلائی پکڑی اور انھیں اپنی آغوش میں بٹھا لیا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا جیوتی، اب میں سمجھوتا کر لوں گا۔ میں بھی ان سب لوگوں کی طرح ہنسنا چاہتا ہوں، جینا چاہتا ہوں۔"

فراک سرک گئی تھی اور جیوتسنا کی ملائم گداز رانوں سے ہلکی روشنی پھوٹنے لگی تھی۔ ایسی مدّھم روشنی جس کی آنچ میں ڈاکٹر واکانکر کی سانسیں گرم ہونے لگیں۔ انھوں نے کس کر جیوتسنا کو اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔

بانسری اب بھی وِلمپت میں تھی ـــــ دور تک جا کر اوجھل ہوتی ہوئی تان، پھر اتنی ہی دوری سے واپسی۔ پنالال گھوش اب زندہ نہیں تھے لیکن ان کی بانسری میں ویسا ہی واضح تسلسل اور مسیحائی تھی، ویسی ہی باریکی اور لوچ جو موت کے بعد کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

بستر پر جیوتسنا ہر حملے کے بعد ڈاکٹر واکانکر کو کس کر جکڑ لیتی تھی اور ان کے اندر سے اتھاہ رُلائی کا سوتا پھوٹ پڑتا تھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ یہ لذت تھکان، عدم تحفظ، شکست اور مایوسی کے درمیان کسی انجانی اور غیر حقیقی جدوجہد کے ذریعے حاصل کی جا رہی تھی۔ یہ صحبت اتنی نایاب اور غیر حقیقی تھی کہ کچھ لمحے بعد فنا ہو جانے والی تھی۔ ایک ایسا اُڑن چھو جو ہوا کی کسی پرت میں تیرتا ہوا اچانک ان دونوں کی زندگیوں میں کچھ پل کے لیے آ گیا تھا اور بس، پھر اسے اوجھل ہو جانا تھا۔

وہ دونوں ہانپ رہے تھے۔ جیوتسنا کے گلے سے ہر بار رُلائی پھوٹ کر باہر نکلتی اور سکھ کی کلکاری میں گم ہو جاتی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اندر اپنے اپنے گم شدہ جیون اور ماضی کی یادوں کو کھوج نکالنے کی لاحاصل کوشش میں مصروف تھے، ایک دوسرے کے اندر اپنا تحفظ اور مفہوم تلاش کر رہے تھے۔

یہ ایک کٹھن اور بڑی کوشش تھی، آنسوؤں میں ڈوبی بے چین چھٹپٹاہٹ سے پیدا ہوئے لمحے بھر کی فانی لذت کا نقطۂ عروج؛ وقت سے آزاد، حقیقت سے الگ، کسی دوسری دوسری دنیا کا

Scanned with CamScanner

تجربہ۔ ڈاکٹر واکانکر نے اچانک جیوتسنا کے چہرے پر بے شمار جذباتی بوسے ثبت کر دیے۔ آنسوؤں کا کھاری پن ان کے اندر سما گیا اور اس عورت کے لیے، جو ان کی بیوی تھی اور جو اس وقت اپنے جسم کی تشلیلی دلکشی میں انھیں اپنے اندر کھینچے لے رہی تھی، اس کے لیے ایک بے مثال قربت اور اپنائیت انھوں نے محسوس کی۔

یکتائی اور لذّت کے انتہائی لمحات میں پنالال گھوش کی بانسری دُرت میں آ گئی تھی۔

کھانا کھاتے ہوئے ڈاکٹر واکانکر نے جیوتسنا سے کہا کہ انھوں نے پندرہ دن کی چھٹی لے رکھی ہے اور اگلے ہفتے تک فیملی کے ساتھ ہنچ مڑھی چلنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

یہ وہ دن تھے جب مدھیہ پردیش ہی میں نہیں بلکہ ملک کے تین دوسرے صوبوں میں بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت بن گئی تھی۔ ڈیزل سے چلنے والے ٹرک کے اوپر رکھے گئے رتھ کے ماڈل کے ساتھ ایک بوڑھے ہندو نیتا نے ملک بھر میں "رتھ یاترا" کی تھی۔ ایودھیا میں مندر مسجد جھگڑے سے پورے ملک کو غیر معقول، غیر انسانی اور ڈراونے طور پر مرتکز کیا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر اس تمام ہلچل کو اپنی فکر میں محسوس کر رہے تھے۔

جوتا، فساد اور پوسٹ مارٹم

سنگھ میں ان دنوں واضح تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ شاکھا کے ممبر رسم نبھانے کی جلد بازی میں آتے۔ ہندووادی دَل کو جو سیاسی فتح حاصل ہوئی تھی اس کا سہرا سنگھ کے سر بندھا تھا۔ یہی وہ ڈھانچا تھا جو اس سیاسی گروپ کی آتما کی طرح چپ چاپ دھیرے دھیرے کام کرتا رہا تھا اور مخالف سے مخالف حالات میں بھی، اس گروپ کے سیاسی انتشار اور زوال کے دور کے بعد بھی، کسی ققنس کی طرح اس گروپ کو دوبارہ پیدا کر دیتا تھا۔

لیکن اب برسوں کے بعد وہ صاحبِ اقتدار تھے۔ صوبے کا اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا۔ نوکرشاہی، پولیس اور ہر قسم کے مالیاتی ادارے ان کے غلام تھے۔ ان کی سماجی حالت واضح طور پر بدل گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

سنگھ کا کام اب زیادہ تر کسی وزیر کا اسٹیشن پر استقبال، جلوسوں اور جلسوں کا بندوبست کرنا، راجدھانی میں نمائندے بھیجنا اور سرکاری اسکیموں کو اپنے قبضے اور کنٹرول میں لینا رہ گیا تھا۔ زیادہ تر ممبر اور کارکن تاجروں کے حلقے سے آتے تھے۔ ان دنوں ہر ممبر کی کوشش ہوتی کہ سرکاری اسکیموں سے ہونے والا فائدہ زیادہ سے زیادہ اس کے حصے میں آجائے۔ کئی لوگوں نے پی ڈبلیو ڈی سے سڑک، پل، اور مکان تعمیر کرنے کے ٹھیکے حاصل کر لیے۔ کئی لوگوں نے انڈسٹریز ڈپارٹمنٹ سے گھریلو صنعتوں کے لیے دیے جانے والے معاشی قرض، عطیات، سبسڈی وغیرہ حاصل کر کے اپنی اپنی فیکٹریاں کھول رکھی تھیں۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو ملنے والا سرکاری فنڈ زیادہ تر سنگھ کے کارکنوں نے حاصل کر لیا تھا۔ نئی نئی دکانوں کے پرمٹ، کئی قسم کی اشیا کے کوٹے، ٹرانسپورٹ کے لائسنس، شراب اور فارسٹ ڈپارٹمنٹ کے سامان کے ٹھیکے سنگھ کے کارکنوں نے لینے کی ہوڑ لگا رکھی تھی۔ سائیکل پر چلنے والے بھائی جی اسکوٹر پر چلنے لگے تھے۔ سنگھ کے ہاتھ میں اقتدار آچکا تھا۔ پولیس والے انھیں دیکھ کر نمستے کرتے۔ تحصیلدار، اوورسیئر، قانون گو، پٹواری، ڈاکٹر، اپنے تبادلوں یا پروموشن کے مسائل لے کر سنگھ کے نیتاؤں کے پاس جاتے۔ کلکٹر اور ایس ڈی ایم کا دورہ ہوتا تو وہ اپنے ساتھ سنگھ کے نیتاؤں کو رکھتے۔ انھیں گھروں پر ان کے لنچ یا ڈنر ہوتے۔

وہ بھارتی انتظامیہ جسے نوکرشاہی کہا جاتا تھا، اپنا کردار اور اپنی وفاداری بدلنے میں ماہر تھی۔ انگریزوں کے زمانے سے لے کر آج تک اس کی موقع پرستی کی بے شمار مثالیں تھیں۔ کچھ ایسے افسران اور سرکاری ملازم جو سنگھ اور ہندووادی سیاسی گروپ کی آنکھ میں کھٹک رہے تھے، ان کا تبادلہ دور دراز کے پسماندہ علاقوں میں کر دیا گیا تھا ــــ پنشمنٹ پوسٹنگ۔

ڈاکٹر واکانکر کو بھی احباب نے مشورہ دیا کہ یہی مناسب وقت ہے کہ وہ ترقی حاصل کر کے اپنا تبادلہ کسی اچھے شہر میں کروالیں۔ ان کی پوری زندگی جس جدوجہد میں گزری ہے، سنگھ کے لیے عقیدت کی وجہ سے انھوں نے جو دشواریاں اور تکالیف برداشت کی ہیں، ان کا انعام حاصل کرنے کا اب وقت آگیا ہے۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر اپنے اندر ایک گہری پریشانی محسوس کرتے۔ انھوں نے سنگھ کو کانگریس اور دوسری سیاسی پارٹیوں سے ہمیشہ الگ مانا تھا؛ یہ سنگٹھن کمیونسٹوں کی طرح ہی ایک

اعلیٰ نصب العین کو لے کر چلنے والا گروہ تھا۔ لیکن اقتدار تک پہنچتے ہی یہ فرق مٹتا ہوا نظر آتا تھا۔ اقتدار میں پہنچ کر کمیونسٹ بھی تو بے ایمان اور عوام دشمن ہو گئے تھے۔

اُن دنوں ڈاکٹر واکانکر نے اپنی ڈائری میں لکھا:

"آج کل سنگھ کی جو حالت ہے میں اس سے بہت مضطرب ہوں۔ گروجی نے سنگھ کے کارکنوں کے لیے کچھ اخلاقی اور مذہبی اصول مقرر کر رکھے ہیں، لگتا ہے ان اصولوں سے کسی کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

"کیا حکومت ایک ایسا طاقتور نظام ہے جس کا اپنا ایک مستقل اخلاقی کردار ہے؟ یہ اپنے پاس آنے والے ہر گروہ، دل، سنگٹھن، نظریے، فلسفے کو اپنے اسی مستقل، ہمہ جاذب کردار کے ذریعہ نگل لیتا ہے؟ ان سب کو اپنا ہی پرانا مانوس چہرہ پہنا دیتا ہے؟

"میں ان دنوں سنگھ میں لگاتار الگ تھلگ پڑتا جا رہا ہوں۔ سنگٹھن کی ترقی میں کسی کی کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔ لگتا ہے جیسے برسوں کے بھوکے اور غیر آسودہ محروموں کی ایک جماعت سنگھ کے روپ میں اکٹھا تھی جو ضیافت کو دیکھ کر اچانک غیر مہذب اور غیر اخلاقی انداز میں اس دعوت پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ الٹے لوگ مجھے غیر عملی کہہ رہے ہیں۔

"کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اپنے ذاتی مفاد کو لے کر چلنا ہی انسان کی فطرت ہے۔ جو شخص اس کو ترک کر دیتا ہے اور اس سے بلند ہوتا ہے اس کو عام لوگ غیر فطری مانتے ہیں۔

"ایک ماہ پہلے ضلع کے رشوت خور اور بے ایمان سرکاری افسروں اور ملازمین کی جو فہرست ہم نے تیار کی تھی، نیتاؤں نے اسے دبا لیا ہے۔ ہری لال اگروال جی کہہ رہے تھے کہ اس فہرست کو دابنے سے سنگھ اپنا مفاد حاصل کر سکتا ہے۔

"میں ایک گہری بے چینی محسوس کرتا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری تمام زندگی ہی ضائع ہو گئی؟"

اس رات ڈاکٹر واکانکر نے خواب میں، بھائی مدن سونی جی کو دیکھا۔ وہ اسے برسوں سے جانتے تھے۔ وہ شروع شروع میں اکھل بھارتیہ وِدیارتھی پریشد کی سرگرمیوں سے ہوتا ہوا سنگھ میں آیا تھا۔ چھوٹا سا دبلا پتلا جسم، تقریباً چوکور چہرہ جو نیچے کی جانب پتلا ہو گیا تھا، "پنچ تنتر" کی کہانیوں کی چالاک لومڑی والی چالاک صورت۔ بھائی مدن سونی جی نے بات چیت کرنے، محاوروں اور

جملوں کا استعمال کرنے کی کافی مشق کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر واکانکر بخوبی جانتے تھے کہ ایسا شخص کسی قدر یا تنظیم کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک فرضی شخص تھا۔ آج کل وہ اسے سنگھ کے ہر بڑے نیتا کے دائیں بائیں دیکھتے تھے۔ وہ سنگھ کے نئے نیتا کے روپ میں اُبھر رہا تھا۔ پٹواری سے لے کر کلکٹر تک اسی کو پوچھتے۔

سنگھ کا مستقبل بھائی مدن سونی تھا۔ فرضی، چوکور چہرے کا چاپلوس اور بناوٹی۔ اس کی نسل ہر جگہ بڑھ رہی تھی۔ وہ سنگھ میں دنیاداری کا ازلی داخلہ تھا۔

خواب میں مدن سونی مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا: بڑبڑبڑبڑبڑ...

***

کوتما کی تاریخ میں قیامت برپا کر دینے والے اس دھماکا خیز واقعے کی شروعات بہت معمولی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اہم واقعات جس نقطے سے شروع ہوتے ہیں وہ اکثر ایک بہت معمولی، ناقابلِ شمار اور مضحکہ خیز نقطہ ہوتا ہے۔

واقعہ یوں تھا:

کوتما کے مہاتما گاندھی انٹر کالج میں گیارھویں جماعت میں پڑھنے والے ایک طالبِ علم نِتن شرما نے ایک سندھی دوکاندار موتی لال ٹھاکروانی سے جوتا خریدا۔ جوتا ایک سو ساٹھ روپے میں خریدا گیا۔ کوتما کے بیشتر سندھی راشٹریہ سویم سیوک سنگھ میں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندووادی دل کا اہم ترین نیتا سندھی تھا۔ کوتما کے اسی انٹر کالج میں بارھویں میں پڑھنے والے ایک دوسرے طالب علم مکیش یادو نے ایک دوسری دوکان سے ویسا ہی جوتا ایک سو بائیس روپے میں خریدا۔

شہر بہت چھوٹا تھا اور قیمت میں فرق بہت زیادہ تھا۔ شہر کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے دوسرے دن دونوں طالب علم نتن شرما اور مکیش یادو ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ کوتما میں ہر ایک دوسرے سے واقف تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے جوتے بارے میں بات چیت کی۔

"تو نے جوتا کتنے میں خریدا؟"

Scanned with CamScanner

"ایک سو ساٹھ روپے میں!" نتن شرما نے بتایا۔

"تجھے دکان دار نے لُوٹ لیا۔ دیکھ، اسی کمپنی کا جوتا میں نے ایک سو بائیس روپے میں خریدا،" مکیش نے کہا۔ پھر پوچھا، "تو نے کس دکان دار سے خریدا ہے؟"

"موتی لال ٹھاکروانی سے،" نتن نے بتایا۔

"حرامی ہے سالا! چل ابھی اس سے پیسے وصولتے ہیں،" مکیش نے تاؤ دلاتے ہوئے کہا۔ اور پھر دونوں موتی لال ٹھاکروانی کی دکان کی طرف چلے گئے۔

ٹھاکروانی نے پہلے تاجرانہ انداز میں بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ "دونوں کی کوالٹی میں فرق ہے۔ ایک نقلی جوتا ہے اور دوسرا کمپنی کا جینوئن مال ہے سائیں۔ پہن کے دیکھو۔ مہینے بھر میں وہ جوتا ٹوٹ جائے گا۔ لکھ کے لے لو سائیں۔ جھگڑا مت کرو۔ ہم زبان دے رہا ہے سائیں!"

"ہمیں بے وقوف بناتا ہے! احمق سمجھ رکھا ہے کیا؟ وہی کمپنی ہے، ویسا ہی جوتا ہے۔ لُوٹ مچار کھی ہے! پیسا کیا پھوکٹ میں آتا ہے؟ چلو روپے نکالو۔"

موتی لال ٹھاکروانی نے تھوڑی سی نہ نُو کی تو نتن شرما نے جوتا اُتار کر اس کے منھ پر مار دیا۔ مکیش یادو بھی طیش میں آگیا تھا۔ اس نے بھی گالیاں دیتے ہوئے دو چار تھپڑ رسید کر دیے۔

جھگڑا دیکھ کر اغل بغل کے دکان دار اکٹھا ہونے لگے۔ ان میں گلاب چند کندنانی بھی تھا۔ موتی لال ٹھاکروانی اس کا چاچا لگتا تھا۔ چاچا کی بے عزتی گلاب چندر کندنانی سے برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے للکارنا شروع کر دیا: "مارو سالوں کو۔ پکڑو، جانے نہ پائے! غنڈا گردی مچار کھی ہے۔ دکان کے اندر گھس کر لُوٹ مار کرتے ہیں۔"

دکان داروں کی تعداد زیادہ تھی۔ انھوں نے نتن شرما اور مکیش یادو کو پکڑ لیا۔ نانک چند بھی باہر نکل آیا تھا۔ "ارے سائیں، ان لونڈوں لپاڑیوں کو یوں ہی چھوڑتے گئے تو جینا دوبھر کر دیں گے۔"

موتی لال ٹھاکروانی ہانپ رہا تھا۔ اس کی شرٹ کی آستین پھٹ گئی تھی۔ گلاب چند کندنانی نے کہا، "ان کو تھانے لے چلو۔ ہم سب گواہی دیں گے۔"

دونوں لڑکے تاؤ تاؤ میں پھنس گئے۔ انھیں دھکیلتے ہوئے تھانے لے جایا گیا۔ اس وقت تھانے میں انسپکٹر نہیں تھا۔ صرف ہیڈ کانسٹبل پانڈے تھا۔ وہ دیوریا ضلع کا تھا اور چھٹے یا ادھا پوا

لے کر ہی معاملہ نمٹا دیتا تھا۔

گلاب چند کند نانی ابھی جوان تھا۔ اس کا خون کچھ گرم تھا۔ اپنے چاچا موتی لال کی ذلت سے وہ مشتعل ہو چکا تھا۔ وہ حولدار پانڈے کو الگ لے گیا، پچاس کا نوٹ اس کی جیب میں ڈالا اور کہا کہ دونوں لونڈوں کی تھوڑی بہت پٹائی کر دی جائے۔ پانڈے کے لیے تو یہ روزمرہ کا کام تھا۔

پانڈے نے دو گھونٹ مارے، پھر وردی سے منہ پونچھتا ہوا نتن شرما کے پاس گیا۔ "جوتا تو تُو نے خریدا تھا، یہ تیرا چچا وہاں کیوں آیا تھا؟ تجھے پتا نہیں کہ یہ سالا خاندانی چور ہے۔"

پانڈے نے مکیش شرما کے تڑاتڑ ڈنڈے جمائے۔ "باپ سُسر دودھ میں پانی ملا کر دنیا کو بے وقوف بناتا ہے اور تو سُسر ججمینٹ کرنے آیا تھا۔"

دونوں لڑکے سہم گئے تھے۔ تھانے میں تین چار سپاہی اور موجود تھے۔ حولدار پانڈے نے دونوں سے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کروائی اور کہا، "چپ چاپ گھر چلے جاؤ۔ زیادہ آئیں بائیں شائیں کی تو ایک سو ستر اور تین سو چھپّن میں بند کر دوں گا۔"

***

شہر چھوٹا تھا، جوتوں کی قیمت میں فرق زیادہ تھا اور جھگڑے کا واقعہ بھی کوتما کے لیے اہم واقعہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے خبر فرش سے عرش تک پھیل گئی کہ مہاتما گاندھی انٹر کالج کے دو لڑکوں کو سندھیوں اور پولیس والوں نے مارا ہے۔

اگلے دن کالج کھلا تو وہاں تناؤ تھا۔ ہر لڑکا نتن شرما اور مکیش یادو سے اس حادثے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ہی اندر طلبا کی بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ یہ کالج کے وقار کا معاملہ تھا۔ کچھ اساتذہ بھی طلبا کی پولیس کے ہاتھوں پٹائی کے خلاف تھے۔ ان اساتذہ نے طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ اس حادثے کی رپورٹ پرنسپل صاحب کو دیں۔ پرنسپل جگدیو سنگھ چوہان تھے۔ انھوں نے بھی اسے اپنے کالج کی عزت کا معاملہ مان لیا اور طلبا سے کہا کہ وہ اس حادثے کے بارے میں ایک میمورنڈم ایس ڈی ایم گپتا کو پیش کریں اور قصوروار حولدار اور سندھی دکان داروں کو سزا دینے کا مطالبہ کریں۔

تقریباً ڈیڑھ سو طلبا کا جلوس، جس میں طالبات بھی شامل تھیں، ایس ڈی ایم گپتا کے بنگلے کی جانب روانہ ہوا۔ گپتا دلی میں پڑھا لکھا تھا اور پانچ سال کے آئی اے ایس کے پیپرز کا رٹا مار کر، کوچنگ سنٹر سے کوچنگ لے کر، دو سال پہلے آئی اے ایس میں آیا تھا۔ اس کے پتاجی دلی میں دو نمبر کا دھندا کرتے تھے۔ اپنے بیٹے کی شادی انھوں نے ایک مارواڑی خاندان کی کانونٹ میں پڑھی لکھی لڑکی سے کی تھی اور تین لاکھ کا نقد جہیز اور فیاٹ، زیورات، فرنیچر، اور بہت سا قیمتی سامان وصول کیا تھا۔

گپتا اور اس کی بیوی رِستو دونوں انگریزی بولتے تھے، شراب پیتے تھے اور کوتما کے لوگوں کو جاہل، گنوار اور پسماندہ مانتے تھے۔

بنگلے کی جانب ڈیڑھ دو سو طالب علموں کی بھیڑ کو آتا دیکھ کر ایس ڈی ایم گپتا ذرا سا گھبرا گیا۔ پھر اس نے اپنی مسوری والی ٹریننگ کو یاد کیا اور راجیش کھنّا کی طرح مسکراتا ہوا پھاٹک پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

"حولدار پانڈے مردہ باد! کوتما تھانا مردہ باد!"

"پانڈے کو پھانسی دو! پھانسی دو! پھانسی دو!"

لڑکوں کا جلوس نعرے لگا رہا تھا۔ ایس ڈی ایم گپتا نے موقعے کی نزاکت کو سمجھا اور اس نے اپنی تمام قابلیت لگا کر ہندی میں کہا، "آپ لوگ تھانے پہنچیے۔ شانتی بنائے رکھیے۔ میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔"

لڑکوں کی نعرہ زن بھیڑ تب تک انتظار کرتی رہی جب تک گپتا اپنی فیاٹ کار میں تھانے کی طرف روانہ نہیں ہوا۔

کوتما کی پھیکی ایس ڈی ایم کی نوکری میں بھی گپتا اب تک اچھا خاصا بور ہو چکا تھا۔ وہ بمبیا فلموں، جاسوسی ناولوں اور بلو فلموں کا شوقین تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ الگ الگ موقعوں پر الگ الگ ہندی فلموں کے ہیروؤں کے مکالمے بولتا ہے۔ ویسے زیادہ تر جب اپنے ماتحتوں سے بات کرتا تھا تو کچھ اس انداز سے بولتا تھا کہ جیسے اسے ہندی نہیں آتی۔ "شِٹ! آئی آل ویز فائنڈ اٹ ڈفیکلٹ ٹو اسپیک دس لینگویج!" (Shit! I always find it difficult to speak this language!) وہ اکثر کہتا۔

تھانے کے پھاٹک پر پہنچ کر طلبا کی بھیڑ رک گئی. پھاٹک اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔ کوتما تھانے میں صرف سپاہی، ایک انسپکٹر اور ایک حولدار تھے۔ دو پرانی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں تھیں جنھیں برسوں سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

ایس ڈی ایم گپتا تھانے کے گلیارے میں انسپکٹر کی کرسی پر بیٹھ کر پولیس والوں سے بات کر رہا تھا۔ اتنے میں طلبا کی نگاہ حولدار پانڈے پر پڑی۔ اسی نے مکیش یادو کو ڈنڈے سے مارا تھا اور نتن شرما سے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کروائی تھی۔ وہ آج بھی اپنے فارم میں تھا۔ نشے میں دُھت۔ صورت حال کی نزاکت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور وہ بیچ بیچ میں ڈنڈا پٹختا ہوا گالیاں بکنے لگتا تھا۔ انسپکٹر نے اسے ایک دو بار ڈانٹا بھی، لیکن تھانے کی باؤنڈری میں وہ باگڑبلا بنا اپنی ٹھسک میں تھا۔ دارو کے نشے میں تو تھا ہی۔

بھیڑ کی طرف سے ایک پتھر سنسناتا ہوا آ کر حولدار پانڈے کی کنپٹی میں لگا۔ "ہائے مار ڈالا مادر— نے!" اس نے زور سے چیختے ہوئے گالی بکی اور کنپٹی پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں تین چار پتھر اَور سنسناتے ہوئے آئے اور ایس ڈی ایم گپتا کے سامنے رکھی میز پر گرے۔ تھانے کے اندر بھگدڑ مچ گئی۔ ایس ڈی ایم گپتا میز کے نیچے چھپ گیا اور چلّایا: "گنیں کہاں ہیں؟ ہتھیار نکالو!"

تھانا چاروں طرف سے احاطے کے اندر گھرا ہوا تھا۔ نکلنے کا ایک ہی راستا تھا — صدر دروازہ۔ وہاں طلبا کی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ نعرے لگ رہے تھے اور پتھر چل رہے تھے۔ پولیس والوں کو خوف زدہ اور ایس ڈی ایم گپتا کو میز کے نیچے چھپا دیکھ کر لڑکوں کا جوش اَور بڑھ گیا تھا۔

"حولدار پانڈے کو باہر نکالو! باہر نکالو!"

"شرابی پانڈے کو باہر نکالو! باہر نکالو!"

"چھوکری باز ایس ڈی ایم، ہائے ہائے! ہائے ہائے!"

تین چار لڑکے پھاٹک کے باہر کھڑی ایس ڈی ایم گپتا کو جہیز میں ملی فیاٹ کے بونیٹ پر بیٹھ گئے تھے اور لکڑی کے ڈنڈوں سے اسے نقارے کی طرح بجا رہے تھے۔

چھَن کی آواز کے ساتھ فیاٹ کا شیشہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ایس ڈی ایم گپتا کو اپنی کار کی فکر ہوئی۔ اس نے انسپکٹر سے کہا، "آسک دیم ٹو فائر! (Ask them to fire!) ہوا میں گولی چلاؤ۔ میری کار خطرے میں ہے۔"

انسپکٹر نے فائر کرنے کے لیے کہا۔ کوتما شہر میں پہلی بار گولی چلنے کی آواز سنی گئی۔ بھیڑ میں بھگدڑ مچ گئی۔ لڑکے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن بھیڑ کا ایک چھوٹا سا حصہ ابھی تک صدر دروازے پر کھڑا ہوا نعرے لگا رہا تھا۔

اسی بھیڑ میں بائیس برس کا توفیق احمد بھی کھڑا تھا۔ وہ لڑکوں کو شانت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں ایس ڈی ایم گپتا کی جانب دیکھ کر چلّاتا تھا: "سر، آپ پھاٹک تک آجائیے! لڑکوں سے بات کیجیے۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا، میں گارنٹی لیتا ہوں۔"

توفیق احمد کوتما میں اسی سال قائم ہونے والی فرقہ وارانہ امن کمیٹی کا ممبر تھا۔ پریم چند اور منٹو کے افسانے اسے بہت پسند تھے۔ کوتما میں اسے ایک سنجیدہ، سمجھ دار اور مہذب لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس نے رسالوں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی۔

یہ فرقہ ورانہ امن کمیٹی اُس وقت بنی تھی جب ایودھیا میں مندر مسجد معاملے کے بارے میں تناؤ پیدا کیا جا رہا تھا اور کچھ دکان دار ایک عورت کی خطرناک آواز کا کیسٹ زور زور سے بجانے لگے تھے۔

کوتما میں مسلمانوں کے بمشکل چالیس پچاس خاندان تھے، جو زیادہ تر غریب تھے، قسائی یا منہاری کا کام کرتے تھے۔ توفیق احمد کی اماں خود کانچ کے ڈبے میں چوڑیاں، بالیاں، کاجل، کنگھی، کانٹے جیسی عورتوں کے استعمال کی چیزیں گاؤں میں جا کر بیچتی تھیں۔

ایس ڈی ایم گپتا نے توفیق کو دیکھا۔ "یہ لڑکا کون ہے؟ لیڈر لگتا ہے،" اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

حولدار پانڈے کی کنپٹی سے خون نکل رہا تھا اور وہاں پر گومڑا اُبھر آیا تھا۔ "کٹوا ہے سر! کنجڑن کی اولاد! لڑکوں کو بھڑکا رہا ہے۔"

دور سے دیکھنے پر گپتا کو بھی یہی لگا تھا کہ توفیق احمد لڑکوں کو سمجھانے میں نہیں بلکہ بھڑکانے میں لگا ہوا ہے۔ تب ہی اس نے دیکھا کہ چار پانچ لڑکوں کا ایک جھنڈ ایک ٹن میں غالباً پٹرول لے کر وہاں پہنچا۔ ان لوگوں نے ٹن فیاٹ پر الٹ دیا۔

توفیق احمد چلّا چلّا کر ان لڑکوں کو یہ حرکت کرنے سے منع کر رہا تھا۔ یہ لڑکے طالب علم نہیں تھے۔ وہ کوتما کے سماج کے نکالے ہوئے غیر مفید حصے تھے جنھیں آج کے حالات میں اپنا

Scanned with CamScanner

وجود اور فعالیت ثابت کرنی تھی۔

ایس ڈی ایم گپتا نے اندازہ لگا لیا کہ اب اس کی فیاٹ کار جل کر راکھ ہو جائے گی۔ "فائر!" اس نے زور سے کہا۔ "I, sub-judicial magistrate, order you to fire!"

فائر!

فائر!

فائر!

نشے میں دھت باگڑ بلا حولدار پانڈے کو افسر کے سامنے اپنی وفاداری اور قابلیت دکھانے کا اس سے اچھا موقع اور کہاں ملتا۔ اس نے جھپٹ کر مُراری لال کانسٹبل کے ہاتھ سے رائفل جھٹک لی اور نشانہ سادھ کر گولی داغ دی۔

دھائیں!

گولی سر کے پیچھے کی جانب لگی ــــ وہیں جہاں دماغ ہوتا ہے۔

توفیق احمد اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ ایک عجیب سا شور ہوا جیسے بھیڑ کے اجتماعی گلے سے کوئی ڈکار نکلی ہو، یا شاید کراہ۔

اس کے بعد تڑا تڑ لاٹھیاں چلیں۔ ہوائی فائرنگ کی گئی۔

بہت سے لڑکوں کے سر، کنپٹی، آنکھ، جبڑوں سے خون بہہ رہا تھا۔

پٹنے والوں میں طالبات اور ان لڑکوں کے سرپرست بھی تھے۔

جب زخمی لڑکوں کے جتھے ہسپتال میں آنا شروع ہوئے تو ڈاکٹر واکانکر ہسپتال ہی میں تھے۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں کی تعداد چار تھی۔ ایک چھٹی پر تھا۔ آج سے پہلے اتنے سارے مریضوں کو سنبھالنے کا تجربہ کسی ڈاکٹر کو نہیں تھا۔ گھبراہٹ پھیل گئی۔

تقریباً سترہ لڑکے ایسے تھے جنھیں زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ خون زیادہ بہنے کی وجہ سے وہ کسی بھی وقت بے ہوش ہو سکتے تھے۔

ہسپتال میں کل آٹھ بیڈ تھے۔

باہر کے دالان میں دری بچھا دی گئی اور زخمیوں کو وہاں لٹا دیا گیا۔

اکا دکا لڑکے اپنی چوٹیں لیے بعد میں بھی آتے رہے۔

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر واکانکر نے اتنے زخمیوں سے نمٹنے کے لیے کوتما کے کچھ پرائیویٹ ڈاکٹروں کو بھی بلالیا تھا۔ تین لڑکوں کی حالت سیریس تھی۔

ایک تیرہ سال کی لڑکی سُشما کوری کے دونوں جبڑوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کا چہرہ ڈراونا لگ رہا تھا۔ جب وہ تھوکتی تھی تو اس میں خون کے قطرے ہوتے تھے۔

ڈاکٹر واکانکر خود او پی ڈی رجسٹر میں زخمیوں کے نام، عمر اور چوٹوں کی تفصیل لکھ رہے تھے۔ دوپہر دو بجتے بجتے زخمیوں کی تعداد بتیس تک پہنچ گئی تھی۔

پتا چلا کہ ضلعی صدر مقام سے ایس پی اور پولیس کے دستے کوتما پہنچ چکے ہیں۔ دکانیں بند ہیں۔ بازار میں سناٹا ہے۔

توفیق احمد سوا دو بجے تک تھانے کے باہر اسی طرح اوندھے منھ پڑا رہا جیسے وہ کوتما کی زمین کو چوم رہا ہو۔

شام ساڑھے تین بجے پی ڈبلیو ڈی کی جیپ میں لاد کر توفیق کو ہسپتال لایا گیا۔

توفیق احمد، عمر ۲۲ سال، ولد رفیق احمد عرف چچا تھمتیا، پرانی بستی، الائیڈ بیڈ نمبر ۳۔ ایمر جنسی۔

ڈاکٹر واکانکر نے اسے چیک کیا۔ ڈاکٹر تیواری، ڈاکٹر سونولکر اور ڈاکٹر اگروال نے بھی دیکھا۔

پونے چار بجے تک توفیق کی کلینیکل موت نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ اس کا دماغ مکمل طور پر موت سے ہمکنار نہیں ہوا تھا۔ لہذا اسے آکسیجن دینے کی کوشش کی گئی۔ چار بجنے میں پانچ منٹ یعنی تین بج کر پچپن منٹ پر اسے مُردہ ڈکلیئر کر دیا گیا۔

توفیق کے والد، چچا تھمتیا، اور اس کی ماں ہسپتال کے باہر بیٹھی بھیڑ میں شامل تھے۔ ہسپتال کے اندر ہر ایک کا داخلہ ممنوع تھا۔ پولیس کا پہرہ تھا۔

کسی نے خبر لِیک کر دی ہوگی؛ باہر سے رونے اور بلکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

توفیق کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔

تقریباً پانچ بجے ایس پی اور ضلع ہسپتال کے سول سرجن ایک ہی جیپ میں وہاں پہنچے۔ سول سرجن بی این گپتا نے ہسپتال کا معائنہ کیا۔ وہاں کے انتظامات دیکھے اور پھر ڈاکٹر

واکانکر کو الگ لے جا کر بات چیت کی۔
"سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" سول سرجن نے پوچھا۔
"جی ہاں، شروع میں دقت ہوئی تھی۔ پھر کچھ لوکل ڈاکٹرز کو بلا کر ہم نے مینیج کر لیا،" ڈاکٹر واکانکر نے کہا۔
"آپ نے او پی ڈی رجسٹر میں تمام زخمیوں کی انٹری کیوں دکھائی؟ اور اگر انٹری کر بھی دی تھی تو تمام چوٹوں کی تفصیلات کیوں لکھیں؟"
"کیوں؟ کیا نہیں لکھنا چاہیے؟ قانون تو یہی ہے،" ڈاکٹر واکانکر تھوڑا سا چونکے۔
"ارے بابا، آپ بھی..." سول سرجن گپتا جھنجھلا گئے۔ "کیا آپ نے اس سے پہلے کبھی ایسا معاملہ ٹیکل نہیں کیا؟ کرتے بھی کیسے! زندگی بھر تو آپ آدی واسی علاقے میں پڑے رہے۔"
"میں سمجھا نہیں سر!" ڈاکٹر واکانکر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔
"ادھر آئیے جیپ میں۔ ایس پی صاحب آپ کو سمجھائیں گے،" سول سرجن گپتا نے کہا اور ڈاکٹر واکانکر کو لے کر جیپ کی جانب چلے گئے۔
توفیق کی اماں زار و قطار رو رہی تھیں۔ اس کی بیوی کو کئی عورتوں نے پکڑ رکھا تھا۔ وہ جانے کہاں بھاگ کر جانا چاہتی تھی۔ اس کا چہرہ بے رونق ہو چکا تھا۔ توفیق کی تین سال کی بیٹی اروا چپ تھی، سہمی ہوئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا؛ یا شاید وہ اپنی عمر کی حد سے زیادہ سمجھ گئی تھی، اس لیے پتھر ہو گئی تھی۔
ڈاکٹر واکانکر، ایس پی اور سول سرجن گپتا، پی ڈبلیو ڈی کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچے۔ پتا چلا کہ آدھے گھنٹے میں کلکٹر رندھاوا وہاں آنے والے ہیں۔ ایس ڈی ایم گپتا بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
سب سے پہلے چائے منگائی گئی اور پھر ریسٹ ہاؤس کا کمرہ اندر سے بند کر لیا گیا۔
سول سرجن بی این گپتا نے بات شروع کی۔
"دیکھیے بھوپال سے میسیجز آ رہے ہیں۔ ہمیں مل جل کر معاملے کو سنبھالنا پڑے گا۔ اِموشنز میں آنے کی بات نہیں ہے۔ سیریس معاملہ ہے۔ ایس ڈی ایم گپتا جی کی پوسٹنگ یہاں اوپر سے ہوئی تھی۔ اپنے ہی آدمی ہیں۔ تھوڑے ینگ ہیں، اس لیے غلطی ہوئی۔"

Scanned with CamScanner

"آپ صاف صاف کہیے،" ایس پی نے کہا۔ پھر اس نے خود ہی کہنا شروع کیا، "دیکھیے ڈاکٹر واکانکر، آپ کے بارے میں ہم نے جو سن رکھا ہے وہ اچھی رپورٹس نہیں ہیں۔ لیکن آج آپ کو ذرا سمجھ داری سے کام لینا ہو گا۔ کئی لوگوں کی ملازمت کا سوال ہے۔ ایڈمنسٹریشن اور پولیس، دونوں کے لوگ اس میں انوالو ہیں۔"

کمرے کی ہوا اچانک بھاری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر واکانکر کو لگا کہ بلب کی روشنی کچھ مدھم ہو گئی ہے۔ ایس پی اور سول سرجن کے چہرے بہت دور دکھائی دینے لگے۔

ایس پی کی آواز بہت بھاری تھی — بھاری اور کرخت، جیسے اس آواز میں دھیرے دھیرے لوہا بھرتا جا رہا ہو۔

"تھانے کا مین گیٹ ایک ہی تھا۔ اُسے لفنگوں نے گھیر رکھا تھا۔ دو سو کی بھیڑ تھی۔ اگر فائرنگ نہ کی گئی ہوتی تو انھوں نے ایس ڈی ایم کو لیچ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہوتا۔ میں نے موقع واردات کا معائنہ کیا ہے۔ دیکھیے ڈاکٹر واکانکر، میں نہیں چاہتا کہ اس کیس میں میرے لوگوں پر آنچ آئے۔ انکوائری ہو گی تو بعد میں ہو گی۔ ابھی تو اسے ڈِفیوز کرنا ہے۔"

سول سرجن ڈاکٹر واکانکر کو دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر واکانکر نے کہا، "آپ مجھے صاف صاف بتائیے۔ مجھے کیا کرنا ہے؟ جو ہو سکے گا میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"یہ ہوئی نا بات!" ایس پی نے کہا۔ کمرے کی روشنی لوٹ آئی۔ ہوا ہلکی ہو گئی۔ سول سرجن گپتا نے کہا، "چائے منگوائی جائے۔"

"دیکھیے، دو چیزیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ آپ او پی ڈی رجسٹر یہیں منگوا لیں اور زخمیوں کی فہرست میں اپنے تھانے کے سپاہیوں کی انٹری چڑھا دیں۔ ہم نے ساری بریفنگ دے دی ہے۔ دو تین انٹریز سیریس ہونی چاہییں،" ایس پی نے کہا۔ "اور دوسرا یہ کہ..." سول سرجن نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا۔ ان کا چہرہ بہت گمبھیر ہو اٹھا تھا۔ "دوسرا یہ کہ توفیق کی ڈیتھ پتھر لگنے سے دکھائی ہے۔ اسٹون انجری۔" کمرے میں اچانک سناٹا ہو گیا۔ بلب پھر مدھم پڑ گئے۔ ڈاکٹر واکانکر کو لگا جیسے وہ کسی بہت پرانے قلعے میں پھنس گئے ہیں اور باہر نکلنے کا راستا بھول گئے ہیں۔ یہی وہ نظام تھا جس کا وہ ایک حصہ تھے۔

"پوسٹ مارٹم آج ہی ہونا ہے۔ پوسٹ مارٹم کے لیے جو پینل بنا ہے اس میں تین ڈاکٹر ہیں۔ میں بھی ہوں۔ بلاک میڈیکل آفیسر اور سینیئر ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے آپ بھی ہیں۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ گورنمنٹ یہی چاہتی ہے۔" سول سرجن مطمئن تھے۔

باہر جیپ رکنے کی آواز آئی۔ کلکٹر رندھاوا آ گئے۔ بھرا پرا پنجابی جسم، پچاس کے آس پاس عمر، سنگھ کے ساتھ پرانا رشتہ۔ ایک بار تو یہ افواہ بھی اُڑی تھی کہ وہ اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے کر چناو لڑنے والے ہیں اور ریاستی کابینہ میں ان کے لیے وزیر کا عہدہ پہلے سے ریزرو ہے۔

"ہیلو بوائز! کیا چل رہا ہے؟" رندھاوا کے چہرے پر کوئی شکن نہ تھی۔ "اٹ سیمز ایوری تھنگ از آل رائٹ۔" (It seems everything is alright.) رندھاوا صاحب سے سب کو متعارف کرایا گیا۔

"یہ پورے ملک میں ہو رہا ہے۔ جب سے پارٹی پاور میں آئی ہے اُسی وقت سے یہ چل رہا ہے۔ جگہ جگہ فسادات۔ اب کو تما جیسے پسماندہ علاقے کو بھی پولی ٹیسائزڈ کر دیا گیا۔" کلکٹر رندھاوا نے سب کے چہرے دیکھے۔ پھر وہ رک گئے۔ ان کی نظر ڈاکٹر واکنکر کے چہرے پر جم گئی۔

"کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" رندھاوا نے پوچھا۔

"دن بھر کا ایگزرشن ہو گا۔ صبح سے زخمیوں کو سنبھال رہے ہیں،" سول سرجن گپتا نے کہا۔

"کیا نام تھا اس لڑکے کا؟" کلکٹر نے پوچھا

"توفیق احمد!"

"ہاں، ہاں، توفیق احمد۔ کس پارٹی نے لگایا تھا اسے، کچھ پتا چلا؟" سوال ایس پی سے پوچھا گیا تھا۔

"ہماری بات اگروال جی سے ہوئی تھی۔ بھوپال سے لا منسٹر ٹی پی سنگھ کا بھی فون آیا تھا۔ معاملہ پولیٹیکل ہے۔ ان کی کانسٹی ٹیونسی میں انھیں کمزور کرنے کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔"

"سنگھ صاحب آ رہے ہیں کیا؟"

"ہاں۔ کل دوپہر۔"

ایس پی نے کلکٹر رندھاوا کو دیکھا۔ پھر ان سے کہا، "ہم نے کمیونل رائٹ کا ہی معاملہ بنایا

Scanned with CamScanner

ہے۔ لڑکوں کے دو گروہوں میں، جو الگ الگ کمیونٹی کے تھے، آپس میں کلیش ہوا..."

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..." کلکٹر نے کہا۔ "یہی تو ہر جگہ ہو رہا ہے جب سے یہ پارٹی تھوڑی بہت مضبوط ہوئی ہے۔ یہاں بھی یہی تھا۔ وہ لڑکا توفیق احمد کسی کا پلانٹ تھا۔ اب دیکھنا کل سے دھرنا، بھوک ہڑتال اور جلوس شروع ہوں گے۔ سنگھ صاحب کے پُتلے جلیں گے... اچھا پوسٹ مارٹم کی ٹیم بنی؟"

سول سرجن گپتا بولتے ہی جا رہے تھے کہ ڈاکٹر واکانکر صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، لگتا ہے چکر سا آ گیا۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا،" ڈاکٹر واکانکر نے کہا۔ ان کی آواز کہیں پھنس رہی تھی۔ لگتا تھا وہ دور کسی کھنڈر کے کونے میں ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے درمیان پڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور اس مدھم ہوتی ہوئی روشنی میں دور نظر آتے چہروں سے کہا، "سر، مجھے چھٹی دے دیجیے۔ سِک لیو۔ مجھے اس پوسٹ مارٹم کے پینل میں شامل نہ کیجیے۔"

دو لمحے کے لیے کمرے میں پھر سناٹا چھا گیا۔

کلکٹر رندھاوا نے صورتِ حال سنبھالی۔ "آئی انڈر اسٹینڈ! آپ تھک گئے ہیں۔ ایگزرشن ہے۔ ذرا سا آرام کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد کلکٹر نے مذاق کیا، "بڑے قصے سنے تھے ڈاکٹر واکانکر کے! سنگھ کے لیے کتنا اسٹرگل کیا، وزیر اعظم تک کو نوچ ڈالا... ہو، ہو، ہو! اور آج لڑے بغیر میدان چھوڑ رہے ہیں۔ ہو ہو..."

ایس پی نے اپنے حصے کا اضافہ کیا، "اگروال جی کہہ رہے تھے کہ اپوزیشن پارٹیوں اور مائنارٹیز میں سانٹھ گانٹھ ہے۔"

"اسی لیے تو میں کہتا ہوں ڈاکٹر واکانکر کہ اب لڑائی کا اصلی زمانہ آ گیا ہے... آپ سوچتے ہیں کہ کوتما میں جو کچھ ہوا وہ جوتے کے لیے ہوا ہے؟ دنیا اتنی آسان نہیں رہ گئی ہے ڈاکٹر صاحب! توفیق مخالف پارٹیوں کا ایجنٹ پرووو کیٹر تھا... وہ جوتے کے لیے نہیں، بھوپال میں سنگھ صاحب اور ایودھیا میں بابری مسجد کے لیے وہاں موجود تھا..." کلکٹر رندھاوا کی آواز بلند ہو گئی۔ "اینڈ آئی کین پرووو اٹ! اٹ واز اے ویل پلانڈ ہولیگنزم۔ (And I can prove it.

ان لوگوں کو اسی طرح ٹھیک کرنا ہوگا۔ (It was a planned hooliganism.)"

"ڈاکٹر واکانکر کو تھوڑی دیر آرام کرنے دیا جائے۔ ہم لوگ باہر بیٹھیں،" ایس پی نے تجویز پیش کی۔

کمرے میں ڈاکٹر واکانکر اکیلے پڑے تھے، کسی قلعے کے اندر۔ ان کا بلڈ پریشر غیر متوازن ہو گیا تھا۔ آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔ وہ سونا چاہتے تھے لیکن آنکھیں موندتے ہی ان کے اندر ایک شدید بے چینی کا طوفان اٹھتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھے۔ بیگ سے کاغذ اور قلم نکالا اور ایک مختصر سی درخواست سول سرجن بی این گپتا کے نام لکھی۔

"جناب چیف میڈیکل افسر صاحب

"محترمی،

"اطلاعاً عرض ہے کہ علالت کی وجہ سے میں ہسپتال آنے سے معذور ہوں۔ براہِ کرم مجھے پندرہ دن کی چھٹی عنایت فرمایئے۔

"ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، ضلع ہسپتال افسر، کوتما۔"

لاش، دھرم اور انتہائی طبی نگہداشت

چھٹی کی درخواست کلکٹر رندھاوا کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پہلی بار پریشان نظر آرہے تھے۔ ان کے گورے چٹے پنجابی چہرے پر پسینے کی بوندیں جھلک آئی تھیں۔

"یہ کیا ہے ڈاکٹر؟ اٹ از اسٹرینج! (It is strange.)"

سول سرجن بی این گپتا تھوڑے غصے میں تھے۔ "آپ کو پتا ہے کہ آپ چھٹی نہیں لے سکتے۔ اگر چھٹی لینی تھی تو آپ صبح ہی سے لے لیتے۔ آپ نے تمام زخمیوں کی انٹری اور ان کی چوٹوں کی تفصیلات اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں۔ سارے پریسکرپشن آپ کی ہینڈ رائٹنگ میں ہیں۔ کمال ہے ڈاکٹر... آپ اب چھٹی کی بات کر رہے ہیں؟ اگر آپ اب چھٹی پر گئے تو افواہیں پھیل جائیں گی۔"

ڈاکٹر واکانکر کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ وہ اب کچھ نارمل نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے بہت بے نیازی سے کہا، "میں نے اب تک جو کچھ کیا، ٹھیک کیا۔ کلرک چھٹی پر تھا اس لیے میں نے رجسٹر خود بھرا۔ چوٹوں کی جو ڈیٹیلز لکھیں وہ بالکل صحیح اور اگزیکٹ ہیں۔ لیکن بہتر ہے کہ آپ لوگ، مجھے آزاد کر دیں۔"

"کیا مطلب؟" کلکٹر رندھاوا کی آواز بلند ہو گئی۔ "آپ پوسٹ مارٹم کے پینل میں نہیں رہنا چاہتے؟"

"یہ آپ کی ڈیوٹی ہے!" سول سرجن نے حاکمانہ انداز میں کہا۔

"اگر یہ میری ڈیوٹی ہے تو میری ڈیوٹی یہ لکھنا بھی ہے کہ اس کی موت سر میں گولی لگنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ "Cereberal injury caused by gun-shot

ڈاکٹر واکانکر کی آواز میں سرد مہری تھی، ایسی سرد مہری جو کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد آتی ہے۔

"آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ بچوں جیسی باتیں۔"

ایس ڈی ایم گپتا بھی، جس کے حکم سے گولی چلی تھی، وہاں موجود تھا۔

"آپ انھیں سمجھائیے ایس پی صاحب! کئی افسروں اور پولیس والوں کے کریئرز کا سوال ہے،" کلکٹر رندھاوا نے ایس پی سے کہا۔

ایس پی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ کاغذ نکالے۔ "پتا ہے یہ کیا ہے؟ یہ ایپلی کیشن ہے، میمورنڈم ہے۔ توفیق کے گھر والوں، اس کی بیوی، ماں اور باپ، کی طرف سے عرضی آئی ہے کہ پوسٹ مارٹم ڈاکٹر واکانکر سے کروایا جائے۔ یہ کوتما کے شہریوں کی طرف سے ارسال کردہ درخواست ہے، اپوزیشن پارٹیوں نے بھی میمورنڈم بھیجے ہیں۔ سب کی کاپیاں دلّی اور بھوپال تک گئی ہیں۔"

"آپ نے لوکل لوگوں پر اچھا چکر چلا رکھا ہے۔ آپ آر ایس ایس میں ہیں اور مسلمان آپ سے اپنی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہتے ہیں،" سول سرجن نے طنز کیا۔

ڈاکٹر واکانکر چپ رہے۔

"آپ اچھی طرح سوچ لیجیے۔ پینل میں تو آپ کو رہنا ہی رہنا ہے،" کلکٹر نے کہا۔ "ایس

Scanned with CamScanner

پی صاحب، آپ انھیں ریزیڈینس میں چھوڑ آئیے۔ اور ہاں، جب تک آپ فیصلہ نہیں کریں گے، توفیق کی لاش یہیں پڑی رہے گی۔"

ایس پی اپنی جیپ سے ڈاکٹر واکانکر کو ان کی رہائش گاہ تک پہنچانے گئے۔

جیپ ان کی قیام گاہ کے پھاٹک پر رکی۔ ڈاکٹر واکانکر اتر کر گھر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایس پی نے انھیں واپس بلایا۔ اس دفعہ اس کا چہرہ بالکل اجنبی ہو چکا تھا۔ وہ ایک سپاٹ، ٹھنڈا، مشینی چہرہ تھا۔ اس نے کہا، "توفیق احمد ڈائیڈ آف اسٹون انجری۔ (Taufiq Ahmad died of stone injury.) ایک مسلمان کے لیے اپنی سرکار اور اپنی فیملی کے سامنے پرابلم نہ کھڑی کرو... سمجھ میں آئی بات؟"

جیپ جھٹکے سے روانہ ہو گئی، تھوڑی سی دُھول اور دھواں اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی۔

ڈاکٹر واکانکر اسی گرد اور پٹرول کے دھوئیں میں گھرے گیٹ پر کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں گھر کے اندر سے اپنی بیٹیوں کے ہنسنے کی آواز سنائی دی اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

پوجا ان کے لیے چائے دے گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر چپ چاپ پڑے تھے۔ بار بار ایس پی کا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا؛ اس کی ناک سے پٹرول کا دھواں نکلتا تھا اور ڈاکٹر واکانکر کا دم گھٹنے لگتا تھا۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، بلاک میڈیکل آفیسر کوتما، جن کے لکھے ہوئے کئی ریسرچ پیپرز بین الاقوامی میڈیکل جرنلز میں شائع ہو چکے تھے، جنھوں نے اپنشدوں، مہاکاویوں سے لے کر بدھ اور گاندھی تک کو پڑھا تھا، جن کے دل میں مذہب کے لیے گہرا ایمان تھا، جنھوں نے اپنی بیٹیوں کے نام پوجا، اُپاسنا، پرارتھنا اور تپسیا رکھے تھے، اُنھیں ڈاکٹر واکانکر کے دماغ میں اس وقت جیسے کوئی فلم چل رہی تھی۔ وہ جان گئے تھے کہ کوتما میں ہونے والا یہ چھوٹا سا حادثہ ان کی ذاتی زندگی اور خاندان کے لیے خوفناک زلزلہ ثابت ہو گا۔ وہ جانتے تھے کہ پورا کوتما جانتا ہے کہ توفیق احمد کی موت گولی لگنے سے ہوئی ہے۔ زخمی لڑکوں نے بتایا تھا کہ انھوں نے ایس ڈی ایم کو فائرنگ کا آرڈر دیتے اور نشے باز سپاہی پانڈے کو گولی چلاتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

زخمی لڑکے لڑکیاں ایک ایک کر کے ان کی نگاہ کے سامنے آنے لگے۔ توفیق احمد کی بیوی

کا بے رونق ہوتا چہرہ نظر آیا۔ وہ اپنے شوہر کی موت کی خبر سن کر لوگوں سے پیچھا چھڑا کر کہاں بھاگنا چاہتی تھی؟ کیا وہاں جہاں وہ اپنے بائیس سال کے جوان شوہر کو ایک بار پھر زندہ دیکھ سکے اور اس کے خون آلود چہرے کو چوم سکے؟ اور وہ تین سال کی لڑکی اروما ___ اس نے کیا سمجھ لیا تھا جو اس کی عمر کے حساب سے بہت زیادہ تھا اور جسے سمجھ کر وہ پتھر کی ہو گئی تھی؟

ڈاکٹر واکانکر جان گئے تھے کہ اب یہ حادثہ معمولی حادثہ نہیں ہے۔ کوتما لا منسٹر ٹی پی سنگھ کا انتخابی حلقہ تھا۔ وہ سنگھ اور ہندووادی دَل کے بہت پرانے کارکن تھے، لیکن اب اقتدار میں تھے اور سیاسی اقتدار کو انتظامیہ کی مدد کرنی ہی تھی۔ نوکرشاہی اور سیاسی نظام ___ یہ حکومتی نظام ہی کے دو حصے تھے، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے، ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو پانے والے۔ کوتما کے اس حادثے میں ایس ڈی ایم گپتا، انسپکٹر اور پولیس اور ہندووادی سیاسی گروپ، جو آب اقتدار میں تھا، سب ایک طرف تھے۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کے سامنے، جن کی زندگی اپنے طبی پیشے، دھرم اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے لیے وفاداری اور خلوص میں گزری تھی، ایک گہری ستم ظریفی موجود تھی۔

ڈاکٹر کے پیشے میں انھوں نے آج تک ایمان داری اور خلوص کے جذبے سے کام کیا تھا۔ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے ہر اصول، قاعدے اور انتظامی ضابطے کی تعمیل کی تھی۔ انھوں نے نقلی اور گھٹیا دوائیں مریضوں کو کبھی نہیں دیں؛ سرکاری ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے مریضوں سے پرائیوٹ فیس کبھی نہیں لی؛ پرائیویٹ پریکٹس نہیں کی، بلکہ سرکاری اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والوں کی ایک حد تک مخالفت بھی کی۔ پھر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ یہ ممکن نہیں ہے تو انھوں نے کم از کم اپنے اخلاق اور کردار کو درست رکھنے کی بات سوچی۔ برسوں پسماندہ آدی واسی علاقوں میں رہے۔ وہاں رہنے کے دوران بھی انھوں نے میڈیکل سائنس کے کئی شعبوں میں کام کیا۔ مطالعہ کیا۔ سنگھ میں فعال رہتے ہوئے انھوں نے نظر انداز کیے ہوئے اور شکست خوردہ ہندوؤں کے اندر ان کی کچلی ہوئی خودداری اور مغربیت کی تیز آندھی کے سامنے ڈگمگاتی ہوئی ان کی مذہبی عقیدت اور قومی خودداری کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اچانک ایسا کیوں ہوا؟ انھوں نے تو ایشور کی ایجاد کرنی چاہی تھی۔ وہ کسی ایشوری نظام کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ وہ اچانک شیطانوں کے حلقے میں کیسے داخل ہو گئے؟

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کا دورانِ خون پھر غیر متوازن ہونے لگا۔ انھوں نے دیکھا کہ اچانک کمرے میں ایس پی کا چہرہ اُبھرا۔ وہ اپنی ناک سے پٹرول کا دھواں چھوڑ رہا تھا۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ نشے باز کانسٹبل پانڈے ان کے کمرے میں گھس آیا ہے اور اِدھراُدھر دوڑ رہا ہے۔ کونے میں جیوتسنا واکانکر رو رہی ہے۔

اسی وقت انھیں نظر آیا کہ پوجا سلوٹوں بھرا مٹ میلا جانگیہ پہنے ان کی طرف بھاگتی ہوئی آ رہی ہے؛ اس کی اُجلی، معصوم رانیں خون میں لتھڑی ہیں اور پیچھے پیچھے ایک مرد دوڑ رہا ہے۔

انھوں نے غور سے دیکھا کہ وہ وزیرِ قانون ٹی پی سنگھ تھا ـــــ سنگھ کا پرانا کارکن۔ اسے وہ گزشتہ پندرہ برسوں سے جانتے تھے۔ وہ دوڑتا ہوا چیخ رہا تھا: "مندر وہیں بنائیں گے! ہم مندر وہیں بنائیں گے!"

پوجا "پاپا! پاپا!" کہتی ہوئی ان کی طرف بھاگ رہی تھی۔ ان کی ناک بجنے لگی۔ یہ اتنی گہری نیند تھی کہ اسے ٹھیک نیند نہیں کہا جا سکتا تھا ـــــ وہ غالباً ایک چھوٹی سی موت تھی، یا نیم بے ہوشی۔

رات کے دو بجے ہوں گے جب جیوتسنا نے بلا کر انھیں جگایا۔ پوجا اور پرارتھنا بھی اٹھ گئی تھیں۔

"پاپا، آپ اس طرح سو رہے تھے کہ آپ نے ہمیں ڈرا ہی ڈالا۔ ممی اتنی دیر سے آپ کو بلا رہی تھیں،" پوجا نے کہا۔

"آپ کے لیے ایک کپ چائے بنا دیں پاپا؟" پرارتھنا نے پوچھا۔

"باہر جیپ کھڑی ہے۔ آپ کو بلانے آئے ہیں۔ سنا ہے منسٹر صاحب آ گئے ہیں،" جیوتسنا واکانکر نے بتایا۔

"انھیں تو کل آنا تھا،" ڈاکٹر واکانکر نے دھیمی آواز میں کہا۔

انھوں نے پرارتھنا سے ایک کپ چائے بنانے کے لیے کہا اور منھ دھونے باتھ روم چلے گئے۔

لا منسٹر ٹی پی سنگھ سرکٹ ہاؤس میں رکے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ ہیپر مل اونرملکانی کے ہیلی کاپٹر سے آدھا گھنٹا پہلے کوتما پہنچے ہیں۔

ڈاکٹر واکانکر جب وہاں پہنچے تو کلکٹر رندھاوا، ایس پی، سول سرجن اور کچھ دوسرے افسروں کے علاوہ جانے مانے مجرم گونڈو بھیا بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بھی پارٹی بدل کر اسی دل میں آگئے تھے اور ٹی پی سنگھ کے دستِ راست مانے جاتے تھے۔

انھیں دیکھ کر ٹی پی سنگھ کھڑے ہوئے، نمسکار کیا اور پریشان آواز میں بولے، "بھائی جی! آپ کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہم سے اتنا پرانا رشتہ ہے اور یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ بھائی جی اپوزیشن اور فرقہ پرستوں کے مُہرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ سازش صرف میری ہی مخالفت میں نہیں ہے بلکہ پارٹی کے خلاف بھی ہے..."

ڈاکٹر واکانکر نے ٹی پی سنگھ کو دیکھا۔ چہرے پر چربی چڑھ گئی تھی۔ تھوڑا سا مٹاپا آگیا تھا۔ اس کا چونے اور سیمنٹ کا تھوک بیوپار تھا۔ سنگھ اور ہندووادی دل میں زیادہ تر پرچونیے اور بیوپاری ہی تھے۔

"دراصل مسئلہ یہ ہے بھائی جی، کہ سب کی آنکھوں میں دُھول نہیں جھونکی جاسکتی۔ توفیق کی موت کو سب نے دیکھا ہے۔ میں اگر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اسٹون انجری لکھ دوں گا تو بھلا کون مانے گا؟" ڈاکٹر واکانکر نے وضاحت پیش کی۔

اچانک ایس پی نے بیچ میں مداخلت کی۔ "کس نے دیکھا ہے گولی چلاتے ہوئے؟ آپ جانتے ہیں اُسے؟ ذرا اس کا نام تو بتائیے۔"

لانسٹر ٹی پی سنگھ کو ہنسی آگئی۔ "کیا بچوں والی بات کر رہے ہیں بھائی جی؟ کسی نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ ایسی چیزیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کا تو ان باتوں سے کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ آپ کو تو صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھنی ہے..."

ڈاکٹر واکانکر کو کسی گورکھ دھندے میں گھیر لیا گیا تھا۔ وہ اب لڑنا نہیں چاہتے تھے بلکہ صرف نجات کے متمنی تھے تاکہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ دس پندرہ دن کے لیے پنچ مڑھی یا کہیں اور چلے جائیں اور اس ڈراونے خواب سے ان کا پیچھا چھوٹے۔

انھوں نے ملتمس آواز میں ٹی پی سنگھ سے کہا، "بھائی جی، مجھے چھٹی دلا دیجیے۔ آپ لوگوں کو جو کچھ کرنا ہے وہ کیجیے۔ بس مجھے اس میں شامل نہ کیجیے۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

لانسٹر ٹی پی سنگھ کا چہرہ گمبھیر ہو گیا۔ "آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں میں وہ نہیں کرسکتا۔ سنٹر

میں ہماری سرکار نہیں ہے۔ آپ کو پوسٹ مارٹم ٹیم میں شامل کرنے کے لیے یہاں سے تمام درخواستیں بھیجی گئی ہیں۔ پریس والے بھی لگے ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس سے ڈر رہے ہیں۔ اتنی بڑی طاقت آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کی اپنی سرکار ہے۔ آپ نے اس کے لیے برسوں جدوجہد کی ہے۔ پورے صوبے میں سنگھ کے لوگ آپ کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہم سب آپ کی عزت کرتے ہیں۔ یہ تو سیاست ہے۔ آپ اپنے لوگوں کو، ان سرکاری ملازمین کو، جیل بھجوادیں گے، انھیں معطل کروادیں گے، مجھے استعفیٰ دینے پر مجبور کروادیں گے، توان سب باتوں سے آپ کا کیا بھلا ہوگا؟" ٹی پی سنگھ نے قریب آکر ڈاکٹر واکانکر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ارے بھائی جی، پوسٹ مارٹم رپورٹ تو آپ ہی لکھیں گے۔"

"یقین کیجیے بھائی صاحب، میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں لکھ سکتا۔ یہ تو میڈیکل پروفیشن کے خلاف ہے،" ڈاکٹر واکانکر نے کہا۔

"آپ سنگھ میں رہے ہیں۔ آپ اگروال بھائی جی سے بات کرلیجیے۔ اس سے سب ہی متفق ہیں۔ آپ کو اپنی سرکار کا ساتھ دینا چاہیے،" ٹی پی سنگھ نے اصرار کیا۔

ڈاکٹر واکانکر کا سر گھوم گیا۔ یعنی سب یہی چاہتے ہیں؟ کوٹلیہ کی "ارتھ شاستر" بھی تو اسی سرکاری نظام کی روایت رہی ہے۔

پہلی دفعہ ضلعے میں مافیا کے سرغنہ گونڈو سنگھ کی آواز سنائی دی۔ "جیسا بھائی جی کہہ رہے ہیں ویسا کردو بھائی جی... آپ تو خود بال بچے دار ہو۔ اوپر سے ہندو ہو۔ کاہے کو دوسرے لوگوں کی روزی روٹی پر لات مار رہے ہو؟" یہ آواز ایسی تھی جس کی سادگی کے اندر کوئی خطرناک سا سایہ اپنا چہرہ اوپر اٹھا رہا تھا۔

کیا یہ دھمکی تھی؟

پہلے جیپ سے چھوڑتے ہوئے ایس پی نے انھیں ہدایت دی تھی۔ اب لانسٹر کے سامنے مجرم گونڈو سنگھ بول رہا تھا۔

ڈاکٹر واکانکر اچانک کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے گونڈو سنگھ کو گھور کر دیکھا۔ "آپ نے میرے بال بچے دار ہونے کی بات کیوں کہی؟ کیا آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

ٹی پی سنگھ نے انھیں پُرسکون کرنے کی کوشش کی، لیکن ڈاکٹر واکانکر کا دورانِ خون

غیر متوازن ہونے لگا تھا۔ ''نہیں بھائی جی، میری فیملی کی یاد مجھے ایس پی صاحب نے بھی دلائی تھی۔ آپ لوگ مجھ پر دباؤ ڈال کر غلط کام کروانا چاہتے ہیں؟''

''کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟ آپ تو ہمارے اپنے آدمی ہیں۔ آپ کی فیملی ہماری فیملی ہے۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ غصہ تھوکیے... آپ نہیں چاہتے تو چلیے میں کوشش کر کے آپ کو پوسٹ مارٹم پینل سے ہٹوا دیتا ہوں،'' لانسٹر ٹی پی سنگھ نے مسکراتے ہوئے انھیں پیار سے منایا۔

ڈاکٹر واکانکر تھوڑی دیر میں پُرسکون ہوئے۔ ان کے لیے چائے منگوائی گئی۔

رات تقریباً پونے تین بجے ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، نے پوسٹ مارٹم کے لیے اپنی منظوری دے دی۔

یہ لانسٹر ٹی پی سنگھ کی سیاسی جیت تھی۔ طے کیا گیا کہ ساڑھے چار پانچ بجے تک توفیق کی لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار ہو جائے۔

ایس ڈی ایم، پولیس، سنگھ، کلکٹر، سب کو تھوڑی سی راحت ملی۔ توفیق کی لاش ضلع ہسپتال کے لیے پہلے ہی روانہ کر دی گئی تھی۔ بیس منٹ میں ڈاکٹر واکانکر، سول سرجن گپتا اور ڈاکٹر تیواری وہاں پہنچ جائیں گے اور پانچ بجتے بجتے پوسٹ مارٹم مکمل ہو جائے گا۔

ضلع ہسپتال کے لیے روانگی سے قبل ڈاکٹر واکانکر مشکل سے دو منٹ کے لیے اپنے گھر گئے تھے۔ وہاں انھوں نے گنیش کی مورتی کے سامنے ایک بار ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا تھا، جیوتسنا کو مسکرا کر دیکھا تھا۔ بیٹیاں سو رہی تھیں۔ انھوں نے سب سے چھوٹی بیٹی تپسیا کی پیشانی سہلائی تھی۔ پھر باہر اپنے انتظار میں کھڑی جیپ کی طرف روانہ ہو گئے تھے جو انھیں ضلع ہسپتال لے جانے کے لیے آئی تھی۔

ضلع ہسپتال کے آپریشن تھیئٹر میں بائیس سال کے توفیق احمد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ان کی منتظر تھی۔

جیپ تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ ڈاکٹر تیواری پہلو میں بیٹھے تھے۔ واکانکر نے گنگنانا شروع کیا:

''نمستے سدا وتسلے ماتر بھومے...''

"بہت اچھا گاتے ہیں آپ!" ڈاکٹر تیواری نے کہا۔ "ذرا زور سے گائیے!"

"ابھی نہیں، رات بھر جاگتے رہنے سے میرا گلا ذرا خراب ہے۔ سناؤں گا آپ کو... لیکن بعد میں..." ڈاکٹر واکانکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ان کا چہرہ صبح صادق کی ہوا میں تروتازہ لگ رہا تھا۔ "یہ برسم مہورت ہے ڈاکٹر تیواری، جب دیوتا جاگتے ہیں اور شیطان سوتے ہیں۔ اور شیطان کا نام کال نیمی بھی ہوتا ہے ــــ رِشیوں کا روپ بنا کر رہتا ہے... کچھ سمجھے آپ؟"

سنکی ہے یہ شخص، اُول جلول باتیں کرتا ہے۔ ڈاکٹر تیواری نے سوچا۔ اگر گنگناتا ہی رہتا تو غنیمت تھا۔

ٹیبل پر توفیق کی لاش تھی۔ زیادہ چیر پھاڑ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سر کا پچھلا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ وہاں خون میں ریت اور کوتما کی مٹی لتھڑی ہوئی تھی۔ رُوٹین پورا کرنا تھا، وہ پورا کیا گیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کا سائیکلواسٹائیلڈ فارم آگیا۔ رپورٹ ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، چیف میڈیکل آفیسر، کوتما ہی کو لکھنی تھی۔

ڈاکٹر واکانکر نے قلم نکالا۔ ایک بار انھوں نے ڈاکٹر تیواری اور سول سرجن بی این گپتا کو دیکھا۔ پھر وہ منھ ہی منھ میں کہنے لگے:

"پڑھیے سر سادیوم گوری پتر ونایکم
بھکتیاواسن سمرے نتئے بجایو: کامارتھ سدھیے
پرتھم وکرتڈم چ ایک دنتم دیتے کم
ترتیے کرشناپنگا چھم گج وسترم چتر تھکم..."

اس کے بعد وہ جھکے اور انھوں نے لکھنا شروع کیا:

"نام: توفیق احمد۔ ایج: ٹوئنٹی ٹو۔ سیکس: میل

"فادرز نیم: رفیق احمد۔ ایبی مارک: پیچ آن رائٹ تھائی۔ کاز آف ڈیتھ..."

موت کا سبب؟

ڈاکٹر واکانکر کے قلم پر سب کی نگاہ مرکوز تھی۔ آٹھ جوڑی آنکھیں۔ ایک جوڑی آنکھ ایس پی کی بھی تھی۔ وہ ابھی ابھی وہاں آگیا تھا، قانون نہ ہونے کے باوجود۔ قلم پھر چلا۔

Scanned with CamScanner

"سیریبرل ہیڈ انجری، پرووڈ فیٹل، کارڈ بائی دی گن شاٹ- ٹائم آف ڈیتھ: فائیو منٹس ٹوفور پی ایم..."

اس کے بعد نیچے دستخط: "ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر-"

"یہ آپ نے کیا کیا؟" سول سرجن ڈاکٹر گپتا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا- اسے یقین نہیں آ رہا تھا-

"آپ لوگ بھی دستخط کر دیجیے- جو سچ ہے اس کی تصدیق کیجیے- میں نے جو کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے-" ڈاکٹر واکانکر کی آواز میں کوئی کپکپاہٹ نہ تھی ـــــ یہ سیدھی، صاف ستھری، کسی ٹھنڈی دھات کی طرح ٹھوس آواز تھی جو یہاں سے نہیں کسی دوسری دنیا سے آتی ہوئی لگ رہی تھی- اس میں کچھ تھا جو آسمانی تھا-

"لمبودرم، پنچم، ششٹم، وکٹ میوچ
سپتم، گھن راجن، دھرورم تتھا ششٹم
نوم..."

ڈاکٹر تیواری اور سول سرجن ڈاکٹر گپتا جیسے کسی طلسم یا ہپناٹزم میں بندھے ہوئے، چپ چاپ اٹھے اور انھوں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پر ڈاکٹر واکانکر کے دستخط دیکھے- ڈاکٹر واکانکر آپریشن تھیٹر سے جیسے ہی گلیارے میں پہنچے، ایس پی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا- عین اسی وقت ڈاکٹر واکانکر کے قدم ڈگمگانے لگے-

ایس پی کی ناک سے پٹرول کا دھواں نکل رہا تھا- ڈاکٹر واکانکر نے دیکھا کہ گونڈو سنگھ دوڑتا ہوا ان کے گھر کی طرف جا رہا ہے- پھر انھوں نے جیوتسنا واکانکر کو اپنی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا- ان کے بال بکھرے ہوئے تھے- خوف اور بدحواسی میں وہ چہرہ بھدا ہو گیا تھا...

وہ چہرہ شاید توفیق کی بیوی کا تھا... ان کے کانوں میں اپنی بیٹی پوجا کے رونے کی آواز آ رہی تھی- وہ روتی ہوئی گا رہی تھی: "چائے آپ کے لیے بناؤں پاپا! بناؤں پاپا! بناؤں پاپا!"

"دشم ت ونا نکم اکاوشن گڑیتم..."

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر فرش پر گر گئے- ایس پی نے ان کی قمیص پیچھے سے پکڑ رکھی تھی-

ڈاکٹر واکانکر کے گلے سے خرخراہٹ نکلنے لگی، لیکن ان کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی بہت پرانے تناؤ سے کھنچتی اور ٹوٹتی ہوئی ان کی نسیں دھیرے دھیرے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہوں ـــ چہرے پر پرسکون ڈھیلاپن اور واضح انبساط۔

ایس پی گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر بی این گپتا دوڑ کر وہاں آئے۔ انھوں نے ایس پی کے ہاتھ کو جھٹکا دیا، جھک کر ڈاکٹر واکانکر کو دیکھا، پھر بلند آواز میں کہا، "اسٹریچر لاؤ، فوراً۔ وی ہیو ٹو ٹیک ہم ٹو انٹنسو کیئر یونٹ۔ (We have to take him to intensive care unit.) مجھے شک ہے کہ یہ برین ہیمریج ہے۔۔۔ ہی از ان کاما!"

اسٹریچر میں ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کو ایمرجنسی شعبے میں لے جایا گیا۔

"ہی از اے گریٹ مسچیف! (He is a great mischief.) اتنا گھاگ چالباز! اس چالاکی کی خاطر اس نے اپنی جان داؤں پر لگا دی۔"

سول سرجن ڈاکٹر گپتا کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ مبہوت تھے۔ ڈرامے کے اس غیر متوقع منظر کا انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اچانک ان کی نظر ایس پی کی جانب گھومی۔ "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ ہاؤ آر یو ٹو انٹر ان ہاسپٹل پریمیسز ود آؤٹ مائی پرمیشن؟ (How are you to enter in hospital premises without my permission?) آپ ان کا کالر پکڑ رہے تھے؟"

ایس پی اندر سے دہل گیا تھا۔ اس کی گردن نیچی تھی۔

"اٹ واز ٹو مچ! (It was too much.) انھیں چھٹی دے دینی چاہیے تھی۔ پوسٹ مارٹم تو پھر بھی ہو جاتا۔ وی آل فورسڈ ہم ٹو... ٹو..." ڈاکٹر تیواری کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر آئی سی یو میں پڑے تھے۔ بیچ بیچ میں انھیں مصنوعی سانس دی جا رہی تھی اور گلوکوز چڑھایا جا رہا تھا۔ ای سی جی کی رپورٹ کریٹیکل تھی۔ اسکیننگ سے پتا چلا کہ اندرونی سیلانِ خون بند نہیں ہو رہا ہے۔

ان کے گلے سے نکلنے والی گھر گھراہٹ پورے انٹینسو کیئر یونٹ میں گونج رہی تھی۔

***

مقامی اخباروں میں چھوٹی سی خبر تھی جس میں توفیق احمد کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کی اطلاع تھی۔ یہ اخبار وہ تھے جن کا ایڈیشن صبح شائع ہوتا تھا۔ دوسری خبر یہ تھی کہ کوتما میں قانون اور امن قائم رکھنے کے لیے کرفیو لگا دیا گیا ہے۔

نیچے مُردہ گھر میں توفیق احمد کی لاش برف کی سِل پر رکھی ہوئی تھی۔

جیوتسنا واکانکر اور توفیق احمد کے والد، چچا تھمتیا، کو ہسپتال کی جانب سے اطلاع بھیج دی گئی تھی۔

**

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

پوسٹ بکس ۷۰۴۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو ادب کا شش ماہی انتخاب

سوغات

مدیر: محمود ایاز

۸۴، تھرڈ مین، سیکنڈ کراس، ڈیفنس کالونی، اندرانگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

ماہ نامہ

شب خون

ترتیب و تہذیب: شمس الرحمن فاروقی

پوسٹ بکس ۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

سہ ماہی

جامعہ

ترتیب: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی

ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کراچی میں "ذہنِ جدید"، "سوغات"، "شب خون"، اور "جامعہ" حاصل کرنے کے لیے

ٹامس اینڈ ٹامس بک شاپ، صدر، کراچی

سے رابطہ کیجیے۔ فون: 5682220

Scanned with CamScanner

"نیند کی مسافتیں" اور "میز پر رکھے ہاتھ" کے بعد

عذرا عباس

کی نظموں کا نیا مجموعہ

میں لائنیں کھینچتی ہوں

جدید کلاسک پبلشرز

بی 7، تیسری منزل، پیراڈائز پیلیس، 255 سرور شہید روڈ، کراچی

فون: 5688964

***

محمد انور خالد

کی نظموں کا پہلا مجموعہ

ریت آئینہ ہے

عمارہ پبلی کیشنز

بی 29، سیکٹر 11 بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

افضال احمد سید

چھینی ہوئی تاریخ (نظمیں)

(دستیاب نہیں ہے)

خیمۂ سیاہ (غزلیں)

قیمت: چالیس روپے

دو زبانوں میں سزائے موت (نظمیں)

قیمت: ساٹھ روپے

ذی شان ساحل

چڑیوں کا شور (نظمیں)

قیمت: چالیس روپے

کہر آلود آسمان کے ستارے (نظمیں)

قیمت: ساٹھ روپے

کراچی اور دوسری نظمیں

قیمت: سو روپے

ضمیر نیازی

صحافت پابندِ سلاسل

انگریزی کتاب The Press in Chains کا اردو ترجمہ

قیمت: سو روپے

محمد عمر میمن

گم شدہ خطوط

اور دیگر تراجم

قیمت: اسی روپے

Scanned with CamScanner

aaj

an urdu journal of literature and ideas

Published quarterly from Karachi, aaj presents each time a selection of contemporary writings from many languages of the world, translated in Urdu, as well as some ground-breaking Urdu writings of today. At the end of each regular issue a special section - a small anthology in itself - is devoted to a particular writer or subject. The special issues of aaj published so far have presented selections of Arabic, Persian and Hindi short stories, selected fiction of Gabriel Garcia Marquez, writings from different parts of the world covering the tragedy of Bosnia, and, recently, the "Story of Karachi" in two volumes.

Subscription

Pakistan:
Rs 300 (one year), Rs 500 (two years)
Please send the subscription through
cheque/pay order/draft drawn in favour of
"Quarterly Aaj, Karachi"
to the following address:
Managing Editor, aaj,
A-16, Safari Heights,
Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290.
Tel: (021) 811-3474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Outside Pakistan:
Individuls: US$ 25 (one year), US$ 45 (two years)
Institutions: US$ 40 (one year), US$ 70 (two years)
Please send the subscription in US dollars to
Dr Muhammad Umar Memon,
5417, Regent Street,
Madison, WI 53705, USA.
Tel: (608) 233-2942
Fax: (608) 265-3538
e-mail: mumemon@factstaff.wisc.edu

Subscription includes registered air mail charges.

Scanned with CamScanner

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

("آج"، شمارہ ۷: بہار ۱۹۹۱، کتاب کی صورت میں)

لاطینی امریکا کے ملک کولوبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول
"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
تیرہ منتخب کہانیاں
دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون
"کولوبیا کا مستقبل"
مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین
اپنی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں
ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: دو سو روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۰۶، سفاری پاشن، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰